

سچا فریب



محی الدین نواب

سچا فریب

اسے سرخ رنگ بہت پسند تھا، اس کی محبوبہ کو سرخ لہو میں ڈبو دیا گیا تو اس نے قسم کھائی کہ خون کا بدلہ اپنے ہاتھوں سے لے گا..... مگر قاتل نے اسے ایسا فریب دیا کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اس فریب سے نہ بچ سکا۔

ڈاک بنگلے سے وہ حویلی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی اور ایک چھوٹی سی پہاڑی کی بلندی پر ننھے سے گھروندے کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ جب رات کی تاریکی گہری ہو جاتی اور ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تو اس وقت حویلی کی کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے ادھر ادھر سے روشن ہو جاتے۔ روشنی کے وہ چھوٹے چھوٹے وسیعے یوں لگتے جیسے رات کے کالے جسم پر کوڑھ کے اجلے دھبے پھیل گئے ہیں۔

بستی کے لوگوں کا خیال تھا کہ شائستہ وزانی شاید کوڑھ کی مریضہ ہے یا پھر ایک بد صورت عورت ہے جو اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے اوپری منزل کے کمروں میں روپوش رہتی ہے۔

آج تک کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس کے ملازم بھی اسے چہرے سے نہیں پہچانتے تھے۔ کسی کو اوپری منزل میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ایک لیڈی سیکرٹری مسز گرانٹ تھی جو اس کے ساتھ ایٹ پون لندن سے آئی تھی۔ وہی کال ٹیل کی آواز پر اس کی خدمت گزاری کے لئے اوپری منزل پر جایا کرتی تھی۔

دو ماہ قبل وہ حویلی اور اس کے آس پاس کا علاقہ مظفر ٹی اسٹیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے مالک راجہ مظفر علی تھے۔ پھر چائے کے باغات میں کام کرنے والی عورتوں اور مردوں نے سنا کہ راجہ صاحب شہر میں رہیں گے گھوڑوں پر داد لگاتے لگاتے دیوالیہ ہو گئے ہیں اور اب ٹی اسٹیٹ فروخت کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد چائے کے کارخانے سے پرانا بورڈ ہٹا دیا گیا اور درانی ٹی اسٹیٹ کا نیا بورڈ لگا دیا گیا۔ نام کی مناسبت سے اس حویلی میں کسی مرو درانی کو آنا چاہئے تھا لیکن وہاں دو عورتیں آئیں۔ ایک عیسائی عورت اور دوسری مسلمان خاتون۔ وہ دونوں دو گھوڑوں کی بگھی میں آئی تھیں۔ بگھی کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ ٹی اسٹیٹ کا پرانا نیچر کارخانے کا چارج مین اور مشین مین ان کے استقبال کے لئے

حویلی کے پورج میں موجود تھے مگر وہ اپنی نئی مالکہ کو نہیں دیکھ سکے۔ کبھی کا ورواڑہ کھول کر پہلے مسز گرانٹ باہر آئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملازموں کو دور ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ نجیک (نزویک) میں نئی آؤ۔ مس اندر جانا مانگتا ہے۔ راستہ دو.....“

تمام لوگ دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ کبھی سے ایک برقعہ پوش خاتون باہر آئی اور تیزی سے چلتی ہوئی حویلی کے اندر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سب یہی سوچ رہے تھے کہ وہ برآمدے میں پہنچ کر نقاب اٹھے گی اور ایک مالکہ کی حیثیت سے اسٹیٹ کے پرانے ملازموں سے خطاب کرے گی، لیکن وہ آوم بیزار معلوم ہوتی تھی۔ برقعے کے چھپے سے بھی اس نے سر اٹھا کر کسی کی جانب نہیں دیکھا۔ کبھی کی قید سے نکل کر آئی اور حویلی کے اندر جا کر روپوش ہو گئی۔

اس دن کے بعد سے اس عورت کو تو کیا اس کے برقعے کو بھی کسی نے نہ دیکھا۔ فیجر اور چارج مین کی گھر والیاں اس سے ملنے آئیں لیکن مسز گرانٹ نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

”بہت بہت سوری۔ ڈاکٹر کا آرڈر نئی ہے۔ بیگم صاحب کسی سے نئی ملے گا.....“

پتہ نہیں وہ کون ڈاکٹر تھا جس نے ایک عورت کو دوسری عورتوں کے سامنے آنے سے روک رکھا تھا۔ نئی مالکہ کی روپوشی ہر ایک کے ذہن میں کھلنے لگی۔

عورتیں، مردوں سے زیادہ تجسس پسند ہوتی ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طور سے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ بڑی کوششوں کے بعد دو ماہ کے عرصے میں اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ اس کا نام شائستہ درانی ہے۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے اور وہ سات برس تک انگلینڈ میں رہنے کے بعد اپنے ملک واپس آئی ہے۔

لیکن اس چٹکی بھر معلومات سے کسی کو تشفی نہ ہوئی۔ سب ہی اپنے طور پر جھنجھلا کر سوچنے لگے۔ وہ بد صورت ہے، اسی لئے کسی کو اپنی شکل نہیں دکھاتی ہے۔ وہ کوڑھ کی مرینہ ہے۔ یا پھر انگریزوں کے ملک سے منہ کالا کر کے آئی ہے۔ اس کے پاؤں بھاری ہیں اور وہ اوپری منزل میں اپنے گناہ کو چھپائے بیٹھی ہے۔

جتنے منہ اتنی باتیں..... باتیں بھی ایسی کہ شائستہ درانی کو دن بہ دن پراسرار

بنائے جا رہی تھیں۔ بستی کی عورتیں اور مروجہ حویلی کے قریب سے گزرتے تو مراٹھا کرپاڑی کی بلندی پر ضرور دیکھتے۔ ایک نئی امید اور نئے یقین کے ساتھ دیکھتے کہ وہ معرہ حل ہو جائے گا لیکن حویلی کی کھڑکیوں اور دروازوں پر اندھے شیشے لگے ہوئے تھے۔ ان کے آ رہا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دن کے وقت اوپری منزل کی کھڑکیاں اور بیرونی بالکونی کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ رات کو کھڑکیوں کے ایک دوپٹ کھل جاتے تھے۔ اگر موسم کچھ زیادہ ہی گرم ہوتا تو بالکونی کا دروازہ بھی کھل جایا کرتا تھا مگر پھر بھی وہاں رات کی تاریکی سیاہ پردے کی طرح پڑی رہتی تھی۔

اوپر اندھیرا اور نیچے روشنی..... نچلی منزل میں نچلی کے قہقہے روشن رہتے تھے۔ ان روشنیوں کی چکاچوند میں اوپر کی تاریکی اور گہری ہو جاتی تھی۔ وہاں ایک پرانی کماوت کے خلاف چراغ تلے اندھیرا نہیں تھا، بلکہ چراغ کے اوپر اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ ہاں، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ بالکونی کے ساتھ والے کمرے میں موسیٰ شمعیں روشن ہو جاتیں۔ ان کی روشنی اندھے شیشوں سے ٹکرا کر باہر آنے کی کوشش کرتی اور کمرے کے محدود ماحول میں ہی اپنی مالکہ کی طرح قید ہو کر رہ جاتی۔ انسان ساری زندگی خاموشی اختیار کر لے۔ خود کو اسرار کے دبیز پردوں میں چھپا لے، پھر بھی شیس چھپتا۔ کبھی خاموشی کی کوئی اوپول پڑتی ہے یا کبھی اس کا ماحول طویل خاموشی سے بوکھلا کر چیخ پڑتا ہے۔ بند کمرے کا وہ ماحول اکثر ریکارڈ پلیئر کی زبان سے اس پراسرار لڑکی کے سراج کی چغلی کھایا کرتا تھا۔

رات کی خاموشی میں ہلکی ہلکی موسیقی اوپری بالکونی سے سسکتی ہوئی آتی تھی۔ کسی گلوکار کی درو بھری آواز زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی، اندھے شیشوں کو پھلانگتی ہوئی حویلی کے اطراف منزلاتی اور ہندرتج دھیمی پڑتی ہوئی پھاڑی کے دامن میں اتر جاتی تھی۔ ”میں کہاں آ گیا ہوں۔“

اے میری بے حیا تقدیر! تو مجھے کہاں لے آئی ہے۔
میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر ایک گناہ گار کی طرح منہ چھپائے بیٹھا ہوں۔
کیا مجھے موت نہیں آئے گی۔
میرے دشمن تو کہاں چلا گیا ہے؟

”ٹو میری جان کا دشمن ہے..... آ..... مجھے اس زندگی سے نجات دلا دے.....“
 ریکارڈ پلیئر پر کوئی مرد ہمیشہ یہی گیت گاتا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے اندھے
 شیشوں پر روشنی کے زاویے یوں بدلتے رہتے تھے جیسے وہ لڑکی شمع دان ہاتھ میں اٹھائے
 اُدھر سے اُدھر کسی بے چین روح کی طرح بھٹک رہی ہے۔ یا پھر اپنے قاتل کو تلاش
 کر رہی ہے۔

”آ..... میری جان کے دشمن مجھے اس زندگی سے نجات دلا دے.....“

☆-----☆-----☆

قیصر مراد ڈاک بنگلے کے برآمدے میں کھڑا ہوا تھا اور آنکھوں سے دور بین لگائے
 دور حویلی کی اوپری منزل کو دیکھ رہا تھا۔

رات کی تاریکی میں اسے اتنا ہی نظر آیا کہ اندھے شیشوں پر روشنی کے زاویے
 بدل رہے ہیں۔ کوئی ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف لالین یا شمع دان اٹھائے
 بھٹک رہا ہے۔ اس نے دور بین کو آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔
 ”تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ لڑکی ہے؟ دیکھو شیخ! تمہاری رپورٹ نے مجھے
 الجھا دیا ہے، تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتاؤ اس حویلی میں کوئی مرد ہے یا نہیں؟“

حامد شیخ نے اپنی واڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔ صرف وہی لڑکی ہے، جو اس
 حویلی کی مالکہ بن کر آئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں راجہ مظفر علی کا جیکرٹری رہ چکا
 ہوں۔ حویلی کی خرید و فروخت کے سلسلے میں جو دستاویز تیار ہوئی تھی، اس میں خریدار کا
 نام آمنہ شائستہ درانی بنت رئیس احمد درانی لکھا گیا ہے۔ اس کے ماں باپ مرچکے ہیں۔
 دوسرے بھائی یا بہنیں نہیں ہیں۔ وہ اتنے بڑے لی اسٹیٹ کی واحد مالکہ ہے۔“

قیصر مراد کی پیشانی پر غٹنیں پھیل گئیں۔ آنکھوں سے الجھن اور چہرے سے
 جھنجھلاہٹ ظاہر ہونے لگی۔ وہ برآمدے سے پلٹ کر اندر چلا آیا۔ کمرے میں روزی تاش
 کے بتوں سے کھیل رہی تھی۔ اس نے مراٹھا کر مراد کو دیکھا۔ وہ ایسا قد آور تھا کہ
 درمیانے قد کے لوگ ہمیشہ اسے مراٹھا کر دیکھتے تھے۔ مضبوط بازو، چٹان کی طرح چوڑا
 سینہ..... اور جنسی مخالف کے لئے اس کے چہرے اور شخصیت میں عرواگی کوٹ کوٹ
 کر بھری ہوئی تھی۔

روزی نے اسے نشلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اسکاچ دھسکی کی بوتل سامنے سے اٹھائی اور اس کے لئے ایک پیگ بنانے لگی۔ قیصر مراد نے دور بین کو صوفے پر پھینک دیا۔ پھر اس نے روزی کے ہاتھ سے بوتل جھپٹ لی اور اسے منہ سے لگا کر غٹاٹ پینے لگا۔ روزی نے مسکرا کر شکایت کی۔

”یو آر روڈ اینڈرف..... عورتوں کے معاملے میں تمہیں سوچنا چاہیئے۔“
”پھوں!“ مراد نے ”اوننہ“ کہنے کے انداز میں پھنکار ماری تو شراب کی ہلکی سی پھوار روزی کے چہرے پر آکر بکھر گئی۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتی ہوئی اپنے اسکارف سے چہرے کو صاف کرنے لگی۔

”سوٹ!“ وہ غرا کر بولا۔ ”میں یہاں دسیم احمد درانی کی لاش گرائے آیا ہوں اور تم سستی ہو کہ مجھے تم جیسی عورتوں کے لئے سوم کی طرح ملائم ہونا چاہئے۔ کرس آن یو..... یہاں بھی عورت، وہاں بھی عورت۔ وہاں دسیم احمد درانی کو ہونا چاہئے مگر اس کی جگہ کوئی شائستہ درانی منہ چھپائے بیٹھی ہے۔“
وہ ایک جھٹکے سے روزی پر جھکا اور اس کی گردن کی پشت پر ہاتھ لے جا کر اس کے بالوں کو منہ میں جکڑ کر اپنی طرف اٹھانے لگا۔

”تم کیا مجھے احمق سمجھتی ہو۔ میری کھوپڑی سوٹ نہیں ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ اس حویلی میں کوئی شائستہ نہیں ہے۔ وہاں دسیم چھپا بیٹھا ہے۔ میرا.....
بزدل..... دشمن.....“

اس نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ روزی صوفے پر گر پڑی اور اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے پھر اسی تشدد کا انتظار کر رہی ہو۔

مراد بوتل سے منہ لگا کر گھونٹ بھر رہا تھا۔ دو چار گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے پھر زہریلے سانپ کی طرح پھنکار ماری اور بھاری قدموں کی دھمک پیدا کرتا ہوا ذرا دور چلا گیا۔ وہاں سے پلٹ کر اس نے کہا۔

”میرے سینے میں انتقام کی آگ جل رہی ہے۔ میں اس سردپے کو حویلی کی چار دیواری سے کھینچ کر لاؤں گا۔ اس بستی کے لوگوں کو دکھاؤں گا کہ وہ مرد ہو کر برقعے میں چھپا پھرتا ہے۔ پھر..... پھر میں اسے گولی مار دوں گا.....“

بوٹل پھر اس کے ہونٹوں تک پہنچ گئی۔ روزی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھتی ہوئی بولی۔

”سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ مراد۔ تم جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہے ہو۔ تمہیں قانون کی نظروں سے بچ کر انتقام لینا چاہئے۔“

وہ آنکھیں سکیڑ کر روزی کو تنکے لگا۔ خالص دہسکی پینے کے باعث گھوپڑی گھوم رہی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی روزی بھی ادھر سے ادھر ڈول رہی تھی۔ اس نے ذرا سنجیدگی سے سوچا کہ وہ واقعی بہک رہا ہے۔ اسے سوچ سمجھ کر ایسا انتقام لینا چاہئے کہ سانپ بھی مرے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔ وہ ڈمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور صوفے پر آکر دھپ سے بیٹھ گیا۔

روزی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس کا بازو تھام کر بولی۔ ”وہ لڑکی دسیم کی بہن ہوگی۔ تم نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ اس کی ایک چھوٹی بہن تھی۔“

”جی، مگر اب نہیں ہے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ بارہ برس کی عمر میں مر گئی تھی۔“ اس نے بوٹل کو منہ سے لگالیا۔

”تم نے سنا تھا مراد..... مگر سنی سنائی باتیں اکثر غلط ہو جاتی ہیں۔ تم یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ وہ زندہ ہے، ورنہ یہ شائستہ درانی کہاں سے آجاتی۔“

وہ بوٹل کو ایک جھٹکے سے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”لعنت ہے شائستہ درانی پر۔ اگر وہ زندہ ہے تو میرے لئے کیا فرق پڑے گا۔ مجھے دسیم کی تلاش ہے۔ صرف دسیم کی۔ سات سال کے بعد اسے انگلینڈ سے واپس آنا تھا مگر اس کی بہن آئی ہے۔ وہ کم بخت کہاں مر گیا؟“

”ہو سکتا ہے کہ مر گیا ہو۔“

”نہیں!“ اس نے جھلا کر اسے پرے دھکیل دیا۔ ”وہ نہیں مر سکتا۔ مرے گا تو

صرف میرے ہاتھوں سے..... میرے ہاتھوں سے.....“

وہ بوٹل اٹھا کر پھر پینے لگا۔ روزی نے ناراضگی سے کہا۔

”تم میرے ساتھ جنگیوں کی طرح پیش آؤ گے تو میں صبح داپس چلی جاؤں گی۔“

وہ سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میرے پہلو میں آنے والی ہر عورت

یہی کہتی ہے۔ ٹھیک ہے، چلی جانا لیکن شائستہ سے ملنے کے بعد.....“
وہ حیرانی سے بولی۔ ”میں اس سے کس طرح مل سکتی ہوں؟ سنا ہے کہ مسز گرانٹ کسی کو ڈرائنگ روم سے آگے بڑھنے نہیں دیتی ہے۔ وہیں سے باتیں بنا کر ٹال دیتی ہے۔“

”تم کوشش کرو گی تو وہ تمہیں نہیں ٹال سکے گی۔ تم کیسی عورت ہو؟ صرف مردوں کو بھاننا جانتی ہو۔ کسی عورت کی کمزوری سے کھیلنا نہیں جانتی..... کل صبح تم ضرور وہاں جاؤ۔ وہاں چھپی ہوئی ہستی سے ملاقات ہو یا نہ ہو، مگر اس کی کوئی کمزوری ڈھونڈ کر لاؤ۔“

وہ بول اٹھا کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا۔ روزی بڑی لگن سے اسے دیکھ رہی تھی اور اپنا ہاتھ گردن کی پشت پر لے جا کر ہولے ہولے اس جگہ کو سلا رہی تھی، جہاں مراد لے اس کی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ وہاں دھیما دھیما سادرو اور مٹھی مٹھی سی جلن ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کونے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ بل کھاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔

مراد دروازے کی جانب پشت کئے ایک سوٹ کیس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ روزی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلنگ کے پاس آئی اور انگڑائی لیتی ہوئی بستر پر گر پڑی۔ انگڑائی کے کھنچاؤ پر ذرا دیر تک اس کا بدن چنچنا رہا۔ پھر اس نے کروت بدل کر مراد کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شراب دو آتشہ کے لئے نود ہی کشاں کشاں چلا آئے گا لیکن مراد کے سلٹنے سوٹ کیس سے جھانکنے والے سوخ لباوے کو دیکھتے ہی وہ مرجھا گئی۔

وہ سرخ رنگ کا ادنی لبادہ تھا۔ مراد اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھائے بڑے ہی جذباتی انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں کچھ ٹوٹنے کی لالی تھی اور کچھ سوخ لباوے کا عکس جھلک رہا تھا، جن کی وجہ سے آنکھیں لال انگارہ ہو گئی تھیں۔ پھر وہ لبوے کو سینے سے بھینچ کر بڑبڑانے لگا۔

”تم میری پہلی اور آخری محبت تھیں۔ میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ میں انتقام لوں گا.....“
”.....“

درمیانے قد، بھرے بھرے گداز جسم اور گوری رنگت کا نام ٹینہ تھا۔

جب وہ سرخ لہادے کو شانوں پر ڈال کر اسٹیج پر آئی تو لہادے کی لالی اس کی گوری رنگت میں گھل کر ویسے ویسے حسن کو شعلے کی طرح بھڑکادی تھی۔ سامعین اس کی مسکور کن آواز میں گیت سننے آتے تھے اور اس کے حسن کو دیکھ کر ول تھام کر رہ جاتے تھے۔ ہزاروں لاکھوں سامعین کے دلوں پر حکومت کرنے والی حسینہ ان دنوں قیصر مراد پر مہربان تھی۔ مراد کا وہ پہلا عشق تھا اور نامراد ٹینہ کا ساتواں عشق..... کبھی عمر ہو اور محبت میں بھی کچا پن ہو تو محبوب کے عیب نظر نہیں آتے۔ مراد بائیس برس کا نوجوان تھا۔ اس کے مقابل کتنی تجربہ کار عورت ہے یہ اس نے کبھی نہیں سوچا، بلکہ ٹینہ نے اپنی آرزو وہ اداؤں سے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

والدین نے اسے سمجھایا کہ وہ اچھی عورت نہیں ہے لیکن جوانی میں والدین کی نصیحتیں صدیوں پرانی معلوم ہوتی ہیں۔ دنیا والوں نے طعنے دیے تو اس نے سوچا کہ خاتم زمانہ اپنی حادث کے مطابق محبت کا دشمن بن گیا ہے۔ ٹینہ نے اسے اس طرح اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا کہ اسے ساری دنیا جھوٹی اور فریبی نظر آتی تھی۔

وہ اپنی زلفوں کی چھاؤں میں بڑے ہی درد بھرے انداز میں کہتی تھی۔ ”یہ دنیا والے میری شہرت سے جلتے ہیں۔ مجھے خواہ مخواہ بدنام کرتے ہیں کہ میں ماسٹ بدلتی رہتی ہوں۔ تمہاری قسم مراد! جن عاشقوں کے نام لے کر مجھے بدنام کیا جاتا ہے، ان سے میرے صرف کارباری تعلقات تھے۔ ان میں سے کوئی میری تنہائی میں کبھی نہیں آیا۔ تم پہلے شخص ہو۔ تم میرے دل و دماغ پر چھا گئے ہو۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو۔ قسم کہ تم کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑو گے۔“

”میں قسم کھاتا ہوں کہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ تم بھی میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو۔ بب میں نے پہلی بار تمہیں سرخ لہادے میں دیکھا تو میرے دل نے کہا کہ تم صرف میرے لئے پیدا کی گئی ہو۔ صرف میرے لئے..... مجھے سرخ رنگ بہت ہے۔ اس رنگ کا عکس تمہارے چہرے پر پڑتا ہے تو تم سرخ گلاب کی طرح کھل جاتی ہو۔“

”اگر تمہیں مرغ رنگ پسند ہے تو میں ہمیشہ اسی رنگ کا لباس پہنا کروں گی۔“

لیکن اس کا قیام کہاں ہو گا؟

”تمہارے ہاں۔ اگر وہ میرے پاس رہے گا تو گھر کے بزرگ کبھی اپنی نصیحتیں سنانا کر اسے مولوی بنا دیں گے۔ یہ تمہاری کوٹھی ہے۔ یہاں ہماری مخالفت کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟“

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا۔ تمہارا دوست جب تک چاہے یہاں رہ سکتا ہے۔“

دوسرے دن وہ دسیم احمد ورائی کو لینے ایئر پورٹ گئے۔ اسے دیکھ کر شینہ ذرا بچھ سی گئی، کیونکہ دسیم احمد ورائی کا نام بہت بڑا تھا اور جسم نہایت ہی مختصر وہ چھوٹے سے قد اور دبے پتے جسم کی وجہ سے ایک کم عمر چھوٹا نظر آتا تھا۔ چہرے پر واٹر ہی مونچوں کی جگہ مکمل روئیدگی نہیں تھی۔ غور سے دیکھنے پر کہیں کہیں ریشم جیسے مہین سنہری بال افشائ کی طرح جھلک جاتے تھے۔

تعارف کے دوران شینہ نے اس سے مصافحہ کیا تو دسیم کے ہاتھ بالکل سرد تھے۔ وہ ایک عورت سے ہاتھ ملانے وقت بری طرح جھینپ رہا تھا۔ مراونے اس کی پیٹھ پر ایک وہب جساتے ہوئے کہا۔

”یارا کیا شرماتے ہو۔ یہ تمہاری ہونے والی بھابی ہیں۔ ان سے شرماء گے تو کام نہیں چلے گا۔ تمہیں انہی کی کوٹھی میں قیام کرنا ہے۔“

دسیم نے خوشی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی قیام کے سلسلے میں رسمی طور پر شینہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ شینہ اسے اچھی نہیں لگی۔ یا پھر وہ سرد مری برتنے کا ماوی تھا۔

وہ تینوں کار کی اگلی حیث پر آکر بیٹھے تو شینہ ان کے درمیان تھی۔ وہ دائیں طرف سے مراو کو اور بائیں طرف سے دسیم کو اپنے بدن کی نری وگری کا احساس دلا رہی تھی۔ دسیم سینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جگہ کی تنگی کے باعث سینے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ شینہ اس نوجوان میں کبھی دلچسپی نہ لیتی لیکن مراو سے وعدہ کر چکی تھی کہ دسیم کو آوی بنانے میں اس کی مدد کرے گی۔ اسی خیال سے وہ جان بوجھ کر دسیم کی طرف زیادہ جھکی ہوئی تھی۔ مراو جو کام دوسری لڑکیوں سے لینا چاہتا تھا، وہ شینہ خود ہی انجام دے رہی تھی لیکن اس طرح کہ مراو کو اس کے ہرجائی پن کا علم نہ ہو۔

وسیم ایک ماہ کے لئے آیا تھا۔ اس ایک ماہ کے دوران ٹینہ اپنے تمام آزمودہ حربے استعمال کرتی رہی اور وسیم اس سے بدکتا رہا۔ جتنا وہ دور ہوتا تھا اتنی ہی اس کی ضد بڑھتی جاتی تھی۔ عورت ناکام ہو کر کبھی ہمت نہیں ہارتی بلکہ اس بار کو جیت میں بدلنے کے لئے پلٹ پلٹ کر نئے نئے داؤ آزماتی رہتی ہے۔

وسیم اس کے ہاں مہمان بن کر مہیبت میں پھنس گیا تھا۔ اپنی میزبان سے کھل کر نفرت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک روز سراو سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے شکایت کی۔ ”مراؤ تم جہاں بھی مجھے تفریح کے لئے لے جاتے ہو، وہاں ٹینہ کو بھی ساتھ کر لیتے ہو کبھی ہم دونوں کو بھی تنہائی میں وقت گزارنا چاہئے۔“

اس نے ہنس کر کہا۔ ”ٹینہ اِزائے سویٹ گرل۔ اس کے بغیر کسی تفریح میں مزہ نہیں آتا۔“

وسیم نے اداسی سے اسے دیکھا، پھر ناگواری سے بولا۔ ”تم اسے لڑکی کہتے ہو، مجھے تو وہ کوئی ادھیر عمر کی عورت نظر آتی ہے۔ نہ جانے تمہیں اس کی کون سی اوا پسند آگئی ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔“

مراو نے چونک کر اسے دیکھا اس وقت وسیم کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ ٹینہ کی برائی سن کر اسے ایک الٹا ہاتھ رسید کر دیتا۔ اس نے غصے کو قہقروں میں چھپاتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی چھو کرے ہو۔ لڑکی اور عورت کے فرق کو مجھ سے زیادہ نہیں سمجھتے ہو۔ بعض عورتیں بعض معاملات میں لڑکیوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ تعجب ہے کہ تم ٹینہ سے نفرت کیوں کرتے ہو؟ اچھا چاچ بٹاؤ جب وہ سرخ یا نارنجی رنگ کا لباس پہنتی ہے تو کیا اس وقت بھی تمہیں خوبصورت نہیں لگتی؟“

وسیم نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا۔ ”میں بھول گیا تھا کہ تمہیں سرخ رنگ پسند ہے۔ تم ٹینہ سے نہیں، اس کے اوپر چڑھے ہوئے سرخ غلاف سے عبت کرتے ہو۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ اس نے غصے سے کہا۔ ”میں ٹینہ سے محبت کرتا ہوں۔ جو محبت کرتے ہیں وہ محبوبہ کی سجاوٹ کو بھی دیکھتے ہیں۔ وہ مجھے سرخ لباس میں بہت اچھی لگتی ہے۔ میری نظروں میں یہ لباس ہی اس کی سجاوٹ ہے۔ اس کا سنگار ہے۔ اب کبھی وہ ایسا لباس پہنے تو تم اسے میری آنکھوں سے دیکھنا۔ وہ تمہیں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آئے

گی۔“

وسیم خاموشی سے اور سوچتی ہوئی نظروں سے اپنے دوست کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کی خاموشی نے بحث کو اسی دقت ختم کر دیا لیکن اس کے دل و دماغ میں عجیب سی الجھل مچی ہوئی تھی۔ مراد کی یہ بات دماغ میں گونج رہی تھی کہ شینہ سرخ لباس میں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی ہے۔

اس رات شینہ اور مراد تھما تفریح کے لئے گئے۔ وسیم سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔ اس نے مراد سے کہہ دیا تھا کہ وہ دوسرے دن واپس چلا جائے گا۔ شینہ کو اس کی دایہی کا علم ہوا تو وہ بے چین ہو گئی۔ ایک نو عمر لڑکا اسے شکست دے کر چلا جائے اور اس کے تمام حیلوں کو رنگ آلود کر دے، یہ توہین وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی کاحیالی کی جدوجہد کے لئے صرف ایک رات..... ایک آخری رات رہ گئی تھی۔ وہ اس رات کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لہذا اس نے بھی مراد سے جمانہ کیا کہ صبح اسے ریکارڈنگ کے لئے جانا ہے۔ وہ رات کو زیادہ دیر تک باہر نہیں رہے گی۔ چونکہ ریکارڈنگ کا معاملہ تھا اس لئے مراد اسے نہ روک سکا۔ ڈر کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

شینہ اپنی کونہی میں آئی اور سیدھی وسیم کے کمرے میں چلی گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ بستر کی شکن آلود چادر ہٹا رہی تھی کہ وہ بہت دیر تک وہاں پڑا کباب بیچ کی مانند کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس نے بستر کو چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔ یعنی وہ ابھی ابھی کیس گیا تھا۔ اس نے ہاتھ روم کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا وہاں بھی وہ موجود نہیں تھا۔

شینہ کمرے سے باہر آگئی اور یہ سوچ کر اپنی خواب گاہ کی طرف جانے لگی کہ لباس تبدیل کرنے کے بعد ملازمہ کو بلا کر اس کے متعلق پوچھے گی لیکن وہ اپنی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر ٹھک گئی۔

دردازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں ہر طرف سرخ اور نارنجی رنگ کے ملبوسات بکھرے ہوئے تھے اور ان غطلوں کی طرح دیکھتے ہوئے کپڑوں کے درمیان وسیم کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہی سرخ لباؤہ تھا جسے شینہ پہن کر اسٹیج پر جلایا کرتی تھی۔ لباؤے کی پشت پر سنہری گوت سے ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ وہ دروازے کی طرف پشت

کئے کھڑا تھا۔ کبھی اس دائرے کو دیکھ رہا تھا، کبھی لبادے کی سرخی کو بڑی محبت سے دیکھ کر اسے ٹھنڈوں میں بھیج رہا تھا اور کبھی اسے اپنے سینے سے لگا رہا تھا۔
 شیشہ فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی قریب آگئی۔

وہ چونک کر پلٹ گیا، پھر شیشہ کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں سے لبادہ جھوٹ کر قالین پر گر پڑا۔ وہ مسکراتی ہوئی ایک دم قریب آگئی۔

”تم کیسے ناوان ہو، مجھ سے دور بھاگتے ہو اور میرے کپڑوں سے محبت کرتے ہو۔“ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹتا چاہتا تھا لیکن شینہ نے اس کی گردن میں بانٹیں ڈال دیں۔

”آج میں نے تمہاری چوری پکڑ لی ہے۔ اب تم میرے سامنے اپنی پارسائی نہیں جتا سکتے۔“

دسیم اس کی بانہوں سے اپنی گردن چھڑانے لگا۔ ”چھوڑ دو مجھے۔ مجھے جانے دو۔“ میں..... یہ..... یہ بہت بری بات ہے۔ الگ ہٹو.....“

وہ الگ ہونے کی بجائے اور زیادہ چپکنے لگی۔ ”برائی کیا ہے اور اچھائی کیا ہے؟ یہ آج تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ آج کے بعد تم شرمانا چھوڑ دو گے۔ بولیں..... پولو دسیم کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟“

”نہیں میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔“ اس نے ایک جھٹکے سے اس کی بانہوں کو الگ کر دیا۔

وہ جھلا کر اسے جھنجھوڑنے لگی اور وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

دو دونوں قد اور جسامت میں ایک جیسے تھے۔ دونوں کی جسمانی قوتوں میں بھی انیس بیس کا فرق تھا۔ اس جنگ میں صرف عورت کمزور نہیں تھی، مرد بھی کمزور تھا اس لئے وہ کمزوروں کی طرح ایک دوسرے کو نوچ کھسوت رہے تھے۔ دسیم اسے دھکے دیتا ہوا اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور کسی طرح اس کمرے سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

ایک بار اسے بھاگنے کا موقع ملا لیکن قالین پر بکھرے ہوئے کپڑوں میں اس کا پاؤں الجھ گیا اور وہ دھڑام سے اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، شینہ اس پر چھا گئی اور بھری ہوئی شیرنی کی طرح غراتی ہوئی بولی۔

”کیوں آئے تھے میرے کمرے میں..... بولو کیوں آئے تھے؟ بزدل..... نامرد.....؟“

ایک عورت کی زبان سے نامرد کا لفظ دھماکہ بن کر اس کی کھوپڑی میں گونجنے لگا۔ اس نے تڑپ کر ٹینہ کو قالین پر گر ادیا اور اس کے منہ پر طمانچے اور گھونٹے مارے ہوئے پیچھے لگا۔ ”میں مرد ہوں..... میں مرد ہوں..... بولو۔ بولو میں مرد ہوں۔“

مار پڑتے ہی ٹینہ کے دماغ میں بات آگئی کہ اسے کس طرح بھڑکایا جاسکتا ہے۔ وہ پھر لٹکارتی ہوئی بولی۔ ”تم مرد نہیں ہو۔ میں ہزار بار کہوں گی کہ تم عورت ہو..... عورت سے بھی گئے گزرے ہو.....“

دسیم کا سارا بدن تھرا گیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”عا..... عورت۔ نہیں..... مم..... میں عورت نہیں ہوں..... لگ..... کون کتا ہے کہ میں عورت.....“

وہ فرش پر بیٹھی ہوئی بولی۔ ”عورت..... عورت..... تم عورت ہو.....“ وہ تیزی سے پلٹ کر ہانچے کانپتے سنگار میز پر رکھے ہوئے ہینل کے گلدان کے پاس آیا۔ اس کے پیچھے ٹینہ چیخ رہی تھی۔

”میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ میرے پاس آؤ ورنہ میں ساری دنیا سے کہہ دوں گی کہ تم عورت ہو۔ اسی لئے ایک عورت سے دور بھاگتے.....“

کھٹناک کی زور دار آواز کے ساتھ ہینل کا گلدان اس کی پیشانی سے ٹکرایا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور ویدے پھیل گئے۔ پیشانی سے خون کی دھاریں بہتی ہوئی آنکھوں میں اترنے لگیں۔

دسیم نے دونوں ہاتھوں سے گلدان کو اپنے سر سے اونچا کیا اور جنوبی انداز میں چیخ کر بولا۔ ”میں مرد ہوں..... بول میں.....“

کھٹناک! دو مری بار گلدان اس کی ناک پر پڑا اور وہ پیچھے کی طرف قالین پر پڑے ہوئے سرخ لباوے پر گر کر پھر پھڑانے لگی۔ اس کا چہرہ لہو سے تر بہ تر ہو گیا تھا۔ ناک سے خون کا باریک فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی کراہوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ جان کنی کے وقت کتنی اذیت میں مبتلا ہے۔

اے تڑپتے دیکھ کر دسیم کے ہاتھوں سے گلدان چھوٹ گیا۔ اس کی وحشت گھبراہٹ میں بدل گئی اور اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے۔ ذرا دیر بعد شینہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے بہتا ہوا 'لہو' لہا دے پر آ رہا تھا اور اس کی سرخی سے ہم رنگ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف بکھرے ہوئے سرخ کپڑے دسیم کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ اے یوں لگ رہا تھا جیسے کمرے میں چاروں طرف خون ہی خون پھیلا ہوا ہے۔

ای وقت گھر کی ملازمہ کی چیخ سنائی دی۔ وہ دروازے پر کھڑی خوفزدہ نظروں سے کبھی دسیم کو اور کبھی اپنی مالکن کو دیکھ رہی تھی۔ دسیم لڑکھڑاتا ہوا اس کی جانب بڑھا تو وہ چیخیں ہوئی بھاگ گئی۔ دسیم کے بدن پر ایسی کپکپی ملا رہی ہو گئی تھی کہ وہ اسے روکنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگ نہ سکا۔ وہ ڈمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دروازے تک آیا اور دیوار کا سہارا لے کر جلدی جلدی باہر کی طرف جانے لگا۔ شینہ کی لاش نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس کے دل کی گھبراہٹ اور وحشت ذرا کم ہو گئی۔ کم از کم اتنی قوت بحال ہو گئی کہ اب وہ ہوش دحواس سے کام لے کر قانون کی پہنچ سے دور جاسکتا تھا۔

وہ ہانپتا کانپتا اور ڈمگاتا ہوا پورچ میں آیا۔ شینہ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کار میں بیٹھ کر اسے اشارت کیا اور دوسرے ہی لمحے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا سڑک پر نکل آیا۔

دو گھنٹے بعد شینہ کی کوٹھی میں اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی تھی۔ داروات والے کمرے میں ملازمہ پولیس انسپکٹر کو اپنا بیان دے رہی تھی کہ ایک سپاہی قیصر مراد کو بھی بلا کر لے آیا تھا۔ شینہ کی لاش دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ غصے سے کانپنے لگا۔ ملازمہ کی چشم دید گواہی اور دسیم کے فرار نے اسے یقین دلادیا تھا کہ دسیم نے ہی دوستی کی آڑ میں اس کی محبت کا خون کیا ہے۔ پولیس انسپکٹر نے کہا۔

”مسٹر مراد! قاتل اپنا سامان چھوڑ گیا ہے، اس کے سامان کی تلاشی لینے پر یہ دو تصویریں ملی ہیں۔ آپ شناخت کریں۔ کیا یہی دسیم احمد درانی ہے؟“

اس نے ایک تصویر بڑھا دی۔ مراد نے اسے لے کر دیکھا اور نبھے اور نفرت سے

کہا۔ ”ہاں۔ یہی ہے وہ بد معاش.....“

انسپکٹر نے دوسری تصویر بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”اور یہ تصویر؟“

مراو نے بے دلی سے وہ تصویر لی لیکن اس پر نظر پڑتے ہی وہ چونک کر گہری توجہ سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ ایک بارہ سالہ لڑکی کی تصویر تھی مگر وہ لڑکی دسیم کی ہمشکل تھی۔ دونوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دسیم نے بال بڑھا کر اور چوٹی گوندھ کر وہ تصویر اتروائی ہے۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ ”کیا آپ دسیم کے تمام خاندان والوں سے واقف ہیں؟“

”جی نہیں!“ مراو نے جواب دیا۔ ”دسیم کے گھر والوں سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں

ہوا۔ دسیم کی زبانی اتنا سنا تھا کہ اس کا ایک بیمار باپ اور ایک بارہ سال کی بہن ہے۔“

”کیا آپ نے کبھی اس کی بہن کو بھی نہیں دیکھا ہے؟“

”جی نہیں۔“

”یہ دسیم کی بہن کی تصویر ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”اس تصویر کے پیچھے دیکھئے۔“

مراو نے تصویر کو الٹ کر دیکھا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا۔

”میری منھی منی بہن شائستہ درانی۔“

☆-----☆-----☆

ڈاک بنگلے کی رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔

ردزی پانگ پر لپٹی ہوئی بڑی خاموشی سے مراو کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ

رہی تھی اور اس کے دلی سبذبات کا اندازہ کر رہی تھی۔

مراو کھلے ہوئے سوٹ کیس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سرخ لبادہ

تھا۔ موکینڈل پاور کی روشنی میں لباوے کی سرنی جھللا رہی تھی اور مراو کی خونی آنکھوں

میں عکس ریز ہو رہی تھی۔ پھر وہ بڑبڑانے لگا۔

”وہ نہیں ملا۔ پولیس اسے تلاش کرتی رہی۔ میں خون کا پیا سا اپنی پیاس بجھانے کے

لئے اسے ڈھونڈتا رہا مگر وہ نہیں ملا۔

وہ شریف اور شرمیلا قاتل راتوں رات سرحد پار کر گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد

معلوم ہوا کہ اس کے تیار باپ نے اپنی کھاؤ کی فیکٹری فروخت کر دی ہے۔ ایک بار میں پولیس انسپکٹر کے ساتھ اس بوڑھے سے ملنے گیا تھا۔ دوسری بار تنہا گیا تو وہ کوٹھی خالی ہو گئی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ سب کچھ بیچ کر یو کے چلا گیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں باپ بیٹے ملک سے باہر ملیں گے اور کسی دوسرے ملک میں اپنے لئے رہائشی سہولتیں حاصل کر لیں گے۔

میں اس کی تلاش میں ملک سے باہر نہ جاسکا۔ ڈیڈی نے میرا پاسپورٹ چھین کر رکھ لیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ان کے حکم کی خلاف ورزی کی تو وہ مجھے حاق کر دیں گے۔ سب بیسوں کا کھیل ہوتا ہے اور میں بیسوں کے لئے باپ کا محتاج تھا۔

اب میں محتاج نہیں ہوں۔ ڈیڈی کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں آزاد ہوں۔ بنال چاہوں، جاسکتا ہوں لیکن قاتل کے پیچھے جانے کی نوبت نہیں آئی۔ راجہ مظفر علی کے سیکرٹری حامد شیخ سے میری پرانی واقفیت ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ رکس احمد ورائی کی صاحبزادی شائستہ ورائی راجہ صاحب کی ٹی اسٹٹ خرید رہی ہے اور یہ خریداری مسز گرانت کے ذریعے عمل میں آرہی ہے۔ کیونکہ شائستہ پردے کی پابند ہے۔

مگر شائستہ دوبارہ زندہ کیسے ہو گئی؟ اس کے باپ نے تو کہا تھا کہ وہ بارہ سال کی عمر میں اسے بیوہ کے لئے چھوڑ گئی تھی.....

ہاں۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔ بیوہ کے لئے چھوڑ جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ مر گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ماں باپ نے کسی جھگڑے کی بنا پر علیحدگی اختیار کر لی ہو اور شائستہ اپنی ماں کے ساتھ بیوہ کے لئے ننھیال چلی گئی ہو۔ الفاظ کے ہیر پھیر سے معنی ایک دم بدل جاتے ہیں۔ میں نے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ شائستہ زندہ تھی..... اور اب بھی زندہ ہے۔

لیکن وہ اپنے آپ کو کیوں چھپا رہی ہے۔ مغربی ممالک میں رہ کر آئی ہے اور پردے کی پابندی کر رہی ہے۔ یہ تو کچھ عجیب سی بات ہے بلکہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ شائستہ نہیں ہے۔ وسم نے قانون کے ڈر سے میرے خوف سے خود کو برحقے میں چھپا رکھا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے۔

مگر نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ قانون اٹھانا نہیں ہے۔ وسم میک اپ اور گٹ اپ

اس نے پلٹ کر روزی کی جانب دیکھا۔ وہ بے چاری انتظار کرنے کرتے سو گئی تھی۔ اس نے سرخ لباس کو سوٹ کیس میں رکھ دیا اور وہاں سے پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ دوسرے کمرے کے ایک صوفے پر دور بین رکھی ہوئی تھی، وہ دور بین اٹھا کر پھر ایک بار برآمدے کی طرف جانے لگا۔

آخر شب کی ہواؤں میں خنکی آگئی تھی۔ تاریکی بدستور مسلط تھی۔ دور پاڑی کی بلندی پر حویلی کی ٹہلی منزل اندھیرے میں ڈوب گئی تھی لیکن اوپری منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کے اندھے شیشے روشن تھے۔ وہ دور بین کو آنکھوں سے لگا کر دیکھنے لگا۔

شائستہ..... یا..... دسم؟

اندھے شیشوں کے پیچھے وہ پراسرار ہستی جاگ رہی تھی یا جاگ رہا تھا..... ادھر مراد کی آنکھوں سے فینڈاڑ گئی تھی۔ ادھر روشن شیشے رت جگا منار ہے تھے۔ ان شیشوں کی روشنی بھی تیز ہو جاتی تھی اور کبھی دھیمی پڑ جاتی تھی۔ کوئی شمع دان اٹھائے ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جا رہا تھا..... یا..... جا رہی تھی۔ مراد دیکھ رہا تھا اور کسی ایک نتیجے تک نہ پہنچنے کے باعث جھنجھلا رہا تھا۔

☆-----☆-----☆

وہ صبح ویر تک ہوتا رہا۔ وہ بجے روزی نے آکر اسے اٹھایا۔

”مراد! اٹھو۔ دس بج گئے ہیں۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر ہلانے لگی۔ اس نے دوسری کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

”ہو مجھے سونے دو۔“

”واہ! اچھی نیند ہے۔ میں حویلی سے واپس آگئی اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔“
وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر بڑے اضطراب سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچے
ہوئے پوچھا۔ ”تم گئی تھیں؟“
”ہاں!“

“يا”

”فرہٹ فلور میں؟“

”نہیں، نیچے ڈرائنگ روم میں۔ میں نے مزرگرانٹ سے کہا کہ میں ایک ٹورسٹ گروپ کے ساتھ آئی ہوں۔ یہ پرانی حویلی دیکھ کر بہت سے راجہ مہاراجاؤں کی سنی سنائی باتیں یاد آئیں۔ میں اس حویلی کو اندر سے دیکھنا چاہتی تھی اس لئے یہاں آگئی۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو مجھے یہاں کی سیر کرا دیجئے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔“

مزگرانت نے اپنے مسلح گاڑی سے فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم پرفیکٹ انفارمیشن لینا ناکمل“۔ پھر اس نے ملازم لڑکے سے کہا۔ ”بوائے مِس روزی کو ہمارا اسٹیٹ کا فرسٹ کلاس چائے مارو۔“

اس کی بولی سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ مسز گرانٹ نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر وہ پلٹ کر فرسٹ قلوور کے زینے کی طرف چلی گئی۔"

قیصر مراد نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم اوپر ہی منزل میں گئی تھیں یا نہیں؟ مجھے پوری تفصیل سے کہانی نہ سناؤ۔“

”نہیں مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں ملی۔“

”کیوں؟“

”اب اس کیوں کا ہوا اب دوں گی تو تم کہو گے کہ کہانی سنا رہی ہوں۔“

اس نے بے بسی سے ہونٹوں کو بھیج کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ”اچھا بولو..... کیا

بولنا چاہتی ہو؟“

روزی نے کہا۔ ”دو منٹ کے بعد وہ ہاؤی گارڈ فون کا ریسیور رکھ کر میرے سامنے آیا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے فرما کر بولا۔ آپ جھوٹ بولتی ہیں۔ اسٹیٹ پولیس نے بتایا ہے کہ پچھلے دو ماہ سے یہاں کوئی ٹورمنٹ گروپ نہیں آیا ہے۔ کل شام سے راجہ مظفر علی کا سابقہ سیکرٹری حامد شیخ ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت کے ساتھ ڈاک بنگلے میں آکر ٹھہرا ہوا ہے۔ نوجوان عورت کا حلیہ آپ سے ملتا ہے۔ کیا آپ وہی

محترمہ ہیں؟“

میری گردن جھک گئی۔ ایک جھوٹ کی وجہ سے مجھے شرمندگی اٹھانی پڑ رہی تھی۔ وہ کچھ اس انداز میں میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا کہ گھبراہٹ میں، میں کوئی بات نہ بنا سکی۔ اس نے کہا۔

”آپ کے لئے چائے آرہی ہے۔ چائے پینے کے بعد واپس چلی جائیں۔ حامد شیخ کی وجہ سے نرمی برت رہے ہیں۔ ورنہ اب تک پولیس نہایت احترام سے آپ لوگوں کو اسٹیٹ کے باہر چھوڑ آتی۔“

یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ ایسی توہین آمیز باتیں سن کر مجھے وہیں سے چلے آنا چاہئے تھا لیکن میں نے تمہارے قائد کی خاطر یہ توہین بھی برداشت کر لی۔ میں نے سوچا کہ شاید چائے پینے تک مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے.....“

مراو نے پھر جھلا کر کہا۔ ”تمہاری چائے کی ایسی کی تیشی کم سے کم احتفاظ میں کہو۔ کیا کام کی بات معلوم ہو گئی؟“

”ہاں۔ مسز گرانٹ اوپر سے رومی کی ٹوکری اور سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھرا ہوا ایش ٹرے لے کر آئی اور ملازم سے بولی کہ انہیں ڈسٹ بن میں نے جا کر پھینک دے۔ سگریٹ کے ٹوٹے دیکھ کر میں چونک گئی۔ سوچنے کی بات ہے مراو۔ جو مسلمان لڑکی پردے

”جب میں حویلی میں سے باہر آرہی تھی تو مسز گرانٹ نے بالکونی سے کوچوان کو آواز دے کر کہا تھا کہ ابھی تیار رکھے۔ شائستہ باگنے کے بعد چائے کے باغات دیکھنے جائے گی۔“

مراد اچھل کر پلنگ سے اتر گیا اور اپنے کپڑے پہنتے ہوئے بولا۔ ”شائستہ تمہیں دسیم اپنے باغات کو دیکھنے جائے گا۔ تمہیں یہ بات پہلے کہنا چاہئے تھی۔ بہر حال میں اسے راستے میں گھیر لوں گا۔“ کپڑے پہننے کے بعد وہ جوتے پہننے لگا۔ ”تم سادہ شیخ کے ساتھ اس کی گاڑی میں واپس چلی جاؤ۔ ورنہ پولیس تمہیں بھی میرے جرم میں ملوث کرے گی۔“

”اسٹیٹ پولیس ہم تینوں کو جانتی ہے۔“

”ان کے جاننے سے کچھ تمہیں ہو گا۔ سادہ شیخ کہہ دے گا کہ اسے میری نیت کا علم نہیں تھا کہ میں یہاں کسی کو قتل کرنے آیا ہوں اور تم ایک بکنے والی چیز ہو۔ تمہیں کوئی شریف دولت مند بھی خرید سکتا ہے اور مجھ جیسا مجرم بھی۔ تم بھی یہی بیان دے دینا کہ تمہیں میری مجرمانہ نیت کا علم نہیں تھا۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا سوٹ کیس کے پاس آیا اور اسے کھول کر جلد بازی میں کپڑے انٹ پلٹ کرنے لگا۔ پھر اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور آگیا۔ روزی نے قریب آکر کہا۔

”مراد! میں اچھی عورت نہیں ہوں مگر میرا دل اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم قانون کو ہاتھ میں لو۔ دسیم خود ایک مجرم ہے۔ تم اسے قانون کے حوالے کر کے انتقام لے سکتے ہو۔“

”دور ہو!“ اس نے ایک طرف اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”کیا عدالت اسے ایسی سزا دے سکتی ہے کہ وہ شینہ کی طرح تڑپ تڑپ کر مرے؟ میں۔ اسے ایسی سزا صرف میں ہی دے سکتا ہوں۔ میں اسے ایسی اذیت تاک.....“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ دور بہت دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں کان لگا کر سننے لگے۔ روزی نے کہا۔ ”شاید وہی ابھی آرہی ہے۔“

مراد دوڑتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ دروازے کی نشیبی سڑک پر دو گھوڑوں کی ایک بٹھی دوڑی آرہی تھی۔ بٹھی کے آگے چھ چار گھوڑوں پر اسٹیٹ کے سپاہی اور ایک انسپکٹر نظر آرہے تھے۔

دردی سے ہلاک کیا تھا اور قانون کے ہاتھوں سے بچ کر سرحد پار چلا گیا تھا۔ میں اس قاتل کی تلاش میں یہاں آیا ہوں اور دعوے سے کہتا ہوں کہ شائستہ درانی کے نام سے اس ایٹھ کو خریدنے والا وہی قاتل ہے اور وہ..... اس وقت..... اس کوچ میں موجود ہے۔“

انسپکٹر نے تبھی کی طرف سے پلٹ کر پوچھا۔ ”کیا تم نشے میں ہو؟ اس کوچ میں درانی ایٹھ کی معزز مالکہ شائستہ بیگم ہیں۔“

”کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھا ہے؟“

انسپکٹر نے قدرے پریشان ہو کر تبھی کی جانب دیکھا، پھر ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

”کسی معزز پردہ نشین خاتون کو میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔“

مراد نے تنہی سے مسکرا کر کہا۔ ”میری درخواست ہے کہ آپ کسی لیڈی کانشیل کو بلائیں۔ وہ تو بیگم صاحبہ کو دیکھ سکتی ہے نا؟“

اتنے میں تبھی کا دروازہ کھلا۔ مسز گرانٹ باہر آتی ہوئی بولی۔ ”دبٹ انسپکٹر! مس اس نوجوان کو میسٹرائی کرنا مانگتا ہے..... کم آن مس! ہم پہلے بولا کہ پبلک کے سامنے میں آؤ۔ ڈرنے کا شرم کرنے کا بات نئی ہے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک سیاہ برقعہ تبھی سے اترنے لگا۔ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ مراد دیکھ رہا تھا، برقعے سے باہر جو ہاتھ نظر آرہے تھے، وہ گورے، پکنے اور ملائم تھے۔ صرف وہ دو سبک اور نازک سے ہاتھ بتا رہے تھے کہ برقعے کے اندر ایک مکمل دوشیزہ ہے، جس کے نسوانی وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔

وہ برقعے کے پیچھے سر اٹھائے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ برقعے کے ثمن کھولنے لگی۔ آہستہ آہستہ نارنجی رنگ کی شلوار قمیض اور دہپہ اجلی دھوپ میں شعلوں کی طرح آج دینے لگا۔ لباس کا وہ رنگ مراد کی کنزروی سے کھیل رہا تھا۔ اس کی موج اور سمجھ کے مطابق لڑکی جوان ہو اور خوبصورت ہو تو اس رنگ کے لباس میں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی ہے۔

پھر اس نے اپنے سرے سے نقاب اتار کر پھینک دی..... وہ شائستہ تھی۔

اس کے حسین کھڑے کو دیکھ کر مراد ایک ساعت کے لئے سانس لینا بھول گیا۔

گلابی گلابی چہرہ، گلاب کی پتیوں جیسے نازک ہونٹ، ستواں ناک، بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھوں میں کاجل کی دھار تلوار سے زیادہ خطرناک تھی۔

وہ آنکھیں مراد کو دیکھ رہی تھیں اور مراد اسے دیکھ رہا تھا۔ آج سے سات سال پہلے اس نے شائستہ کی تصویر دیکھی تھی۔ اس وقت وہ بارہ برس کی تھی۔ ہو ہو اپنے بھائی کی شکل پر گئی تھی۔ اب بھی اس کے چہرے سے بھولا سرا دسیم جھانک رہا تھا۔ مگر کئی وہ اور کہاں یہ۔ یہ تو صنف نازک کی نزاکت اور شگفتگی کا ایک ایسا جیسا جاگتا نمونہ تھی کہ کوئی سنگ تراش اس کے جسم کی شادابیاں تراشنے بیٹھتا تو اس کے ہاتھ کانپ کانپ جاتے یا پھر وہ خود ہی پتھر کی طرح ساکت ہو جاتا، جیسے مراد ہو گیا تھا۔

”مراد!“ شائستہ نے مترنم لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تمہارا شبہ ددر ہو گیا؟“

مراد نے اس سے پوچھا۔ ”دسیم کہاں ہے؟“

وہ زہر لب مسکرائی۔ جواب دینے کے لئے اس کے ہونٹوں میں لرزش پیدا ہوئی۔ پھر اس نے مسز گرانٹ کی جانب پلٹ کر کہا۔ ”آپ سپاہیوں کے ساتھ آگے چلی جائیں، میں پیچھے پیچھے آتی ہوں۔ مراد مجھ سے ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں مراد؟“ مراد نے اثبات میں سر ہلادیا۔ مسز گرانٹ سمجھی میں بیٹھ گئی۔ تمام سپاہی سمجھی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ شائستہ نے کوتاہی کی سڑک پر آکر کہا۔

”آؤ مراد۔ میں ایک عرصے کے بعد کھلی فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ ایک عرصے کے بعد تمہیں دیکھنے ہی پر دے سے باہر آگئی ہوں۔“

وہ شائستہ کے ساتھ سڑک پر چلنے لگے۔ روزی تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی انہیں دیکھتی رہی، پھر ایک سرد آہ بھر کر ڈاک بنگلے کی طرف جانے لگی۔

وہ دونوں تھوڑی دور تک خاموشی سے چلتے رہے پھر شائستہ نے کہا۔ ”تم شاید پہلی بار مجھے دیکھ رہے ہو لیکن میں برسوں سے تمہیں جانتی ہوں۔“

”کیسے؟“

”دسیم کی زبان سے تمہارا ذکر سنتی رہتی تھی۔ اس کے پاس تمہاری تصویر بھی دیکھی ہے۔“

”دسیم کہاں ہے؟“

”تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔ اسے بتانا چاہتا ہوں کہ موت کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔“

”وہ زندہ ہے لیکن اندر سے مر گیا ہے۔ تم اسے کیا نارو گے؟“

اس نے ناگواری سے کہا۔ ”میں فلسفیانہ باتیں نہیں سمجھتا۔ سیدھی زبان میں بتاؤ“

وہ کہاں ہے؟“

شائستہ نے گفتگو کا رخ موڑنے کے لئے اپنے دوپٹے کو درست کیا۔ دوپٹے کا آٹھل لہرا تو مراد کی نگاہوں کے سامنے ایک شعلہ سالک گیا۔

”دسیم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں سرخ اور نارنجی رنگ کا لباس پسند ہے۔ یہ لباس تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟“

”لباس بھی اچھا ہے اور تم بھی اچھی ہو۔ میرے خیال سے زیادہ خوبصورت ہو۔
دسیم کو قتل کرنے کے بعد میں تم سے شادی کی درخواست کروں گا۔“

اس کے رخسار حیا سے تھمنا لگے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو تم..... تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو اور وہ تم سے اب بھی ویسی ہی محبت کرتا ہے۔ وہ آج بھی تمہاری خاطر اپنی جان دے سکتا ہے۔“

اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اسی لئے اس نے ثینہ کی جان لی تھی۔“

”اس نے قصداً ایسا نہیں کیا۔ ثینہ کی اشتعال انگیزی نے اسے مجبور کر دیا تھا۔“

”تو اسے مت کرو۔ تم اپنے بھائی کی صفائی پیش کر کے میری ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی ہو تم سمجھتی ہو کہ میں اسے معاف کر دوں گا۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ میں ثینہ کے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔“

وہ چلتے چلتے رک گئی اور التجا آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ان جھیل جھیلی گہری آنکھوں میں التجا بھی تھی، دکھ بھی تھا اور بے انتہا محبت بھی۔ مراد سرزدہ سا ہو کر چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر اپنی کمزوری کا احساس ہوتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔ نظریں جھکیں تو سانس لیتے ہوئے ریشمی بدن پر آکر ٹھہر گئیں۔ وہاں بھی سحر تھا، شراب سے زیادہ نشہ تھا۔ وہ نظریں ہٹا کر آگے بڑھنے والوں کو دیکھنے لگا۔ انہیں ایک جگہ رکتے دیکھ کر آگے بڑھنے والی سبھی اور سپاہی بھی رک گئے تھے۔

شرائستہ نے بڑے ہی ہذبِ باقی انداز میں کہا۔ ”مراد! تمہاری خوشی میں اس کی خوشی۔ تم اس کی دوستی اور محبت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ تمہاری خوشی کے لئے اپنی جان دے دے گا، بلکہ وہ تمہارے ہاتھوں سے قتل ہونے کے لئے اب تک چھپا بیٹھا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ تم سے پہلے قانون کے ہاتھ اس تک پہنچ جائیں اور تمہارے دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے۔“

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا، پھر یقین نہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنی لچھے وار باتوں سے مجھے بہلا رہی ہو۔ کون ایسا احمق ہے جو دانستہ کسی کے ہاتھوں قتل ہونے کی تمنا کرے؟“

”دوستی اور محبت میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب یہ دنیا اچھی نہیں لگتی۔ زندگی بوجھ بن جاتی ہے۔ ایسے وقت محبوب کے ہاتھوں مرنے سے آرام آتا ہے۔“

مراد! وہ ایسی جگہ چھپا ہے جہاں کسی کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ وہاں صرف تم پہنچو گے۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم قاتل بن کر اس کے سامنے جاؤ۔ تم ٹھنڈے دل سے سوچو کہ اسے قتل کرو گے تو تمہاری زندگی بھی جیل کی چار دیواری میں مغالط ہو جائے گی۔ کیا یہ دانش مندی ہے؟“

مراد نے اسے گہری نظروں سے دیکھا اور سوچا کہ لومڑی کی چال چلتی ہوگی۔ شائستہ کی ہاں میں ہاں ملا کر ہی وہ دسیم تک پہنچ سکتا ہے۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”اچھی بات ہے، میں اس سے دشمن بن کر نہیں ملوں گا۔“

”اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو۔ تم برسوں سے انتقام کی آگ میں جل رہے ہو۔ پہلے تشائلی میں بیٹھ کر سوچو اور اس آگ کو ٹھنڈا کرو، اس کے بعد تم دوست بن کر آؤ یا دشمن بن کر۔۔۔۔۔ میں دسیم کی خواہش کے مطابق تمہیں اس کے پاس پہنچا دوں گی۔۔۔۔۔ تم بھی ضدی ہو اور وہ بھی ضدی ہے۔ تم قتل کرنا چاہتے ہو، وہ قتل ہونا چاہتا ہے۔ ہر سال آج رات کا کھانا تم ہمارے ساتھ کھاؤ، اس کے بعد میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گی۔ تم آؤ گے نا؟“

اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ دشمنوں کی دعوت پر اسے قتل کرنے چلا آؤں۔“ پھر اس نے غصے میں سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں آج نہیں۔ تمہارے

مشورے کے مطابق میں اتنی جلدی فیصلہ نہیں کروں گا۔ آج رات سوچوں گا۔ اگر تمہارا مشورہ قابل قبول ہوا تو میں کل رات کو تم سے ملنے آؤں گا۔“
وہ ذرا اداس ہو گئی اور ملتی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”میری دلی تمنا ہے کہ آج کی شام تم میرے ساتھ گزارو اور رات کا کھانا..... مگر نہیں۔ تم ہمیں دشمن سمجھتے ہو۔ تم اپنے طور پر مختار ہو۔ مجھے تم سے شکایت نہیں ہے۔ میں کل شام کو تمہارا انتظار کروں گی اور تمہاری پسند کا سرخ جوڑا پہن کر تمہیں خوش آمدید کہوں گی.....“
خدا حافظ!

مراو کی نگاہوں کے سامنے پھر وہی سرخ، قرمزی اور نارنجی رنگ جھلکانے لگے۔ لہو سرخ، لباس مرغ، ہونٹوں کے گلاب سرخ اور جذبوں کی آب و تاب سرخ۔ اتنے سارے رنگ گڈمڈ ہو کر نظروں سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ شائستہ جتنی دور ہوتی جا رہی تھی، اتنا ہی اسے اپنے قریب کھینچتی جا رہی تھی۔ پھر وہ یکبھی کے اندر پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

☆-----☆-----☆

آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر تھی۔ حویلی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نچلی منزل کی تاریکی تاری تھی کہ مسز گرانٹ اور دوسرے ملازم گہری نیند سو رہے ہیں۔ اوپر ایک کمرے میں موی شمعیں روشن تھیں۔ شائستہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے عکس کو اتنی محویت سے دیکھ رہی تھی، جیسے وہ اپنے آپ کو نہیں، کسی اجنبی لڑکی کو دیکھ رہی ہو اور پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے جسم پر سفید ریشم کی نائٹی تھی۔ بالکونی کے اٹھ کھلے دروازے سے آنے والی خنک ہوائیں اس نائٹی کو چھیڑ رہی تھیں اور بدن کی حدت کو بولے بولے تھپک رہی تھیں۔

اس کے دائیں طرف دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ دروازہ بند تھا لیکن اس کے پیچھے سے کبھی کبھی وسم کی آہ سنائی دیتی تھی۔ پھر وحشی وحشی ی آواز رات کی خاموشی میں سننے لگی تھی۔

”آہ۔ کب یہ انتظار ختم ہوگا؟“

وہ کب آئے گا؟

”آ..... میری جان کے دشمن! کوئی آخری فیصلہ کر لے.....؟“

طویل سسکیوں کے بعد وہ آواز گم ہو جاتی۔ تھوڑی دیر کے لئے کمر خانا چھا جاتا۔ اس کے بعد پھر دی آہیں، پھر دبی فقرے دہرانے کی آواز آتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوش و حواس میں نہیں ہے اور ایک رولنگ ٹیپ کی طرح بار بار اپنی آہوں اور فقروں کو دہراتا جا رہا ہے۔

شائستہ غمگین اور پریشان نظروں سے اس کمرے کی جانب دیکھنے لگی اور سوچے لگی۔

”وہ آئے گا..... آج نہیں آئے گا..... کل ضرور آئے گا..... ہمیں دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس کمرے سے گونجنے والی آہ و فغاں کو اب ختم ہو جانا چاہئے۔ دسیم کی آواز مجھے مایوس کر دیتی ہے.....“

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شمع دان کے پاس آئی اور اسے اٹھا کر دوسرے کمرے کی جانب پلٹ گئی لیکن بالکونی کے دروازے سے گزرنے وقت اس کے قدم اچانک رک گئے۔

سامنے درخت پر سرخ رنگ لہرایا تھا۔ پھر مراد درخت کی شاخ سے جھولتا ہوا بالکونی کے پتے پر آگیا۔ وہ گودن سے پاؤں تک سرخ لہاڑے میں چھپا ہوا تھا۔ شائستہ کو دیکھتے ہی وہ بالکونی میں ایک ذرا سايوں جھک گیا جیسے اسے دیکھ کر ٹھک گیا ہو۔ شائستہ بھی اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں شمع دان تھا اور بائیں ہاتھ کو اس نے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لیا تھا۔

پھر وہ لائبے لائبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے میں آیا۔ شائستہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بول۔

”تم..... تم نے تو کہا تھا کہ آج نہیں آؤ گے؟“

وہ تلخی سے منہ بنا کر بولا۔ ”میں نے اس لئے کہا تھا کہ تم میری طرف سے غافل رہو گی اور تمہیں میرے خلاف کوئی چال چلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ تم نے مجھے دعوت دی تھی کہ تمہارے بھائی کا دوست بن کر یا دشمن بن کر یہاں آؤں۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ دشمن کے گھر دشمن بن کر آؤں گا تو میرا کیا حشر ہو گا؟“

میں اپنے دماغ سے سوچتا ہوں اور اس پر عمل کرتا ہوں۔ ابھی یہاں چھپ کر آنے

نیچے جا کر ملازموں سے کہہ دیجئے کہ یہاں گولیاں چلنے لگی ہیں تو کوئی یہاں نہ آئے۔ یہ میرا حکم ہے۔“

سزگرانٹ نے حیرانی سے کہہ ”مس! تم کیسا مافی بات کرتا ہے۔ یہ آدمی ڈیجرس ہے۔“

”ہونے دو۔ میں جو کہتی ہوں وہ کرو۔ پلیز لیو اس ایلون۔ میں اپنی حفاظت آپ کروں گی۔“

سزگرانٹ تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔ ہسپتال پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ شائستہ نے قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہہ

”آپ بہت وفادار ہیں۔ یہ بھی آپ کی وفاداری کا امتحان ہے۔ میرا حکم ماننے اور یہاں سے چلی جائیے۔“

سزگرانٹ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہاں سے جانا نہ چاہتی ہو۔ پھر اس نے نظریں نیچی کر لیں اور مجبوراً سر جھکا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

شائستہ نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ پھر وہ بالکونی کی طرف گئی اور وہاں کا دروازہ بھی بند کرنے لگی۔ مراد اس کی ان حرکتوں سے الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لڑکی اپنے بھائی کے دشمن کی حفاظت کیوں کر رہی ہے۔

شائستہ نے دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کرنے کے بعد کہہ ”اب تم محفوظ ہو۔ میں نے ٹیلی منزل سے آنے والوں کے قیام راسخے بند کر دیئے ہیں۔ اب اگر تم دسیم کو قتل کرنا چاہو تو تمہارا ہاتھ کوئی نہیں پکڑے گا لیکن اس کے پاس جانے سے پہلے تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

”کہو“ مراد نے کہہ ”اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“ شائستہ آہستہ آہستہ ایک اونچے سے استول پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”شکاری شکار کھیلنے سے پہلے اپنے شکار کے عزاج کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔“

”میں دسیم کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

”کچھ ایسی باتیں ہیں جنہیں تم نہیں سمجھتے۔ میں دسیم کے ماضی کی چند باتیں بتانا چاہتی ہوں۔ اگر تم غور سے نہیں سنو گے تو بعد میں تمہیں افسوس ہو گا۔“

مراد یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے می اور ڈیڈی کو ایک بیٹی کی آرزو تھی۔ بڑے گھرانوں میں بیٹیاں بوجھ نہیں سمجھی جاتیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ بیٹیوں سے گھر کی رونق بڑھتی ہے۔

بہر حال میرے والدین کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ان کی توقع کے خلاف دسیم پیدا ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ حمل کے دوران بچہ لڑکا یا لڑکی کی سوچوں، امنگوں اور خواہشات کا اثر پڑتا ہے، دسیم اپنی پیدائش سے ہی لڑکیوں جیسی نزاکت اور خوبصورتی لے کر آیا تھا۔

میری می اسے لڑکیوں کے فرائض پڑھاتی تھیں اور لڑکیوں جیسے بال سنوارتی تھیں۔ جب اس نے توہلی زبان سے بولنا شروع کیا تو اس کی بولی بھی لڑکیوں جیسی تھی۔ پانچ سال کے بعد ڈیڈی نے میری می کو سمجھایا کہ اب اسے لڑکوں کے روپ میں آنا چاہئے کیونکہ اب وہ گھر کے ماحول سے نکل کر اسکول جایا کرے گا۔

وہ اسکول جانے لگا۔ وہاں کا ماحول اسے سکھاتا تھا کہ وہ لڑکا ہے۔ گھر میں ماں کا اندھا پیار سمجھاتا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ اسی کشش میں وہ عمر کی منہ لیس طے کرنے لگا۔ پندرہ برس کی عمر میں اس کی ملاقات تم سے ہوئی۔ وہ تمہاری مردانہ شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ رفتہ رفتہ دوحث بن کر تمہارے قریب آ گیا۔

ڈیڈی اسے سمجھایا کرتے تھے کہ اسے مردوں کی طرح چلنا پھرنا اور بولنا چاہئے۔ اگر وہ عورتوں کی سی نزاکت کرے گا تو لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے۔ ڈیڈی کی عزت اور مربے کا خیال کر کے وہ زنانہ طرز زندگی سے پرہیز کرنے لگا۔ فیکٹری میں، کلبوں اور ہونٹوں میں اور دیگر تقریبات میں اس کی می کو شش ہوتی تھی کہ وہ خود کو کھل مرد ظاہر کرے۔ وہ اپنی ان کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا لیکن پیدائشی خصوصیات وقتی طور پر دب جاتی ہیں، بالکل ہی ختم نہیں ہو جاتیں۔ وہ تمہارے سامنے آکر کمزور پڑ جاتا تھا۔

اس کی دوستی کے پس پردہ وہ لڑکی چھپی ہوئی تھی جو می کی گود میں اور ان کے اندھے پیار کے سائے میں پرورش پا رہی تھی۔ دسیم بہت ہی ذہین اور صابر تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے اندر بیٹھی ہوئی لڑکی کو پکارتا رہتا تھا۔ اس نے تم سے کبھی اس کشش کا ذکر نہیں کیا۔

وہ سوچتا تھا کہ نہ جانے تم اس کے متعلق کیسی رائے قائم کرو گے۔ اس کے علاوہ اس نے قسم کھائی تھی کہ اپنے ڈیڈی کی عزت پر کبھی حرف نہیں آنے دے گا۔

وہ تمہارے پاس اکثر آتا تھا۔ تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ دقت گزارتا تھا اور اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ بس اتنی قربت کافی ہے۔ وہ اس دوستی کے پردے میں چھپ کر اسی طرح ساری زندگی گزارنے کا لیکن، کبھی اس کے ساتھ مذاق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں بڑی رازدارانہ پریشان کن تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اس نے گھبرا کر مئی سے ذکر کیا۔ مئی نے ڈیڈی کو بتایا۔ ڈیڈی بوکھلا کر ڈاکٹروں سے کونسلٹ کرنے لگے۔ ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور کہا کہ یہ تبدیلیاں جنسی مخالف کی تکمیل تک پہنچیں گی۔ اگر ان تبدیلیوں کے دوران کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے تو آپریشن اور میڈیکل ٹرینمنٹ کی ضرورت پیش آئے گی۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں استعمال کے لئے لکھ کر دے دیں۔

ڈیڈی کو یہ خیال ستا رہا تھا کہ دسیم ان کی سوسائٹی میں ایک مذاق بن جائے گا۔ جب وہ کوٹ پتلون کی بجائے ساڑھی یا شلوار کرتے پسینے سے لپکتے گا تو لوگ قہقہے لگائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سوسائٹی کو اور اس ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے اور تمام جائیداد بیچ کر لندن دسیم کے چچا کے پاس چلے جائیں گے۔

دسیم کو ڈیڈی کے ارادوں کا علم ہوا تو وہ تم سے بچھڑ جانے کے خیال سے پریشان ہو گیا۔ آخری بار تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لئے وہ تمہارے پاس آیا۔ اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے اور وہ تم سے کیوں بچھڑنے والا ہے۔ اس نے سوچا کہ جہاں اتنے عرصے تک رازداری رہی وہاں اب جدا ہوتے دقت زبان کھولنا اور ڈیڈی بس سچائی کو راز بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، اس راز کو فاش کرنا دانشمندی نہیں ہے۔

لیکن وہاں ٹینے کو تمہاری محبوبہ کے روپ میں دیکھ کر اس کے دل میں حسد و رقبت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پھر بھی اس نے ٹینے سے نفرت اور تم سے محبت کا اظہار نہیں کیا، صرف تمہاری دوستی کا دم بھرتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد اسے ٹینے کے ہرجائی پن کا علم ہوا تو اس نے تمہارے سامنے کھل کر اس سے نفرت کا اظہار کیا مگر تم اس سے نفرت

کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ تم نے وسم سے کہا کہ تم ٹینہ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ وہ سرخ لباس میں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی ہے۔

یہ سرخ لباس دالی بات وسم کے دل میں بیٹھ گئی۔ رات کو جب کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔ ٹینہ تمہارے ساتھ چلی گئی تھی تو وہ اس کی خواب گاہ میں آیا اور اس کی الماری سے یکے بعد دیگرے سرخ لباس نکال کر اپنے جسم پر سجانے لگا اور آئینے میں دیکھ کر سوچنے لگا کہ آپریشن کے بعد کیا وہ ایسے لمبوسات میں خوبصورت نظر آئے گا؟ کیا تم اسے بھی دنیا کی حسین ترین لڑکی سمجھو گے؟

وہ ایک ایک لباس پہن رہا تھا اور انہیں اتار کر ادھر ادھر پھینکنا جا رہا تھا۔ آخری بار اس نے سرخ لباس کو ہاتھوں میں لیا تو ٹینہ خلاف توقع وہاں پہنچ گئی۔ اس نے یہی سمجھا کہ وسم اسے چاہتا ہے اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے لباس کو سینے سے لگا کر اپنی حسرت پوری کرتا ہے یہ سوچ کر وہ اسے محبت کے نام پر گناہ کی دعوت دینے لگی۔ وسم پریشان ہو کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس پر ٹینہ نے طعنہ دیا کہ وہ مرو نہیں ہے۔ یہ طعنہ اس کے دماغ میں ایک ہتھوڑے کی طرح لگا۔ برسوں سے بس راز کا علم کسی کو نہ تھا، وہ راز ٹینہ کی زبان پر آگیا تھا۔ وہ جھنجھلا کر اسے مارنے لگا۔ ٹینہ اسے اور زیادہ بھڑکانے لگی۔ اس نے دھمکی دی کہ وسم نے اگر اس کی آرزو پوری نہ کی تو دو دنیا والوں سے کہہ دے گی کہ وہ عورت ہے اور اسی لئے عورت سے دور بھاگتا ہے۔

وسم نے پتھل کا گلدان اٹھا کر اس پر حملہ کر دیا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا بس راز کے لئے وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ یہ ملک چھوڑ رہا تھا، وہ ٹینہ کی زبان سے طعنت از بام ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نسوانیت برداشت کر سکتا تھا مگر اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ دنیا والوں کے سامنے اس کے ڈیڈی کا سر جھک جائے۔ بس اس جذبے نے اسی پاگل پن نے اسے قاتل بنا دیا۔.....

بھانستہ یہ کہہ کر ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گئی اور مراد کو دیکھنے لگی۔ مراد بڑی محبت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی وہ ایسے چوک گیا جیسے کسی دلچسپ کہانی کا طلسم ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”میں کیسے مان لوں کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ درست ہے۔ دروازہ کھولو“ میں

میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“
وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی، خاموشی سے چلتی ہوئی مینٹل پیس کے پاس آئی اور وہاں سے شمعہ ان اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔
مراد کچھ مضطرب ہو کر دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ شائستہ کی ہول میں چابی ڈال کر اسے کھول رہی تھی۔

دروازہ کھل گیا۔ وہ ہاتھ میں شمعہ ان اٹھائے اندر چلی گئی۔
سرا د بھی تیزی سے آگے بڑھا، پھر دروازے پر پہنچ کر ذرا ٹھٹک گیا۔
کمرہ لمبو کی طرح سرخ تھا۔ درو دیوار سرخ۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پردے سرخ۔ بستر کی چادر اور نیکے کے غلاف سرخ اور فرش پر بچھا ہوا قالین بھی سرخ تھا۔ شیشہ کی خواب گاہ سے سرخ لباس چرا کر اپنے جسم پر سجانے والے دسیم نے اپنے کمرے کو دنیا جہاں کی سرخیوں میں ڈبو دیا تھا۔
”لیکن دسیم کہاں ہے؟“

وہ کمرے میں آکر چاروں طرف دیکھنے لگا۔
قریب ہی ایک تپائی پر رکھے ہوئے ریکارڈ پر ردنگ ٹیپ بولنے لگا۔
”اہ۔ کب یہ انتظار ختم ہو گا..... وہ کب آئے گا؟ آہ..... میری جان کے.....“

مراد نے جھلا کر ریکارڈ کو ایک ٹھوکر ماری اور غصے سے چیخنے لگا۔ ”دسیم کہاں ہے؟ جھوٹی..... مکار!“

وہ چیختا چنگھاڑتا ہوا شائستہ کے پاس آیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گرون دیوچ کر بولا۔ ”بتاؤ دسیم کہاں ہے؟ تم جھوٹی کہانیاں بنا کر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔“
وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کہانی سب تک مکمل نہ ہو وہ جھوٹی سمجھی جاتی ہے۔ پہلے میری بات سن لو۔“

اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہو گئی۔ وہ سرا د کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ”دسیم کی کوئی بہن نہیں تھی۔ شائستہ درانی کا کوئی وجود نہیں ہے..... اب تو مجھے پہچان لو میرے قاتل.....“

مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگہ وہ شدید حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ خاموش کھڑی زحیر لب مسکرا رہی تھی۔

کمرے میں پھیلی ہوئی سرخیاں جھلجھل کرتی ہوئی اس کے حسین چہرے پر منعکس ہو رہی تھیں..... دنیا کی حسین ترین لڑکی.....!

مراد کی مجلس انگلیاں کانپتی ہوئی گردن سے چہرے پر آگئیں اس کے رخسار کو چھونے لگیں۔ اس کے ملائم ہونٹوں کی بھولی ہوئی گفتار کو یاد کرنے لگیں..... انگلیاں آنکھیں بن گئی تھیں اور ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

باہر دروازے کو بہت سے لوگ پیٹ رہے تھے۔ مسز گرانٹ کہہ رہی تھی کہ ابھی شور مٹائی دیا ہے۔ مِس کی آواز نہیں آرہی ہے۔ پھر وہ ہلائی گارڈ کے ساتھ ددڑتی ہوئی ایک کوریڈر سے دوسرے کوریڈر میں آئی اور اس کمرے کے دروازے کو پینے لگی، جسے سرخ کمرہ کہا کرتی تھی۔ ہلائی گارڈ نے سنا۔

”یہاں بھی کسی کی آواز نہیں آرہی ہے..... نہیں..... آرہی ہے.....“

آواز آرہی ہے..... کوئی بول رہا ہے۔“

وہ دونوں دروازے سے کان لگا کر سننے لگے۔

بند دروازے کے پیچھے سے بہت ہی دھیمی دھیمی آواز ابھر رہی تھی۔

”دیسو..... میری دیسو..... میری دیسو! تم میری پہلی اور آخری محبت

ہو.....!“

منخوس تاربخ

خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں بسنے والے ایک ادھیڑ عمر شخص کا فسانہ
عبرت۔ دو اپنی بیوی کو بھول کر دوسری عورت سے عشق لڑانے چلا تھا۔
مقدر خراب نہ ہوں تو کوئی دن اور تاربخ منخوس نہیں ہوتی۔

وہ ایک پرانی شکستہ سی عمارت تھی۔ منزل بہ منزل پہنچانے والی لفٹ بھی عجیب پرانے ڈھنگ کی تھی۔ یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی تابوت کو اٹھا کر کھڑا کر دیا گیا ہے اور لوگ اس جہانِ فانی سے پرواز کرنے کے لئے اس میں داخل ہو رہے ہیں۔

گیرمی سفورڈ اس تابوت نما لفٹ کو دیکھ کر ذرا سہم سا گیا۔ کئی سال پہلے وہ ایک بار اس لفٹ کے اندر گیا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد بھی لفٹ تھوڑی دیر تک حرکت میں نہیں آئی۔ پھر ہلکے ہلکے جھٹکے کھا کر بلند ہونے لگی اور اس کے ہر جھٹکے کے ساتھ گیرمی کا سانس رکنے لگا۔ ایسے وقت اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی اگر اس کا بس چلتا تو دروازہ توڑ کر باہر نکل جاتا۔ بد قسمتی سے وہ کلشرو فونیا کا مریض تھا۔ ایسے مریض 'لوگوں کے ہجوم سے گھبراتے ہیں۔ بند کمرے میں تھکن محسوس کرتے ہیں اور لفٹ تو ایسی چیز ہے جو چاروں طرف سے قبر کی طرح بند ہو جاتی ہے۔ لہذا وہ اس تابوت میں جانے کی جرأت نہ کر سکا اور زینے طے کرتے ہوئے ساتویں منزل کی طرف جانے لگا۔

ساتویں منزل پر معروف دندان ساز ڈاکٹر ٹینگ کا جیمبر تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دانتوں کے درد سے نجات دلانے کے لئے زود اثر دوائیں دلی تھیں اور کہا تھا کہ ان دواؤں کے باوجود اگر وہ کسی وقت بھی جیمبر میں آکر دوسری دوائیں لے سکتا ہے۔ گیرمی کے لئے یہ دوپہر کا وقت موزوں تھا کیونکہ دوپہر کو دوسرے مریض نہیں آتے تھے۔ اس تنہائی میں وہ ڈاکٹر کی خوبصورت اسسٹنٹ مارگو سے دو باتیں کر سکتا تھا اور ایمپائر کے رومان حول میں اسے کچھ پینے پلانے کے لئے مدعو کر سکتا تھا۔ یعنی درد صرف دانتوں میں نہیں تھا، دل میں بھی تھا۔

ساتویں منزل پر پہنچ کر وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ جیمبر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد اس نے رومال نکال کر چہرے اور

مردوں سے پسینے کو پونچھا، بالوں میں کنگھی کی تاکہ مارگو کی نظروں میں اسماٹ نظر آئے۔
پھر وہ دردناک کھول کر وینٹنگ روم میں داخل ہو گیا۔

حسب توقع وینٹنگ روم میں ایک بھی مریض نہ تھا۔ صوفے خالی تھے، درمیانی میز پر
اخبار اور رحالے بکھرے ہوئے تھے۔ اسی وقت مارگو، ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر آئی
اور اسے دیکھتے ہی بولی۔

”ہیلو مسٹر گیری! ڈاکٹر تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“

”صرف ڈاکٹر؟ کیا تمہیں میرا انتظار نہیں تھا؟“

وہ جواباً مسکراتے ہوئے گئی۔ گیری نے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ ”آج شام کو ایسا پار میں

ملو گی؟“

”اوں ہونہ۔ آج شام تک تم سرجری روم میں رہو گے۔ میں حیران ہوں کہ ڈاکٹر
آج خصوصی توجہ سے تمہارا علاج کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے دوسرے مریضوں سے
فون پر معذرت کی ہے کہ آج وہ مصروف ہیں، کسی مریض کو اینڈر نہیں کر سکیں گے۔ ایسا
پہلے کبھی نہیں ہوا۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ ڈاکٹر نے کبھی ایک مریض کی خاطر دوسرے
مریضوں کو نظر انداز کیا ہو۔“

گیری نے اس پر ہلکتے ہوئے کہا۔ ”مجھ میں کچھ غیر معمولی خوبیاں ہیں۔ اسی لئے
صرف ڈاکٹر ہی نہیں، تم بھی خصوصی توجہ دیتی ہو۔ بولو، آج شام ایسا پار میں آؤ گی ما؟“
”نہیں۔ آج میں بہت مصروف ہوں۔“

”صاف کیوں نہیں کہتیں کہ ڈاکٹر وینٹنگ سے ڈر لگتا ہے۔ اگر وہ میرے ساتھ
تمہیں دیکھ لے گا تو.....“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ وہ ڈاکٹر بھی تو تمہاری بیوی کی
بانسوں میں بائیں ڈال کر گھومتا ہے۔ کیا تمہاری بیوی تم سے ڈرتی ہے؟“

گیری کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ پہلی بار اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ
ڈاکٹر سے اس کی بیوی برائے کی آشنائی ہے۔ اس نے مارگو سے مزید کچھ پوچھنا چاہا۔ اسی
وقت ڈاکٹر وینٹنگ کے کمرے سے اس کی آواز آئی۔

”مارگو! تم نے ایکسرے رپورٹ کہاں رکھی ہے؟ ڈاکٹر تمہاری رکھی ہوئی چیزوں

کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔"

"جسٹ کنگ ڈاکٹر!" مارگو نے جواب دیا۔ پھر تیزی سے پلٹ کر ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

مارگو کے قرب میں کسی دوا کی بمبک تھی یا پھر اپنی بیوی برٹائس کی بے وفائی کے خیال نے اس قربت میں بد مزگی پیدا کر دی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک گہری سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ پھر اس نے دل کو سمجھایا کہ برٹائس ایسی نہیں ہے جیسا مارگو اسے پیش کر رہی ہے۔ نفسیات کی رو سے مارگو اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے برٹائس پر تہمت تراش رہا تھا۔ یہ عورتیں حسد سے مری جاتی ہیں۔ وہ مطمئن ہو کر عورتوں کی فطرت پر مسکراتے لگا۔ ڈاکٹر نیٹنگ اپنے کمرے میں مارگو کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ آخر میں اس نے میز پر رکھے ہوئے کیلنڈر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو۔ آج جتنے مریضوں سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ میں نے انہیں اطلاع دے دی ہے کہ مصروفیات کی وجہ سے انہیں اینڈ نہیں کر سکوں گا۔ یہ ایک مسٹر کیزرہ گئے ہیں۔ ان سے فون پر رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ اگر یہ آجائیں تو ان سے معذرت کر کے انہیں ویننگ روم سے ہی واپس کر دینا۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ میں مسٹر گیری کے ساتھ سرجری روم میں رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا اور گیری کی طرف جانے لگا۔ مارگو میز پر رکھے ہوئے کتابی کیلنڈر کو دیکھنے لگی۔

کیلنڈر کے طاق صفحے پر سات تاریخ تھی۔ سات نمبر خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ سات تاریخ گزر گئی تھی سات تاریخ کو وہ گیری کے ساتھ ایچائر میں گئی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر جام شیریں نوش کیا تھا۔ شاید یہ سات نمبر کا کرشمہ تھا کہ وہ دونوں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہے تھے۔

کیلنڈر کے جفت صفحے پر آٹھ تاریخ تھی۔ اس تاریخ میں جتنے مریضوں سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ ان کے ناموں پر خط تہنیک کھینچ دیا گیا تھا۔ آج گیری نے پھر اسے ایچائر میں مدعو کیا تھا لیکن مصروفیات کے باعث نہ تو گیری شام سے پہلے سرجری روم سے فارغ ہوا اور نہ ہی اسے چھٹی ملتی۔ مارگو نے مایوسی سے سوچا۔ "آج کی آٹھ تاریخ بڑی منحوس

ہے۔

”گیری نے سرجری روم میں آکر ڈاکٹر ٹینگ سے کہا۔

”مجھے اس کمرے میں آتے ہی وحشت سی ہوتی ہے۔ کیا آپ نے میری میڈیکل

ہسٹری شیٹ نہیں پڑھی ہے؟“

ڈاکٹر ٹینگ نے کہا۔ ”میں نے ان تمام ڈاکٹروں کی رپورٹ بھی پڑھی ہے۔ جن کے

زیر علاج تم رہ چکے ہو۔ دیکھو اس لئے میں نے کھڑکی کھلی رکھی ہے تاکہ تمہیں گھٹن کا

احساس نہ ہو۔“

گیری نے اوھر دیکھا۔ کشادہ کھڑکی کے دونوں پتے کھلے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے

سلنے ایک کرسی تھی۔ کرسی کے ایک سرے پر ایک ہینڈل تھا جسے گھمانے سے وہ کرسی

ایزی چیئر کی طرح کھل جاتی تھی۔ اسی پر مریض کو بٹھا کر اس کے دانتوں کا معائنہ کیا جاتا

تھا۔ گیری نے کہا۔

”یہ کرسی تین طرف سے جکڑ دی ہے۔ اس پر بیٹھتے ہی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی

حیرانگہ دیوچ رہا ہو۔“

ڈاکٹر نے مسکرا کر اس کے شانے کو ہتھ پھپھاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔ یہ کرسی تمہارے لئے عذاب بن جاتی ہے۔ اس کے باوجود تم

تسلیم کرو گے کہ یہاں آکر تم جب بھی بیٹھتے ہو۔ میں تمہیں منفی پہلو سے سوچنے کا موقع

ہی نہیں دیتا ہوں۔ تمہاری ہسٹری شیٹ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بار تمہیں کسی مکان

میں گھٹن کا احساس ہوا تھا تم وحشت زدہ ہو کر جنونی انداز میں دروازہ کھول کر نکل بھاگے

تھے اور باہر سڑک پر پہنچتے ہی ایک کار سے ٹکرا گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس حادثے

میں بچ گئے۔ یہاں پر کسی قسم کے حادثے کا اندیشہ نہیں ہے اگر اس دروازے سے نکل کر

بھاگو گے تو باہر ٹکرانے کے لئے تمہیں کوئی کار نہیں ملے گی۔ کیونکہ تم ساتویں منزل کی

بلندی پر ہو۔ لہذا حوصلہ رکھو اور یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔“

گیری طوعاً و کرہاً کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے ہینڈل گھما کر کرسی میں کشادگی پیدا

کردی اور اس سے کہا۔

”اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑکی پر رکھ دو اور آرام سے پھیل کر بیٹھو۔ قطعی

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ کھڑکی کے نچلے فریم کی اونچائی کرسی کی اونچائی کے برابر تھی۔ لہذا اسے کھڑکی پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھنے میں وقت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ دل و دماغ میں جو اضطراب چھپا ہوا تھا، وہ پریشان کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہارے احساسات کو سمجھ رہا ہوں۔ یہ لو، یہ دو کیپسول پانی کے ساتھ نگل جاؤ۔ میرا دعویٰ ہے کہ تمہیں فوراً اونچائی پریشانوں سے نجات مل جائے گی۔ یہ زود اثر دوا ہے۔“

وہ باتیں کرنے کے دوران داش بیمن کے پاس گیا اور وہاں سے پلاسٹک کے ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ گیری نے زور دے کر پوچھا۔ ”یہ کیسا کیپسول ہے؟“

”یہ مادرائی کیپسول ہے۔ یہ تمہیں تمہاری موج اور پریشانوں سے پرے لے جائے گا۔ تم مثلی انداز میں سوچنے کے بجائے ہمیشہ مثبت انداز میں سوچو گے۔“ وہ دونوں کیپسولز نگل کر پانی پینے لگا۔

اتنے میں مارگو وہاں آکر ڈاکٹر کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھی۔ جس پر سرجری کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ اس حینہ کی موجودگی ہی گیری کے لئے سکون کا باعث تھی۔ ڈاکٹر نے اسے منہ کھولنے کے لئے کہا۔ گیری کے منہ کھولتے ہی اس نے دانتوں کے درمیان ایک چھوٹے سے آلے سے رکاوٹ کھڑی کو دی۔ تاکہ اس کا منہ کھلا رہے۔ پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

گیری خاموشی سے مارگو کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کے چہرے کو تنگ رہا تھا۔ کبھی اس کے بلاؤز کے بٹن گن رہا تھا اور کبھی ان ہاتھوں کی نزاکت کو محسوس کر رہا تھا۔ جنہیں تمام کر وہ آج شام کو اسپائر کے کسی گوشے میں بیٹھنے والا تھا۔

اتنا کچھ دیکھنے اور سوچنے کے باوجود اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ اب تب میں اس پر کلشرفونیا کا مرض حاوی ہوتے والا ہے۔ کسی بھی لمحے وہ دشت زدہ ہو کر کرسی سے اٹھ جائے گا اور وہاں سے جنونی انداز میں نگل بھاگے گا۔

مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ توقع کے خلاف پرسکون تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، اس میں ایسا اطمینان اور ایسی بے پردائی تھی کہ اپنے دانتوں پر آلات اور ڈاکٹر کے ہاتھوں کا لمس بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس وہ مارگو کے ملائم

ہاتھوں کو اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر محسوس کر رہا تھا۔
 شام کو ایسا تر ہوٹل کے بار میں موسیٰ شمعیں روشن تھیں۔ گیری نچلے برآمدے میں بیٹھنے کا عادی تھا لیکن آج وہ بار کے اندر آ گیا تھا۔ دروازے بند تھے۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور وہ یہ دیکھ کر حیران تھا کہ اسے گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔
 اس نے بار کے گوشے میں ایک میز منتخب کی اور دیٹر کے آنے پر اپنے لئے ایک ڈبل اسکلج اور مارگو کے لئے شیری کا آرڈر دیا۔ مارگو بھی عین وقت پر پہنچ گئی۔ اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے احسان جنایا۔

”میں تمہاری خاطر تمام مصروفیتوں کو بالائے طاق رکھ کر آئی ہوں۔“
 ”میں خوش نصیب ہوں مارگو! کہ تم میرے لئے اپنی مصروفیتوں کو چھوڑ کر آئی ہو۔“
 ”آج یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم سیری خاطر اور کسی کو چھوڑ سکتی ہو یا نہیں؟“
 ”کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھی؟“
 دیٹر حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو دونوں نے اپنا اپنا جام اٹھا لیا۔ گیری نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر یہ شر چھوڑ دو۔ آؤ ہم دونوں یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔“
 ”یہ کیسے ممکن ہے؟ تم ہو، تمہاری بیوی ہے اور پھر ایک بیٹی ہے۔“

”میری بیٹی کو لن جو ان ہو گئی ہے۔ اسٹیو نامی ایک نوجوان سے محبت کر رہی ہے۔ اس نے اپنے مستقبل کا فیصلہ خود ہی کیا ہے۔ اب اس کی ذمہ داریاں مجھ پر نہیں ہیں؟“
 ”اور تمہاری بیوی؟“ مارگو نے پوچھا۔

”برنائس سے میری نہیں بنتی۔ وہ مشرق ہے۔ میں مغرب ہوں۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ تم اس کے متعلق نہیں، اپنے متعلق سوچو۔ بخدا مارگو میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ ہر عاشق یہی بات کہتا ہے مگر میں صدق دل سے کہہ رہا ہوں۔ تمہارے بغیر زندگی بے کیف ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ مارگو کا ہاتھ میز پر آکر اس سے مل گیا۔ وہ جذباتی لمبے میں ہوئی۔

”میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں تمہارے ساتھ جاسکتی ہوں لیکن ایک دشواری ہے۔“

”کیسی دشواری؟“

”میری ملازمت۔“

”ادنیٰ.....“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ بھی کوئی دشواری ہے۔ ملازمت چھوڑ دو۔ میں بھی اپنی ملازمت چھوڑ کر جاؤں گا۔ میرے پاس اتنی نقد رقم ہے کہ ہم تین سال تک بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ ہم یہاں سے انگلینڈ جائیں گے اور لندن میں ہمیشہ عیش و آرام کی زندگی گزاریں گے۔ وہاں مجھے کسی بھی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ملازمت مل جائے گی۔“

”یہ میں تسلیم کرتی ہوں لیکن..... وہ ڈاکٹر ٹینگ مجھے عیس چھوڑے گا۔“

”کیوں نہیں چھوڑے گا۔ کیا تم اس کی ملکیت ہو؟“

”نہیں۔ مگر وہ یہی سمجھتا ہے۔ تم اسے اچھی طرح نہیں جانتے۔ وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسے ہر حال میں حاصل کر لیتا ہے۔ دو سال پہلے میں ایک بوڑھے ڈاکٹر دلی براؤ کے پاس کام کرتی تھی۔ ڈاکٹر ٹینگ ایک روز کسی کام سے وہاں آیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ میں اس کے ہاں ملازمت کروں گی۔ اس نے ایک بھاری تنخواہ کی پیش کش کی۔ ڈاکٹر دلی براؤ کو پتہ چلا تو اس نے بھی میری تنخواہ بڑھا دی۔ پھر بھی ڈاکٹر ٹینگ نے مجھے حاصل کر لیا۔ جانتے ہو کیسے؟“

”کیسے.....؟“

”اس نے دو غنڈوں کو ڈاکٹر دلی براؤ کے پاس بھیجا تھا۔ ان غنڈوں نے اسے کہا کہ وہ میرے گھر سے آئے ہیں یعنی وہ دونوں میرے بزرگ ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ میں ڈاکٹر ٹینگ کے ہاں ملازمت کروں۔ اس وقت میں انکار کر سکتی تھی لیکن یہ سوچ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ٹینگ کی نظروں میں میری کتنی اہمیت ہے۔ وہ کتنی میرا پھیری سے مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ انسان دیہ جاتا ہے جہاں اس کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے میں اس کے پاس چلی آئی۔ اب تم اس سے بھی زیادہ میری قدر کر رہے ہو۔ میری خاطر یہ ملک چھوڑ کر انگلینڈ جانا چاہتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار نہیں کرتی لیکن میں ڈرتی ہوں کہ تم اچانک مجھے اس سے چھین کر لے جاؤ گے تو وہ تمہارا دشمن بن جائے

”گاہ“
 ”ادرنہ!“ گیری نے حقارت سے کہا۔ ”میں دشمنوں سے ٹھنٹا جانتا ہوں لیکن اصولاً میں ایک بار اس سے بات کروں گا۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو پھر ٹھیک ہے۔ ورنہ میں اس کو پردہ نہیں کرتا۔“
 ”کیا تم اس سے ابھی ملو گے؟“ مارگو نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں گھر جا کر فون پر اس سے بات کروں گا۔ جان من! رات کے سوا گیارہ بجے لندن کے لئے ایک فلائٹ ہے ہم اسی سے جائیں گے۔ تم ابھی جا کر سفر کی تیاری کرو۔ میں ساڑھے آٹھ بجے تمہیں لینے آؤں گا۔“

دو دونوں اٹھ کر کاؤنٹر پر آئے۔ گیری نے ٹریول ایجنسی کو وہاں سے فون کیا۔ جب جناز کی دو سیٹیں ان کے لئے مخصوص ہو گئیں تو اس نے مارگو کو رخصت کر دیا اور اپنی تیاریوں کے لئے گھر آ گیا۔ برنائس نے اسے دیکھ کر پوچھا۔
 ”کیا بات ہے“ آج کچھ پھرتیلے نظر آ رہے ہو؟“

”ہاں، زندگی ایک ایسے خوب صورت موڑ پر لے آئی ہے کہ آپ ہی آپ جوان ہو گیا ہوں۔“ پھر اس نے ہلنگ کے نیچے سے دو سوٹ کیس نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں ڈاکٹر نیٹنگ کا فون نمبر معلوم ہے؟“

”ہاں!“ برنائس نے کہا۔
 گیری نے چونک کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ ہلکچالی ہوئی بولی۔ ”کک..... کیا بات ہے؟“

اس نے رد کھے پن سے کہا۔ ”کچھ نہیں۔ مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تم نمبر ملاؤ۔“

وہ لمباڑی کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگا اور انہیں سوٹ کیس میں رکھنے لگا۔
 برنائس اسے کن آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔
 ”تم ہمیشہ ایک سوٹ کیس لے جاتے ہو۔ آج دو کیوں لے جا رہے ہو؟“

”میں کمپنی کی طرف سے نہیں جا رہا ہوں۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور یہ ملک بھی چھوڑ کر جا رہا ہوں اور تمہارے ساتھ جو ٹوٹا پھوٹا سا برائے نام رشتہ رہ گیا تھا

اسے حسی طور پر توڑ رہا ہوں۔“

وہ تھوڑی دیر تک گونگی بنی بیٹھی رہی۔ کتنے ہی سوالات اس کے دماغ میں تھے مگر اس نے صرف ایک سوال کیا۔

”کیا تم اکیلے جا رہے ہو؟“

”مارگو صبرے ساتھ جا رہی ہے۔“

برنائس نے ایک زرد دار ققمہ لگا کر کہہ۔

”وہ۔ ڈاکٹر نینگ کی مارگو۔ وہ موٹی بے ڈھنگی ملازمہ؟“

اس نے جواب دیا۔ ”وہ جیسی بھی ہے۔ تمہاری طرح پتھر کا بے حس مجسمہ نہیں ہے۔“

”پہلے تو تم مجھے بے حس نہیں کہتے تھے؟“

”اب ہو گئی ہو۔“

”نہیں۔ تم نے مجھے بنا دیا ہے۔“

کیرلی سوٹ کیس کے پاس سے پلٹ کر اسے گھورنے لگا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ جس عورت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہا ہے اس سے بحث کرنے کا کیا فائدہ۔ وہ آہستگی سے بولا۔ ”مجھے ڈاکٹر نینگ کا فون نمبر چاہئے۔“

وہ خاموشی سے میز کے پاس گئی۔ اس میں سے اپنی ڈائری نکال کر اس نے ایک کلنڈر پر فون نمبر نوٹ کیا اور اسے لاکر دیے ہوئے طنز کیا۔

”کیا تم نے مارگو کو نہیں بتایا کہ عورت تمہارے پاس آکر بے حس بن جاتی ہے؟“

اس نے فخر سے کہہ۔ ”ابھی وہ میرے پاس سے گئی تھی تو بے حس نہیں تھی۔ بہت مطمئن تھی۔ بہت خوش تھی۔“

”مجھے اس بے چاری سے ہمدردی ہے اور تم سے بھی۔ بڑھاپے میں بیوی کو تو چھوڑ رہے ہو۔ اپنی جوان بیٹی کو بھی چھوڑ کر جا رہے ہو۔“

”کوئن نے اپنے لئے راستہ بنا لیا ہے۔ میں لندن جا کر اسے خط لکھوں گا اور اس کی شادی ہونے تک اس کے اخراجات پورے کرتا رہوں گا۔“

وہ دونوں سوٹ کیسوں میں تمام ضروری سامان رکھنے کے بعد فون کے پاس آیا اور

ریسیور اٹھا کر ڈاکٹر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ہیلو! ڈاکٹر ٹیلنگ کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

”ہیلو ڈاکٹر! میں گیری سنفورڈ ہوں۔“

”اوہ اچھا۔ تمہارے دانت کیسے ہیں؟“

”دانتوں کی کوئی شکایت نہیں۔ میں نے یہ کہنے کے لئے فون کیا ہے کہ میں ابھی

لندن جا رہا ہوں۔“

”اچھا! یہ اچانک کیسے پردگرام بن گیا؟“

”یہ آپ کو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔ برٹاکس یہاں رہے گی۔ وہ یقیناً تم سے

ملاقات کرے گی اور تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔ فی الحال میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ میں

اپنے ساتھ مارگو کو لے جا رہا ہوں۔“

”میری مارگو کو؟“ اس کی حیرت زدہ سی آواز سنائی دی۔

”ہاں۔ وہ میرے ساتھ راضی خوشی جا رہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے

جانے پر تم پریشان ہو جاؤ گے لیکن مجھے امید ہے کہ تم اس کی جگہ کوئی دوسری اسسٹنٹ

رکھ لو گے۔“

”نہیں!“ اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ ”مارگو کی جگہ کوئی نہیں لے سکتی۔ تم اس

طرح اسے مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکتے۔“

”مجھے افسوس ہے۔ میں مجبوراً ایسا کر رہا ہوں۔ یہ دل کا معاملہ ہے۔“

”میں دل کے معاملات نہیں جانتا۔ میں دانتوں کا ڈاکٹر ہوں۔ دانت توڑنا جانتا

ہوں۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ مارگو کو نہ لے جاؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔“

”فضول دھمکی دے رہے ہو۔ ہم آج رات کی فلائٹ سے جا رہے ہیں اور کل صبح

لندن پہنچ جائیں گے۔ میں اخلافاً تمہیں اطلاع دے رہا ہوں۔ میری خوش اخلاقی کی قدر

کرو اور صبر کرنا سیکھ لو۔“

اس نے ایک جھٹکے سے ریسیور رکھ دیا۔ جوشیلے انداز میں باتیں کرنے کی وجہ سے

اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ برٹاکس طنزیہ انداز میں اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ گیری

نے کہا۔

”ڈاکٹر پاگل ہو گیا ہے۔“

”پاگل تم ہو گئے ہو۔ گیری اب بھی دقت ہے اپنا فیصلہ بدل دو۔ تم ڈاکٹر کو نہیں جانتے۔ وہ.....“

گیری نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ برٹائس کا الوداعی بوسہ لے گا لیکن اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ دونوں سوٹ کیس اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”گڈ بائی۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔“

”ضرور ملیں گے۔ میں اس یقین کے ساتھ تمہارے جانے کا تماشہ دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت جلد لوٹ کر آؤ گے۔ گڈ بائی۔“

وہ کوئی جواب دیئے بغیر تیزی سے چلا ہوا باہر آ گیا۔ کار میں سامان رکھ کر بیٹھنے کے بعد اس نے سوچا کہ وہ برٹائس سے بیزار ہو کر بہت جلدی گھر سے نکل آیا ہے۔ مارگو ایک نئی زندگی، ایک نئے سڑکی تیار یوں میں مصروف ہوگی۔ یہ سوچ کر اس نے کار اشارت کی اور ایک بار میں دقت گزارنے کے لئے چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ باز سے نکل کر مارگو کے ہاں پہنچا۔ فحلی منزل کے ایک عرصے میں وہ کرایہ دار کے طور پر رہتی تھی۔ گیری اس کے کمرے میں آیا تو وہ دروازے کی جانب پشت کئے صوفے پر بیٹھی تھی، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا رکھا تھا اور اس کا بدن ہولے ہولے یوں لرز رہا تھا جیسے وہ سسک رہی ہو۔ رد رہی ہو۔ گیری نے تیری سے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے مارگو؟“

اس کی آواز پر وہ چونک کر اٹھی اور اسے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر اس سے پٹ گئی۔

”وہ آیا تھا!“

وہ سہمی ہوئی تھی، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیجا ہوا تھا۔ گیری نے اس کے گالوں کے پھٹے ہوئے گریبان کو دیکھ کر پوچھا۔

”کون؟“

”ڈاکٹر۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تم سے لون پر بات ہو چکی ہے، وہ..... وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔“

”کیا اسی نے تمہارے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہے؟“

”ہاں۔ مگر اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

”میں اے جان سے مار ڈالوں مگر۔“ وہ غصے سے کانپنے لگا۔

”نہیں گیری! جانے دو۔ اب تو وہ جاچکا ہے۔“

”وہ کہاں بچ کر بائے گا؟ اس کا ہاتھ تمہارے گریبان تک پہنچ گیا ہے۔ میں اسے

زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ غصہ سے پلٹ کر جانے لگا۔ مارگو نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔ ”بات نہ بڑھاؤ

گیری۔ یہ دانش مندی نہیں ہے۔ اگر تم اس کے پیچھے جاؤ گے تو پھر جہاز کا وقت نکل

جائے گا۔“

جب وہ ایئر پورٹ پہنچے تو جہاز کسی وجہ سے لیٹ ہو گیا تھا۔ ایئر لائن کاؤنٹر پر اپنا

سلمان چیک کرانے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھ گئے اور اپنی پسند کے مطابق اسکاچ اور شیری

پینے لگے۔ گیری نے پوچھا۔ ”تم ڈاکٹر سے قائف تو نہیں ہو؟“

مارگو دد کہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا تھا۔ شیری کا جام اس

کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ..... وہ یہاں بھی آ گیا

ہے۔“

گیری چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مارگو نے ہاتھ کے اشارے سے ایک جانب

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ..... ادھر کھڑا ہوا تھا۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی تیزی سے گھوم کر چلا گیا۔“

”مہ!“ وہ غرا کر بولا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ تم یہاں

بٹھو، میں اس سے نسٹ کر آتا ہوں۔“

”نہیں۔“ مارگو نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اس سے دد رہی رہنا بہتر ہے۔

بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ پھر ہم اس کی پہنچ سے دد چلے جائیں گے۔“

اس نے معقول بات کہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس ملک سے دد جانے والے

تھے۔ گیری نے یہی سوچا کہ صبر ضبط سے کام لینا چاہئے۔ دشمن اپنی ناکای پر جھنجھلا رہا ہو

تو اسے اہمیت نہ دے مگر ادھر زیادہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرنا چاہئے۔

اس نے مسکرا کر اپنا جام اٹھا لیا اور دوسرا ہاتھ مارگو کی کمر پر رکھ کر اسے اپنی طرف
یوں کھینچ لیا۔ جیسے اسے اپنے قریب لا کر دشمن سے اور زیادہ دور لے جا رہا ہو۔

☆-----☆-----☆

سروی شباب پر تھی لیکن مارگو کی قربت میں ایسی حرارت تھی کہ گیری کو پسینہ آجاتا تھا۔ لندن میں وہ ایک ہفتہ کیسے گزر گیا۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ وہ اس دوران مارگو سے صرف دو گھنٹے کے لئے دور رہا تھا۔ اوکلیز ایڈورٹائزنگ کے دفتر میں جا کر اس نے ملازمت کی درخواست دی تھی اس کے بعد پھر مارگو کی ہانوں میں آکر قید ہو گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ دونوں لحاف میں دبکے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی ہانوں میں پیار بھری سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چلی منزل میں آٹو ریئرنگ کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ جہاں ہر روز سات گھنٹے تک انجن شور مچاتے رہتے تھے اور لوگوں کے باقیں کرنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

”آج مجھے ملازمت مل جائے گی۔ پھر میں کسی پڑ سکون علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کر لوں گا۔“ گیری نے کہا۔

مارگو نے پوچھا۔ ”کیا ملازمت مجھ سے زیادہ اہم ہے؟ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تمہارے پاس تو اتنی رقم ہے کہ ہم تین سال تک بے فکری سے زندگی گزار سکتے ہیں؟“

”اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم بچت نہ کریں۔ صرف خرچ ہی کرتے رہیں۔ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ ہونا چاہئے۔ اس لئے میں ملازمت کر رہا ہوں۔“

”اچھا تو تم ابھی باؤ گے؟“

”ہاں۔ جانا بہت ضروری ہے۔ صرف محبت سے پیٹ نہیں بھرے گا۔“

”پھر کہاں ملاقات ہوگی؟“

”نیشنل پورٹریٹ گیلری میں۔ رابرٹ لوئس اسٹیونسن کی تصویر کے سامنے ٹھیک

ڈھالی بجے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں بھی ٹھیک ڈھائی بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔“

وہ لحاف سے نکل کر غسل خانے میں چلا گیا۔ غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے کے دوران وہ سوچتا رہا کہ لندن میں اخراجات زیادہ ہیں۔ اسی مناسبت سے اسے زیادہ تنخواہ کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ پھر ایک خیال آیا کہ یہ نئی جگہ ہے۔ تنخواہ خواہ کتنی ہی ہو اسے فی الحال آمدنی کا ایک ذریعہ بنا لینا چاہئے مارگو بہت فضول خرچ ہے۔ محبوبہ جوالناہ اور ول و جان سے چاہتی ہو تو فضول خرچی سے اس کا ہاتھ روکا نہیں جاتا۔ اس کی رنگین اداؤں کے ساتھ اس سنگین ادا کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اد کلیئر ایڈورڈ نازنگ کے دفتر میں پہنچا تو کمپنی کے ڈائریکٹر نے بڑی بے رخی سے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ گیری کا ماتھا ٹھنکا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ پچھلے بار ڈائریکٹر نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا تھا۔

”مسٹر گیری!“ اس نے کہا۔ ”آپ پہلے مونٹریال میں ملازمت کرتے تھے لیکن آپ اپنی کمپنی کو اطلاع دیئے بغیر یہاں آ گئے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”گیری نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ اطلاع آپ کو کیسے ملی؟“

”ٹیلیفون ناچی ایک شخص نے اطلاع دی ہے۔“

میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔“ گیری نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ کسی نے فون پر آپ سے شرارت کی ہو۔ کچھ لوگ وقت گزاری کے لئے اس طرح فون پر جھوٹی سچی باتیں کرتے رہتے ہیں۔“

ڈائریکٹر نے کہا۔ ”اس نے فون پر اطلاع نہیں دی۔ وہ یہاں میرے سامنے آیا تھا۔ ہمارا ابھی آپ بیٹھے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر اس نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنی ملازمت اپنا گھر اور اپنی بیوی کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ بیوی اور گھر کو چھوڑنا آپ کا ذاتی معاملہ ہے لیکن ایک۔ کمپنی کے اعتماد کو دھوکا دینے کے بعد آپ یہ کیسے سوچتے ہیں کہ دوسری کمپنی دالے آپ پر بھروسہ کریں گے؟“

گیری غصہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اس شخص پر بھی غصہ آ رہا تھا جس نے اس کے خلاف صحیح رپورٹ دی تھی۔ اس نے کہا۔

”میں اعتماد کھو کر ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ آپ برائے مہربانی مجھے ٹیلیفون کا حلیہ

بتائے۔ میں جانتا چاہتا ہوں کہ آخر وہ ہے کون؟“
ڈائریکٹر اس کا حلیہ بتانے لگا۔

اس نے اتنا مکمل خاکہ پیش کیا کہ ڈاکٹر ٹینگ لگاہوں کے سامنے آگیا۔ گہری کے
دانتوں میں اچانک درد شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ دانت توڑنا جانتا ہے۔
اس نے ایسے دانت کو نکال کر پھینکا تھا کہ اب گہری کسی بھی کمپنی میں اپنا اعتماد بحال نہیں
کر سکتا تھا۔

وہ جھٹا کر وہاں سے چلا آیا۔ پریڈ اسٹریٹ سے گزرتے وقت وہ ایک ہوٹل میں داخل
ہو گیا اور وہاں بیٹھ کر شراب پینے لگا۔ یہ خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔ کہ ڈاکٹر تین ہزار
جل سے اس کا پیچھا کرتا آیا ہے اور یہاں آکر اس کے راستے میں کانٹے بچھا رہا ہے۔

”کیا یہ بات ابھی مارگو کو بتانا مناسب ہے؟“ وہ سوچنے لگا۔ نہیں۔ اسے نہیں بتانا
چاہئے۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائے گی۔ میں اس کم بخت ٹینگ کو تلاش کروں گا اور
اسے نرمی سے یا گرمی سے سمجھاؤں گا کہ وہ ہمارے راستے سے ہٹ جائے، لیکن نہیں
وہ دشمن اتنی آسانی سے نہیں ہانتا۔ وہ بہت ضدی ہے اور چالاک بھی ہے۔ آہ! میرے اس
دانت میں کتنی تکلیف ہے۔ جس میں اس نے دوا لگائی تھی۔ کیس ایسا تو نہیں ہے کہ اس
نے دوا کے بجائے زہر لگا دیا ہو، ایسا زہر جو آہستہ آہستہ اثر کرتا ہے۔“

وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھا چپا رہا اور سوچتا رہا پھر شراب کا مل ادا کر کے باہر آگیا۔
کھلی فضا میں آکر اس نے سوچا کہ وہ فضول اندیشہ کر رہا ہے۔ اس کے دانت میں کوئی
زہریلی دوا نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو وہ جہاں کے کسی ڈاکٹر سے معائنہ کرائے گا۔ فی الحال
اسے مارگو سے جا کر ملنا ہے۔

مبہدہ نیشنل پورٹریٹ گیلری کی عمارت میں پہنچا تو وہ پندرہ منٹ لیٹ ہو گیا تھا۔
صدر دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ اندر جانے والوں کی تلاشی لے رہے تھے تاکہ کوئی
ہم یا کوئی تخریبی سامان عمارت کے اندر نہ لے جاسکے۔ وہ تلاشی دینے کے بعد اتر کر
میں آگیا جہاں رابرٹ لوئس اسٹیونسن کی تصویر آویزاں تھی۔ اس کمرے میں چند نیا لوگ
تھے اور وہ بھی واپس جا رہے تھے۔ مارگو شاید انتظار سے اکتا کر دوسری طابق چلی گئی تھی۔
اس نے پلٹ کر دوسرے کمرے کی جانب دیکھا تو وہاں دروازے پر ڈاکٹر ٹینگ کھڑا ہوا

تھا۔

وہ مسکرا کر آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”ایک بار تم نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اطلاع دی تھی کہ تم مجھ سے مارگو کو چھین کر لے جا رہے ہو۔ میں بھی اخلاقاً اطلاع دینے آیا ہوں کہ اب مارگو میرے ساتھ جا رہی ہے۔“

”جو اس مت کرو۔“ گیری نے کہا۔ ”مارگو تمہارے ساتھ کبھی نہیں جائے گی۔“
ڈاکٹر نے ہنارت سے کہا۔ ”تم خوش فہمی میں مبتلا ہو لیکن حقیقت یہی ہے۔ وہ اس وقت سفر کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ہم دونوں ایک گھنٹے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔“
”میں اسے نہیں جانے دوں گا۔“

”تم اسے نہیں روک سکتے گیری! اگر روکنے کی کوشش کرو گے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔“

گیری نے جھلا کر چھلانگ لگائی۔ بھاری بھر کم ٹینگ نے اسے دونوں ہاتھوں سے روک لیا اور اسے رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ گیری کا سر دیوار سے ٹکرایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ ٹینگ اس کا گلا دربوچ رہا تھا اور وہ پھنسی پھنسی تا آواز میں کہہ رہا تھا۔

”میں..... میں تم سے کمزور..... نہیں ہوں۔ تم نے میرے ہاتھوں میں کوئی زہریلی دوا لگائی ہے۔ تمہاری اس دوا نے مجھے کمزور کر دیا ہے۔ میں ابھی جا کر تھانے میں رپورٹ کروں گا تم نے مجھے زہر دیا ہے۔“

”جاء“
”مت کرو۔ گیری“ تم زندہ ہی کب ہو کہ میں تمہیں زہر دوں گا۔ تم تو ایک چلتی پھرتی لاش ہو۔ چلو اب ایک لاش کی طرح زمین پر گر پڑو۔“

یہ کہہ کر اس نے گیری کو چھوڑ دیا۔ گیری نے دیوار کا سارا لے کر کھڑے رہنے کی کوشش کی، لیکن اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا اور اسے اپنی سانسیں رن ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھ کھولی تو کچھ لوگ نظر آئے جو اسے بے ہوش سمجھ کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر

دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر ٹینگ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا عمارت کے باہر آگیا اور ایک ٹیکسی والے کو اپنا پتہ بتا کر پچھلی سیٹ پر نقاہت سے گر پڑا۔ چند رہ منٹ کے بعد آٹو ریگزنگ ورکشاپ کے سامنے ٹیکسی آکر رک گئی۔ گیری نے ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لئے کہا اور زینے لے کر تار ہوا پہلی منزل پر پہنچ گیا جہاں اس کی رہائش تھی۔ مارگو ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک سوٹ کہیں رکھا ہوا تھا۔ اس کے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کہیں جانے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ گیری نے اس کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

”ہم۔ تو ٹینگ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم اس کے ساتھ جاری ہو۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”تمہارے جانے کے بعد وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے جبراً مجھ سے پوچھا کہ میں تم سے ملنے کہاں جا رہی ہوں۔ بہت مجبور ہو کر مجھے بتانا پڑا کہ میں ڈھائی بجے تم سے میٹل پورٹریٹ گیلری میں ملوں گی۔“

گیری نے سوٹ کہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا وہ تمہیں جبراً یہاں سے لے جا رہا ہے؟ کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری حفاظت کر سکوں گا۔“

”گیری! یقین کی بات نہ کرو۔ میں تمہاری بھلائی کے لئے اس کے ساتھ جانے پر مجبور ہوں۔“

”تمہارے جانے سے میری بھلائی نہیں ہوگی، میری توہین ہوگی۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“

”تم سمجھنے کی کوشش کرو گیری! وہ تمہیں ہر قدم پر نقصان پہنچائے گا۔“

”وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہاں گلیوں میں سپاہی گشت کرتے رہتے ہیں۔ مزید خطرہ محسوس ہوا تو ہم ۹۹۹ نمبر ڈائل کر کے فوری طور پر پولیس کو کال کر سکتے ہیں۔ تم خواہ مخواہ خوف زدہ ہو گئی ہو۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“

ای وقت گلی میں کسی کار کے آنے اور رکنے کی آواز سنائی دی۔

”وہ آگیا!“ مارگو نے کہا۔

”نہیں۔ یقین شاید ٹیکسی ہے۔ ڈرائیور اسے مناسب جگہ پارک کر رہا ہے۔ میں نے اسے انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم یہاں موجود ہو یا ٹینگ

تم اسے نہ مارو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ اسے چھوڑ دو.....“

ڈاکٹر ٹینگ نے گیری کو حقارت سے دیکھا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے مارگو کی کلائی تھام لی۔ دوسرے ہاتھ سے سوٹ کیس کو اٹھایا اور مارگو کو کھینچتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ گیری فرش پر پڑا مہری سانس لے رہا تھا۔ جس حسینہ کے لئے وہ اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ دشمن اس کو چھین کر لے جا رہا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر جانے لگا اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ ٹینگ کی مکے بازی نے اس کے جڑے ہلا دیئے تھے اور پسلیاں بھی دکھ رہی تھیں۔

وہ زینے سے اتر کر ٹیکسی کے پاس آیا اور پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولا۔
”ابھی جو کار یہاں سے گئی ہے۔ اس کا پیچھا کرو۔ میں تمہیں میٹر سے زیادہ پیسے دوں گا۔“

ٹیکسی چل پڑی۔ گلی سے نکل کر مین روڈ پر آتے ہی ڈرائیور نے کہا۔ ”وہ نیلے رنگ کی سیڈان میں جا رہے ہیں‘ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ مگر وہ کافی فاصلے پر ہے۔“
گیری کے دانتوں میں درد ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے جڑوں کو تھام کر دندہ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ بہت دور نیلے رنگ کی کار تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ ٹیکسی کی رفتار بھی تیز تھی مگر ان کے درمیان بہت سی دوڑتی ہوئی کاریں ساکل ہو گئی تھیں‘ پھر ٹینگ کی کار نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔ گیری نے ڈرائیور سے کہا۔
”وہ نیلی کار ڈوڈر جا کر رکے گی۔ تم اس راستے پر چلو۔“

یہ کہہ کر وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنے دائیں جڑے کو سہلانے لگا۔ اس کے دل میں یہ اندیشہ مستحکم ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس حصے کے کسی دانت میں زہریلی دوا لگائی ہے۔ دانش سندی تو یہ ہوتی کہ وہ اس اندیشے کو دور کرنے کے لئے فوراً ہی کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا لیکن عشق نے بہت مار دی تھی۔ وہ اپنی جان سے زیادہ مارگو کو حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد نیلی کار نظر آگئی۔ وہ ایک آئس کریم ٹرک کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ مارگو اور ٹینگ کار سے نکل کر آئس کریم کھا رہے تھے۔ ٹیکسی ان کے قریب باکر رک گئی۔ مارگو اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ٹینگ نے ناگواری سے پوچھا۔

”تم ہمارا پیچھا نہیں چھوڑو گے؟“

گیری نے خلاف توقع مسکرا کر کہا۔ ”بچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ میں دوستانہ ماحول میں باتیں کرنے آیا ہوں۔ کیا تم تنہائی میں مجھ سے باتیں کرنا پسند کرو گے؟“

”کیوں نہیں گیری! میں نے شروع ہی سے یہ کوشش کی ہے کہ ہمارے تعلقات میں کشیدگی پیدا نہ ہو۔ مگر اب تمہیں عقل آئی ہے۔ آؤ ہم ادھر چلتے ہیں۔“

وہ دونوں سڑک سے دور آکر ایک ڈھلوان سے اترنے لگے۔ گیری نے کہا۔ ”ہمارے ساتھ رہو۔ میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے گی۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔“

”نہیں گیری! اپنے متعلق ایسا نہ سوچو۔“

”اب تک میں ایسا نہیں سوچ رہا تھا۔ جب سے تمہارے ویسے ہوئے ماورائی کیپول کھائے ہیں۔ اس وقت سے مثبت انداز میں سوچتا رہا ہوں کہ میں کلشروفو یا مریض نہیں ہوں اور نہ ہی بوڑھا ہوں۔ خود کو جوان سمجھ کر ایک جوان لڑکی کو بھگا لیا۔ مجھے افسوس ہے۔“

وہ نشیب میں آکر اپنے اطراف پھیلی ہوئی اونچی مچی پستانوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔

”افسوس نہ کرو۔“ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر اچانک ہنستے ہوئے بولا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم وہ کیپول کھانے کے بعد میری اسسٹنٹ کو لے اڑو گے تو میں تمہارے علاج کے لئے وہ کیپول کبھی تجویز نہ کرتا۔“

وہ باتوں کی دھن میں دو قدم آگے نکل گیا تھا۔ جب دوستانہ ماحول میں باتیں ہو رہی ہوں تو آگے پیچھے کا وہیمان نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں کمزور دشمن بھی حاوی ہو جاتا ہے۔ گیری نے اچانک ہی ایک بھاری سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ ٹینگ نے ایک چیخ ماری اور لڑکھڑا کر اس کی طرف پلٹ گیا لیکن حملہ اتنا زور دار تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔ اس کا مریجو مان ہو گیا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ ایسے رک رک کر سانس لے رہا تھا جیسے آخری ہچکیاں لے رہا ہو۔

گیری پتھر کو ایک طرف پھینک کر واپس بھاگنے لگا آتے وقت راستہ آسان تھا۔

جاتے وقت اسے چڑھائی پر دوڑنا پڑ رہا تھا۔ وہ کسی طرح ہانپتے کھانپتے اوپر آیا۔ پھر ڈارک میڈ جب اس کی سانسیں اعتدال پر آئیں تو وہ بڑے پرسکون انداز سے چلا ہوا ٹیکسی کے پاس آیا۔ اس نے ڈرائیو کو ٹیکسی کا کرایہ اور اس کا انعام دے کر رخصت کر دیا اور نیلی کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مارگو سے بولا۔ ”آؤ بیٹھو!“

”ڈاکٹر کہاں ہے؟“ مارگو نے پوچھا۔
”تم بیٹھو میں بتا رہا ہوں۔“

وہ بیٹھ گئی۔ اس نے کار انسارٹ کی اور تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔“
”کیا مطلب؟“ وہ گھبرا کر بولی۔ ”کیا..... کیا تم نے اسے مار ڈالا ہے؟“
اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پتہ نہیں وہ مردہ ہے یا زندہ۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ اب وہ ہمارا پیچھا کرنے کے قابل نہیں ہے۔“

”نہیں!“ وہ چیخ کر بولی۔ ”تم نے اسے قتل کیا ہے۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔ گاڑی روکو.....“

”تم پاگلوں کی طرح کیوں چیخ رہی ہو۔ خاموش بیٹھی رہو۔ ہمیں جلد از جلد اس ملک سے نکل جانا ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں محبت میں اندھی ہو کر ایک قاتل کا ساتھ نہیں دوں گی۔ گاڑی روکو.....“

وہ اسٹیرنگ کو پکڑ کر جھٹکے دینے لگی۔ تیز رفتاری سے بھاگنے والی کار قابو سے باہر ہو گئی۔ گیری نے نورا ہی بریک لگایا۔ کار کے رکتے ہی مارگو دروازہ کھول کر بھاگنے لگی۔

”مارگو! رک جاؤ۔ وہ کار سے گھل کر اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔“

مارگو ایک پہاڑی کی بلندی کی طرف جارہی تھی، جہاں سے وہ گزر رہی تھی وہاں چھوٹی بڑی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ دوز بلندی پر ایک پرانا چرچ تھا جو نیچے راستے سے ایک کھنڈر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ گیری اسے آوازیں دیتا ہوا اوپر کی طرف جا رہا تھا۔
”مارگو! پاگل نہ بنو۔ تم کہاں جا رہی ہو؟“

”میں قانون کا ساتھ دینے جا رہی ہوں۔ کہیں سے پولیس کو فون کروں گی۔ تم بہتر ٹینگ تھا۔ اس نے میرے کہنے پر تمہیں قتل نہیں کیا تھا۔“

”بکو اس مت کرو۔ واپس آ جاؤ۔“

وہ تیزی سے دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ مارگو ایک ابھری ہوئی چٹان پر چڑھ رہی تھی۔ گیری نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی۔

”رک جاؤ۔ تم مجھ سے دشمنی کر رہی ہو۔“

”نہیں۔ میں ایک قاتل کو قانون کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے خود اپنے چھڑوے کی کوشش کی۔ گیری نے ایک جھٹکے سے اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ ایک بیک وہ چٹان پر چڑھنے سے روک گیا۔ گیری تھرا گیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی مختلف چٹانوں سے ٹکراتا ہوئی نیچے جا رہی تھی۔ وہ بھی تھیب کی طرف دوڑنے لگا۔

نیچے سڑک پر کار سے ذرا دور خون میں لتھڑی ہوئی مارگو بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس نے قریب پہنچ کر اسے آواز دی۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دل کی دھڑکنیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھیں۔

وہ گھبرا کر وہاں سے بھاگا۔ کار میں بیٹھ کر اسے اشارت کیا اور واپس موڑ کر لندن کی طرف جانے لگا۔

کار کی رفتار تیز تھی۔ اس کا ذہن بھی تیزی سے موج رہا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہئے؟ کہاں جانا چاہئے؟ اس اجنبی دیس میں کوئی اسے پناہ دینے والا نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر زندہ ہے یا مرچکا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو سرور اس سے انتقام لے گا۔ اگر مرچکا ہے تو پولیس خاموش نہیں بیٹھے گی۔ اس کا پیچھا کرے گی۔ اب بھلائی ہی میں تھی کہ وہ جلد از جلد اس ملک سے باہر نکل جائے۔

پھر ایسے نازک وقت پر اسے اپنی بیوی برٹانس کی یاد آئی۔ یاد آئی تو احساس ہوا کہ وہ بے چاری کتنی مظلوم ہے۔ وہ برسوں کا ساتھ چھوڑ آیا تھا۔ اس عورت نے آف بیٹنکس کی تھی۔ بیوی پھر بیوی ہوتی ہے۔ وہی اس مازک موقع پر اس کا ساتھ دے سکتی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں میں چھپا سکتی تھی۔

لندن پہنچتے ہی اس نے ٹینگ کی کار ایک جگہ چھوڑ دی۔ پھر وہ تیزی سے پیدل چلے

رنگ۔ بہت دور جا کر وہ ایک ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس بوتھ میں اسے صرف برٹانکس کا نام اور فون نمبر یاد تھا۔ باقی وہ تمام دنیا کو بھول چکا تھا۔

”ہیلو!“ سمندر پار سے برٹانکس کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو برٹانکس! میں گیری ہوں۔“

”تم کہاں ہو؟“

”میں اب مک انگلینڈ میں ہوں۔ یہاں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔“

”تم خواہ مخواہ مصیبت مول لے رہے ہو۔ یہاں چلے آؤ۔“

”ادہ برٹانکس! کیا تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گی؟“

”کبھی نہیں۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اس کے باوجود ایک دوسرے

کی مصیبتوں میں کام آتا ہمارا فرض ہے۔ یاد ہے، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اس یقین

کے ساتھ تمہارے جانے کا تمنا نہ دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت جلد لوٹ آؤ گے۔ لوٹ آؤ

گیری۔“

آنے سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دیتا چاہتا ہوں کہ مجھ سے قتل ہو گیا ہے۔ پولیس

کسی دقت بھی مجھے گرفتار کر سکتی ہے۔“

”ادہ! یہ تم نے کیا کیا گیری؟ سر حال جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ فوراً یہاں

چلے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں، گھبراؤ نہیں، میں ہر ممکن طریقے سے تمہاری

حفاظت کروں گی۔“

”شکریہ برٹانکس! تم نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے۔ میں یہاں کی پہلی فلائٹ سے آ رہا

ہوں۔“

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بوتھ کے باہر آ کر اس نے ایک ٹیکسی لی اور اس میں بیٹھ کر

اپنی رہائش گاہ کی طرف جانے لگا۔ پر دگرہم یہی تھا کہ وہاں سے سلمان سمیٹ کر پہلی

فلائٹ میں سیٹ حاصل کر لے گا اور اپنی بیوی کی آغوش تک پہنچ جائے گا۔

گیری بخت پر اپنے ملک واپس آگیا۔ برنائس اسے لینے ایئر پورٹ آئی تھی۔ ایک محبت کرنے والی ہستی کو دیکھ کر وہ بچہ بن گیا اور اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ برنائس بڑا محبت سے اسے تسلیاں دینے لگی۔

”گھبراؤ نہیں۔ حوصلہ رکھو۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہاری حفاظت کروں گی۔ تم پر آج بھی نہیں آنے دوں گی.....“

وہ تسلیاں دیتی ہوئی اس کے ساتھ کار میں آکر بیٹھ گئی اور خود ہی ڈرائیو کرنے لگی۔ گیری ذہنی مریض بن کر رہ گیا تھا۔ وہ بار بار سیٹ پر پہلو بدل رہا تھا۔ کسی مجذوب کی طرح بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ وہ لندن کے تمام واقعات بتا رہا تھا لیکن بدحواسی اور گھبراہٹ کی وجہ سے آگے کے واقعات پیچھے اور پیچھے کے واقعات آگے بیان کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو میں ربط نہیں تھا۔ تمام باتیں گڈمڈم ہوتی جا رہی تھیں۔

برنائس نے گھر پہنچ کر کہا۔ ”تم بہت پریشان ہو۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔ کچھ دیر آرام سے بستر پر خاموش ہو کر لیٹے رہو اگر نیند آجائے تو اچھا ہے۔ جب تک سوتے رہو گے سوچ اور فکر سے آزاد رہو گے۔“

وہ جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ برنائس نے اس کے جوتے کھول کر نیچے رکھے۔ اس پر ایک چادر ڈالی، سرہانے تکیے کو درست کیا اور کھڑکیوں پر پردے پھیلائے لگی تاکہ کمرے میں زیادہ روشنی نہ رہے۔ گیری نے ایک بار اسے محبت اور احسان مندی سے دیکھا۔ پھر اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔

اسے گہری نیند آگئی تھی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک سوتا رہا۔ پھر اس کو ایک دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ آواز دور تھی۔ شاید دوسرے کمرے سے آرہی تھی۔

وہ آواز۔ وہ آواز۔.....

گیری کی آنکھیں بند تھیں مگر اس نے آواز پہچان لی۔ وہ آواز ڈاکٹر یٹنگ کی تھی۔ وہ فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔
”تم گھبراتے کیوں ہو؟ تم اطمینان رکھو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ گیری بالکل بے بس ہے۔.....“

گیری کے جسم میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ڈاکٹر یٹنگ کہاں سے آگیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بری طرح زخمی ہونے کے باوجود وہ اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک اس کے مکان میں آگیا ہو؟ ممکن تو نہیں ہے مگر اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”برنائس میری جان؟ تم آرام سے اپنے گھر میں بیٹھی رہو۔ میں گیری سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنے کے بعد تمہیں فون کروں گا۔.....“

ریسیور رکھنے کی آواز سنائی دی۔ گیری آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بہت تیز روشنی تھی۔ اس نے ”بمشل تمام آنکھیں کھولیں تو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ برنائس نے کھڑکیوں پر پردے پھیلا دیئے تھے مگر سامنے دلی کھڑکی پر پردہ نہیں تھا اور وہ اپنے بستر پر بھی نہیں تھا۔

وہ کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کھڑکی پر رکھی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے نیچے فریم کی اونچائی، کرسی کی اونچائی کے برابر تھی۔ اس لئے وہ آرام سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔

دو ہفتے ڈاکٹر یٹنگ کے سرجری روم میں تھا۔ وہی کشادہ کھڑکی تھی، وہی چمڑے سے منڈھی ہوئی کرسی تھی، جس پر بیٹھنے کے بعد اس نے دو عدد ماورائی کیسپول پانی کے ساتھ نگل لئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ وقت سے بہت آگے بھاگ گیا تھا یا وقت اسے ماضی کی طرف کھینچ لایا تھا اسی وقت اپنے شانے کے قریب اسے یٹنگ کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو گیری!“ اس کے مضبوط ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا۔ یک ایک اسے گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اس کی سانسیں رکتے لگیں۔ حالانکہ ڈاکٹر اس کا گلا نہیں دبوچ رہا تھا۔ پھر بھی اسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اسے چاروں طرف سے جکڑ دیا گیا ہے۔ کیسپول کا

اثر ختم ہو چکا تھا۔ کلسر دوفیا کا مرض حاوی ہو رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کی گرفت سے خود کو چھڑا بھاگنے کے لئے اسے نوچ کھسوت رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

”ڈاکٹروں کی یہ عادت ہے۔ وہ ہر مریض کو یہی تسلی دیتے ہیں کہ ذرا سی تکلیف ہوگی پھر آرام آجائے گا۔ میں تم سے بھی یہی کہتا ہوں کہ کھڑکی کے باہر ذرا سی تکلیف ہوگی۔ پھر تمہیں ہیٹھ کے لئے آرام آجائے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے گیری کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر کھڑکی سے باہر کھینچ دیں۔ ایک چڑ سے اس کا جسم کرسی سے سرکنا ہوا کھڑکی کے فریم سے گزرتا ہوا ساتویں منزل کی بلندی سے زمین کی پستی پر پہنچ گیا۔

☆-----☆-----☆

پولیس انسپکٹر کے سامنے گیری کی میڈیکل ہسٹری شیٹ اور دوسرے ڈاکٹروں کی رپورٹ رکھی ہوئی تھیں اور برائٹس بھی رو رو کرتا رہی تھی کہ گیری پر بعض اوقات کس طرح جنون موار ہو جاتا تھا اور وہ دروازے سے نکل کر یا کسی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر کھلی فضا میں چلا جاتا ہے۔ تمام شواہد کے پیش نظر پولیس کو یقین ہو گیا کہ گیری اپنی موت کا خود ہی ذمہ دار ہے۔

ڈاکٹر ٹینگ بڑی خوبصورت اداکاری کر رہا تھا۔ وہ ادھر سے ادھر بے چینی سے ٹل رہا تھا اور خود کو الزام دے رہا تھا۔

”آہ۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میں گیری کو سرجری روم میں ذرا سی دیر کے لئے اکیلا چھوڑ کر اس کمرے میں آ گیا تھا۔ آہ! ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا؟“ انسپکٹر نے کہا۔ ”ڈاکٹر تم نے اسے کیسپول کھلا کر پرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔ تم نے پوری طرح اپنا فرض ادا کیا ہے مگر تمہاری احتیاطی تدبیر بھی اسے نہ بچا سکی۔“ برائٹس نے بھی تائید کی۔ ”ہاں ڈاکٹر! تم خود کو الزام نہ دو۔ میرے خادمہ کے جنرل اور پائل پن نے اسے مارا ہے۔“

انسپکٹر ان سے رخصت ہو گیا۔ برائٹس اور ڈاکٹر اسے لفٹ تک چھوڑنے گئے تھے۔ اس کے جانے ہی برائٹس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”تم نے کمال کر دیا ٹینک! ایسی مکمل پلاننگ کی ہے کہ سارا الزام مرنے والے پر

ماند ہو گیا۔“

ٹینک نے مسکرا کر کہا۔ ”عورت کی خاطر بڑی بڑی جنگیں لڑی گئی ہیں۔ ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ میں نے تو ایک چھوٹا سا جرم کیا ہے۔ تم یہاں ٹھہرو میں تمہیں نیچے تک چھوڑنے جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر وہ چیمبر میں واپس آ گیا۔

سرجری روم میں مارگو کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور خالی کرسی کو تنک رہی تھی۔ ٹینک نے اندر آ کر پوچھا۔

”تم یہاں کھڑی کیا موج رہی ہو؟“

مارگو کی پیشانی پر ہلکی سی شکن آ گئی۔ اس نے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے ایکس رے رپورٹ دے کر مجھے دلی براؤ کے پاس بھیج دیا تھا۔ کاش کہ میں نہ جاتی۔ میں یہاں موجود ہوتی تو گیری کو کھڑکی سے چھلانگ لگانے کا موقع نہ دیتی۔ آف! میں ذرا سی دیر کے لئے گئی اور ذرا سی دیر میں یہاں کیا سے کیا ہو گیا۔“

”تم اس کے متعلق زیادہ نہ سوچو۔ ورنہ اسی طرح پریشان ہوتی رہو گی۔“ ڈاکٹر داش بیسن کے پاس آ کر اپنے دونوں ہاتھ دھونے لگا۔

مارگو نے چونک کر اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ ٹینک کے دائیں ہاتھ کی کلائی سے ذرا اوپر ناخنوں کی خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ نل کا پانی ان خراشوں پر سے گزرتا جا رہا تھا۔ وہ گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے موج رہا تھا کہ وہ ذرا سی دیر کے لئے ڈاکٹر دلی برڈ کے پاس گئی تھی اور ذرا سی دیر میں ڈاکٹر ٹینک کے ہاتھ پر خراشیں آ گئی تھیں۔

اس نے تو لیے سے ہاتھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں برٹائس کو چھوڑنے جا رہا ہوں۔ تم بھی چیمبر کو لاک کر کے گھر چلی جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ مارگو تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر واپس نہیں آئے گا تو وہ دوسرے کمرے میں آ گئی اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”ہیلو اسپیکر! مس ڈاکٹر ٹینک کی اسٹنٹ مارگو بول رہی ہوں۔ دیکھئے مجھے شبہ ہے کہ گیری کی موت کا ذمہ دار کوئی اور ہے۔“

یہ کہہ کر وہ ذرا خاموش ہو گئی۔ انسپکٹر نے کہا: ”میری کی میڈیکل رپورٹ پڑھنے کے بعد یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی موت دے دار ہے۔ پھر ہم بغیر کسی ثبوت کے کسی اور پر کیسے الزام عائد کر سکتے ہیں؟“

”ایک ثبوت ہے انسپکٹر! ڈاکٹر ٹیلنگ کے دائیں ہاتھ پر ناخنوں کی خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔ اگر آپ میری کے ناخنوں کا طبی معائنہ کرائیں تو اس میں کسی کے خون اور گوشت کی ہلکی سی کھرچن ضرور ملے گی۔ آپ اس کھرچن کا موازنہ ڈاکٹر ٹیلنگ کے خون اور گوشت کے کر سکتے ہیں۔“

انسپکٹر کی جوشیلی آواز سنائی دی۔

”شکریہ مس مارگوا تم نے قانون کی بہت بڑی مدد کی ہے۔ میں ابھی ایکشن لیتا ہوں۔“

مارگو ریسیور رکھ کر تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے میری بہت یاد آ رہا تھا۔ وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ خیالی دنیا کا رہنے والا میری اسے بھی پہاڑی چٹانوں سے گرا کر ہلاک کر چکا تھا۔

کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ وہ میز پر سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے کنڈر کیلنڈر کھلا ہوا تھا۔

کیلنڈر کے جفت صفحے پر آٹھ تاریخ تھی۔

اور وہ آٹھ تاریخ بڑی منحوس تھی۔

خیال زدہ

جیل سے بھاگنے والے ایک معزور قاتل کی کہانی۔ وہ صرف ایک بار اپنی
مہین کو دیکھنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا مگر تقدیر اس کے مخالف تھی ووجہ
مہین کے سامنے پہنچا تو.....

بھلا اپنے آپ کو بھی کوئی سرے پاؤں تک دیکھ سکتا ہے؟ صرف آئینہ دکھاتا ہے مگر وہاں آئینہ نہیں تھا۔ ایک سنسان سارا رستہ تھا اور وہ اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ رات کی تنہائی میں وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے سائے میں کھڑی ہے۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی ہے۔ ہر لمحے چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے، کوئی آواز نہیں رہا؟ خوف کے مارے اس کی جان نکل جا رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھانا چاہتی تھی کہ وہاں سے چلی جائے۔ جتنی تیزی سے بھاگ سکتی ہے، بھاگ جائے۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ اپنے آپ کو دور سے دیکھ رہی تھی مگر اپنے قریب جا کر اپنے آپ کو سمجھنا نہیں سکتی تھی۔

اس کے سر پر بوڑھے برگد کا سایہ تھا اور اس کی بوڑھی ٹہنی اس کے آس پاس اس طرح جھول رہی تھیں جیسے اسے اپنی گرفت میں لے کر یا اپنی ٹلوں کا پھندا بنا کر پھانسی پر چڑھا دینا چاہتی ہوں۔ وہ بچپن سے سنتی آئی تھی کہ برگد کے درختوں میں چڑیلوں پناہ لیتی ہیں لیکن وہ چڑیلوں سے نہیں ڈرتی تھی اور نہ ہی اسے کوئی ایسی خیال دہشت زدہ کرتا تھا۔ اس کے باوجود کوئی انجانا سا خوف اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جہاں اس کی ہمزاد کھڑی ہوئی تھی، ٹھیک اس کے پیچھے ایک انسانی سایہ سا جھلک رہا تھا۔ پہلے وہ سایہ واضح نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ برگد کا متحرک سایہ ہے جو اس کے وہی تصور میں مجسم ہو گیا ہے۔ لیکن..... جب وہ بالکل قریب پہنچ گیا، تب وہشت سے اس کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ چیخا چاہتی تھی لیکن آواز کو آواز دیکھی ٹھیسوں نے جکڑ لیا تھا۔

ہاں وہ ایک ہاتھ ہی تھا۔

بے دیکھتے ہی اس کی جان نکل جاتی۔ وہ بھوتوں سے، چڑیلوں سے حتیٰ کہ موت سے

بھی نہیں گھبراتی تھی۔

لیکن وہ عالم ہاتھ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا اس کی پشت کی جانب سے بالکل سامنے آ گیا۔ اس کھوڑے ہاتھ نے اس کی ٹھوڑی کو اپنی ہتھیلی کے پیالے میں لے لیا اور اپنی انگلیوں سے اس کے شفق رنگ رخساروں کو بڑی بے دروی سے پھول کی طرح مسلتے لگا۔ وہ برداشت نہ کر سکی۔ ان دیکھی ٹھیکوں میں جکڑی ہوئی چیخ ایکدم سے ابھر کر رات کے سانے میں منتشر ہو گئی..... پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ نوم کے ملائم بستر پر بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور سانس لیتا ہوا سینہ اپنی اٹھان سے اوپر دھڑک رہا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر خود کو سمجھاتی رہی کہ وہ ایک خواب تھا، محض خواب۔

اس کی چیخ سنتے ہی سارے گھر میں ہلچل سی مچ گئی۔ پھر کتنے ہی ہاتھ خواب گاہ کے بند دروازے کو پیٹنے لگے۔ اپنوں کی آوازیں سن کر اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس کے انکل، آنٹی، کزن ایسے ہڑبڑا کر اندر چلے آئے جیسے دروازہ نہ کھلا ہو، سیلاب کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

انکل نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے ماری؟“

اس کے جواب دینے سے پہلے اس کے کزن نے کہا۔ ”دیکھئے تو ڈیڈی! کیسی پبلی پڑ گئی ہے۔ میں سمجھ گیا محترمہ کیوں چیخ رہی تھیں۔“

اس کی آنٹی نے ناگواری سے کہا۔ ”اس میں سمجھنے کی بات ہی کیا ہے، ہر دوسرے تیسرے روز ہماری نیند خراب کرتی ہے۔ پتہ نہیں رجب کا مہینہ کب آئے گا اور اس سے جان چھوٹے گی۔“

اس کے کزن نے کہا۔ ”بھئی! ماریہ نے آدھی رات کو چیخ ماری ہے اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ٹھیک آدھی رات کے بعد سے رجب کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد یہ سرخ بوڑا پنے گی اور ہمارا پیچھا چوڑ کر چلی جائے گی۔“ اس کی آنٹی ”ادمنہ“ کہہ کر چلی گئیں اور ان کے پیچھے ان کے بچے بھی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد انکل نے کہا۔

”بیٹی! پتہ نہیں وہ ہاتھ تمہارے خوابوں اور خیالوں میں کہاں سے چلا آتا۔ یہ شادی کے بعد بھی تمہاری یہی حالت رہی تو سسرال والے تمہارے بارے میں پتہ نہیں کیسی رائے قائم کریں۔ میرا خیال ہے مجھے کسی ماہر نفسیات سے ملنا چاہئے۔ وہی تمہارے ذہن کو کریدے گا اور تمہیں سمجھائے گا کہ جہ کچھ تم دیکھتی ہو، وہ محض وہم ہے یا ماضی کوئی معمولی سا واقعہ ہے جسے اتنی زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ تم اب آرام کرو۔ کھڑکیاں اور دروازے بند ہیں۔ تمہیں اس طرح خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ میں صبح تمہیں کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ واپس جانے لگے۔ دروازے پر پہنچ کر انہوں نے پھر ایک بار ماریہ کو گہری سنجیدگی سے دیکھا اور آہستگی سے کہا۔ ”بیٹیاں بڑی مشکل سے چلبی جاتی ہیں۔ پہلے تو جسمانی عیب کو دیکھا جاتا ہے۔ بظاہر کوئی عیب نہ ہو تو رشتہ مانگنے والے دماغ کے اندر جھانک کر بھی اچھی طرح چھان بھانک کر دیکھتے ہیں کہ لڑکی اندر سے بھی مکمل ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ باقاعدہ علاج سے تمہاری یہ کمزوری دور ہو جائے۔ تم لڑکیوں کو بیابنے کے لئے ماں باپ کو کتنے جھوٹ بولنا پڑتے ہیں، دوسروں کو تا عمر فریب دینا پڑتا ہے۔ اب یہی دیکھو، جس لڑکے سے تمہارا رشتہ ہو رہا ہے، اسے یہ نہیں بتایا گیا کہ تمہارا بھائی ایک حادی مجرم ہے اور ان دنوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی جوانی کی قیمتی گھنٹیاں گزار رہا ہے اور تم جانتی ہو کہ تمہارے ہونے والے شوہر سے یہ بات کیوں چھپائی گئی ہے؟“

وہ اپنے پیچھے ایک سوال چھوڑ کر چلے گئے۔ ماریہ چند لمحوں تک بند دروازے کی طرف دیکھتے رہی۔ پھر اس نے دل ہی دل میں بند دروازے کو جواب دیا۔

”ہاں“ میں جانتی ہوں کہ یہ بات کس لئے چھپائی گئی ہے۔ میرا ہونے والا شوہر پولیس انسپکٹر ہے۔ بھائی مجرم اور خاوند قانون کا محافظ، آگ کو پانی سے چھپا کر ہی رکھنا پڑتا ہے۔“

ساتے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ ایک نظر کھڑکیوں پر ڈالی اور مطمئن ہو کر بستر پر آگئی۔

رات چپ تھی، دنیا سو رہی تھی اور کتنی ہی اندیشے جاگ رہے تھے۔ ایک اندیشہ یہ تھا کہ کوئی ماہر نفسیات اس کے ذہن کو کرید لے گا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس

راز تک پہنچے جو اچھی بھلی لڑکیوں کو بھی بتا دیتے ہیں۔ انکل نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ سہاگ کا جو ڈا پیسٹے کے لئے بہت سے جھوٹ اور فریب کا سہارا لیتا پڑتا ہے۔ وہ کیسا ہی ماہر نفسیات کیوں نہ ہو، میں اسے فریب دے دوں گی۔ اس لئے کہ ماں کے دامن پر داغ لگے تو وہ داغ سہاگن بیٹی کے ماتھے کا جھومر بن کر لوگوں کو متوجہ کر لیتا ہے۔

ایک سہاگن بیٹے کا خیال آیا تو دور اس کی سماعت میں کہیں شہنائی ہی گونجنے لگی۔ کھلی آنکھوں کے سامنے اس نے خود کو سرخ جوڑے میں دیکھا۔ وہ دلہن بنی جتنی حسین لگ رہی تھی، اتنی ہی اس کے ماتھے کا جھومر غما لگ رہا تھا۔ جھومر کے رنگ پر نکلے رنگوں سے سوپاور کے بلب کی روشنی منعکس ہو رہی تھی، رنگین شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ان رنگوں کی لہلہ میں اس نے وہ تماشا دیکھا۔ وہ اس کی ماں کی خواب گاہ تھی۔ کوئی اجنبی کھڑکی کے راستے اندر آ رہا تھا۔ اس وقت وہ چھ برس کی بچی تھی۔ بچوں جیسی گہری غنیمت سونے کی حاوی تھی۔ نہ جانے اس کی آنکھ کیسے کھل گئی۔ ایک اجنبی کو دیکھتے ہی اس نے ڈر کر جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔ کتنے ہی چور و کوروں کے سنے ہوئے قصے ایک اجنبی کے روپ میں سامنے آ گئے۔

اس محی می ہر بڑا کر اٹھ گئیں اور دلپا لباس درست کرنے لگیں لیکن سوتے وقت دوپٹے پاس نہیں رہتا تھا۔ وہ دوپٹے اٹھانے کے لئے آگے بڑھیں تو اجنبی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولیں۔ ”تمہیں میری خواب گاہ میں آنے کی برأت کیسے ہوئی؟“

اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پتہ نہیں کیسا معنططیسی شباب لئے پھرتی ہوئی کہ میں خود بخود کھینچا چلا آیا۔ شاہید! میں نے بہت برداشت کیا، دور دور سے دیکھ کر لپٹا رہا۔ میں سمجھتا تھا میری بوند بوند نگاہیں تمہاری پتھر پٹی سوچ میں میرے لئے جگہ پیدا کر دیں گی لیکن تم بڑی بے حس ہو۔ میرا ایک دوست ماہر نفسیات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ بعض عورتیں چاہتی ہیں کہ ان سے محبت کی بھیک نہ مانگی جائے بلکہ جبراً ان کو ان سے چھین لیا جائے اور میں چھیننے کے لئے آیا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے شاہید کو اپنی طرف کھینچا اور اپنے غولادی بازوؤں کی فصیل میں قید کر لیا۔ وہ تڑپنے لگی، مچلنے لگی، یہ بھول گئی کہ اتنی جذباتی قربت میں بدن کا ذرہ ذرہ

فصل کی دیواروں سے ٹکراتا ہے، لپکتا ہے اور دیوارنگی کو شہ دیتا ہے۔ اجنبی نے فائبر انداز میں کہا۔

”میرے ماہر نفسیات دوست نے یہ بھی کہا تھا کہ عورت زبان سے کچھ نہ کہے اور چیخنے کی تکلیف گوارا نہ کرے۔ صرف خاموش اداؤں سے رسمی طور پر انکار کرتی رہے۔ سمجھو کہ وہ دام میں آگئی اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میری گرفت سے نکلنے کے لئے چل رہی ہو مگر چیخنے کی تکلیف گوارا نہیں کر رہی ہو۔“

شاہینہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ”زیادہ ماہر نفسیات بننے کی کوشش نہ کرو۔ ماریہ کے ڈیڑی پہلے ہی ہم دونوں پر شبہ کرتے ہیں۔ وہ ایک بار کہہ چکے ہیں کہ میں تم سے فری ہو کر باتیں نہ کروں۔ اگر میں نے چیخنا شروع کر دیا اور وہ آگے تو کبھی یقین نہیں کریں گے کہ تم خود یہاں آئے ہو۔ ساری عمر کے لئے طعنہ بن جائے گا کہ میں نے تمہیں بلایا تھا عورت کی مجبوریوں کو سمجھو، خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔“

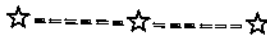
لیکن وہ نہ جاسکا۔ وہ اس شجر کے سائے تک پہنچ گیا تھا جہاں جانے کے لئے اس دنیا کے پہلے انسان کو بھی رد کیا گیا تھا اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ جس بات کے لئے اسے رد کیا جائے، اس بات کے لئے وہ زیادہ چلتا ہے..... اور وہ مچلتا گیا۔

ننھی سی حسی ہوئی ماریہ کبھی کبھی آنکھیں کھول کر دیکھتی تھی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہی یوں لگتا جیسے وہ بھوت اس کی ماں کی بوٹیاں پہانے کے بعد اسے بھی کچا جہانے آجائے گا۔ تب اس کی ماں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”دیکھو، اب میں چیخنا شروع کر دوں گی۔ شیطان درندے! تو میری خاموشی کا غلط مطلب سمجھ رہا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اس کے بازو کو اپنے دانتوں سے کاٹنے لگی۔ اجنبی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی اور ماریہ کے ڈیڑی کو آدازیں دیتی ہوئی وہاں سے بھاگنے لگی لیکن اجنبی اس سے زیادہ پھرتا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا ایک دم اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت ماریہ نے اس ظالم ہاتھ کو دیکھا۔ وہ پیچھے سے آیا تھا اور اس ہاتھ نے ماریہ کی ٹھوڑی کو اپنی ہتھیلی کے پچالے میں رکھ کر دبوچ لیا تھا۔ اس ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کی می کی چیخ گھٹ کر رہ گئی وہ ظالم انگلیاں اس کی می کے تھمتاتے ہوئے رخساروں میں پھوست ہو گئی تھیں۔ ماریہ کو یوں لگا جیسے اس کا اپنا چہرہ اپنی ٹھوڑی اور

اپنے رخسار ان انگلیوں کے شکنجے میں آگئے ہوں۔ پھر وہ ہاتھ آہستہ آہستہ ٹھوڑی سے سرکتا ہوا گردن پر آگیا۔ پھر اس کا دم گھٹنے لگا۔ یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ماں کا دم گھٹ رہا تھا اور بیٹی کی سانسیں رکی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے بستر پر ادھر سے ادھر ترپنے لگی۔ سانسیں تھیں کہ سینے تک پہنچنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ پتہ نہیں موت اسی طرح آتی ہے یا نہیں لیکن مادیہ عارضی طور پر مر گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی۔ اس کے آس پاس کتنے ہی لوگ تھے۔ اس کے ڈیڈی تھے، ڈاکٹر تھا اور پولیس کے آدمی یہ پوچھنے آئے تھے کہ اس کی سہی کو کس نے ہلاک کیا؟ وہ صرف اتنا ہی بتا سکی کہ ایک اجنبی تھا لیکن یہ نہ بتا سکی کہ اس اجنبی نے اس کی ماں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ وہ چھ برس کی بچی تھی لیکن اس کے ذہن میں اپنی ماں کی یہ بات نقش ہو گئی تھی کہ اگر اس نے اس اجنبی کا نام لیا یا ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک حصہ بھی اپنے بیان میں لکھوایا تو اس کی ماں بدنام ہو جائے گی۔ بچپن میں اس نے تھیں ماں کی محبت سے متاثر ہو کر یہ بات چھپائی تھی۔ جوان ہو کر پتہ چلا کہ یہ راز اس کے سہاگن بننے کے لئے بھی کتنا اہم ہے۔ اگر اس کے ہونے والے خاندان کو پتہ چل جائے کہ کوئی اجنبی رات کی تنہائی میں اس کی ماں کے اہتا قریب پہنچ گیا تھا تو وہ بیٹی کے کردار پر بھی شبہ کرے گا۔ یہ مرد بڑے شکی مزاج ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ عورت اپنی زندگی کی پوری کتاب اس کے سامنے کھول کر رکھ دے۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے خاوند کو جی جان سے چاہے گی۔ اس کے اعتماد کو کبھی نہیں نہیں پہنچائے گی۔ سونے سے پہلے اپنی خواب گاہ کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند رکھا کرے گی تاکہ کوئی اجنبی ہاتھ اس کی ٹھوڑی اور ٹھوڑی سے گرون تک نہ پہنچ سکے لیکن وہ ہاتھ جو اس کی ماں کی خواب گاہ سے چل کر اس کے ذہن کے تاریک تہہ خانے میں آکر بیٹھ گیا ہے، اس کی حقیقت کبھی نہیں بتائے گی۔



وہ دلسن بنی پھولوں کی بیج پر بیٹھی تھی۔ نصف چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے دس بھرے ہونٹ اور ٹھوڑی کی بیضوی گولائی گھونگھٹ سے باہر نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک اجنبی ماحول میں آگئی تھی اور اس کمرے میں جو ساری زندگی کا ساتھ ہی بن کر آنے

دالا تھا' وہ بھی اجنبی تھا' لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اپنے اجنبی کا پیار جو آج رات ملے گا زندگی کی آخری سانس تک اس کے ساتھ چلتا رہے گا۔

وہ تماشوں کی طرف سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی تو اپنی عادت کے مطابق ماضی کی طرف لوٹ جاتی تھی اور وہاں سے جتنے زخم ملے تھے' ان پر امید کے مرہ رکھتی جاتی تھی۔ ایک زخم تھا ماں کی بددلی' دوسرا زخم تھا بھائی کی جدائی جسے ہوش سنبھالنے کے بعد اب تک نہیں دیکھا تھا لیکن آج اسے ماضی یاد نہیں آ رہا تھا۔ حلقہ خوشبو' زیورات کی جھللاہٹ' سہاگ کے جوڑے کی آفتابیں رنگت ایسی ہوتی ہے کہ لڑکیاں دقتی طور پر بڑے سے بڑے الیے کو بھلا دیتی ہیں۔ ایسے وقت گھونگھٹ کے سانس میں صرف مستقبل کا سپنا نظر آتا ہے۔

وہ صرف اپنے خلود کے متعلق سوچ رہی تھی۔ محبت کے آن دیکھے تجھے جواں ملنے والے تھے' ان کے سرور کن خیالوں میں ڈبلی ہوئی تھی۔ کچھ اس نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ کچھ اپنی بیابانہ سہیلیوں سے سنا تھا کہ سہاگ رات میں آنے والے کا انتظار کر جان لیا ہوتا ہے۔ ہر آہٹ پر جان نکلتی ہے کہ پھر نہیں آنے والا ظالم ہے یا مہربان؟ مہربان ہو یا نہ ہو مگر محبت کے اصولوں سے آشنا ہو۔ ایسا شخص ظالم ہو تو نئی تو ملی دلن کی پیار بھری اداؤں سے پہلی ہی رات پکھل جاتا ہے اور جو پہلی رات دیوانہ بن جائے تو اس کی دیوانگی کا نشہ تمام عمر اس کے ذہن پر چھایا رہتا ہے۔ اس کی ایک سہیلی نے بتایا تھا کہ پہلی رات بہت اہم ہوتی ہے۔ یا تو عورت ہمیشہ کے لئے اپنے خلود کو جیت لیتی ہے یا پھر ہار جاتی ہے اور ساری عمر اس سے مرعوب رہتی ہے۔

اس کی سہیلی نے ایک بہت ہی اہم بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ جب خلود اجنبی ہو اور اس کے مزاج سے واقفیت نہ ہو تو اسے آزمانے کا اور اس کے مزاج کو سمجھنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ عورت دلن بن کر شرماتی رہے اور اپنے اجنبی ساتھی کی قربت سے سنبھتی رہے۔ جب وہ گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ دیکھنا چاہے تو پھر وہ اپنی گھبراہٹ کا اظہار کرے اور بڑے ہی شرمیلے لہجے میں پانی طلب کرے۔ اگر پہلی رات خلود پانی اسے اپنے ہاتھوں سے پلائے تو سمجھ لینا کہ وہ فرماہیزوار قسم کا خلود ہے۔ ماریہ نے سوچ رکھا تھا کہ وہ بھی یہی نسخہ آزمائے گی۔

دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔ وہ ایسے سم کر سمٹ گئی جیسے اچانک ہی کسی شکاری نے رائفل کا گھوڑا چڑھایا ہو۔ سمنے اور سمٹنے کے باوجود اس نے گھونگھٹ کے افق سے دیکھا دروازہ بند نظر آیا، قدموں کی چاپ نہیں تھی اور اس تناکمرے میں کسی دوسرے کے وجود کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر کوئی تھا اور اس کے پیچھے تھا۔ ساگ کے کمرے میں مدہم مدہم سی خواب آور روشنی ادنگھ رہی تھی اور اس خواب دیکھنے والی کے پیچھے خواب و خیال کا وہ بھاری بھر کم اور کھردرا سا ہاتھ سرخ جوڑے کے پس منظر سے ظور ہو رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ ذرا آگے بڑھا، اس کے بائیں کان کے قریب سے گزرتا ہوا اس کے گھونگھٹ کے سنہرے کنارے سے ٹکرا گیا۔ گھونگھٹ میں ذرا سی ہلچل مچ گئی۔ دل یکبارگی اچھل کر دھڑکنے لگا۔ ماریہ نے سم کر سر اٹھایا۔ اسی وقت اس کی ٹھوڑی اجنبی ہتھیل کے پیالے میں آگئی۔ ایک ساعت کے لئے اس کے دیدے پھیل گئے۔ چیخ کی آواز اس کے سینے سے اٹھی اور ممک ممک کر، انک انک کر یک بارگی آتش نشاں کے لادے کی طرح اس کے دس بھرے لیوں سے منتشر ہو کر فضا میں گونج اٹھی۔

پھر اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے، کس دنیا میں ہے۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ ساگ کی سیج پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس کتنے ہی لوگ تھے۔ اس کے ساس سسر، ایک ڈاکٹر اور ایک اجنبی نوجوان تھا جس کی رد پہلی شیردانی بتا رہی تھی کہ وہ اس کا دلہا ہے۔ ڈاکٹر اس سے چیخنے اور خوفزدہ ہونے کی وجہ پوچھ رہا تھا، اس کا خاندان ہچکچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں اس کمرے میں آیا تھا، یہاں تو ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے دیکھ کر یہ خوفزدہ ہو جائیں۔ انہوں نے مجھے بھی نہیں دیکھا تھا، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ آپ ہی آپ چیخ مار کر بے ہوش کیسے ہو گئیں؟“

ماریہ سے پوچھا گیا تو اس نے بڑی خاموشی سے کچھ اس طرح نقاہت کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپک کر بڑی نرمی سے کہا۔ ”ابھی کچھ نہ بولو، تمہیں خاموشی اور آرام کی ضرورت ہے۔“

پھر اس نے اس کے سرال والوں سے کہا۔ ”دلہن کو تنا نہ چھوڑا جائے اور.....“ اس نے بات کو ادھوری چھوڑ کر اس کے خاوند کو دیکھا اور بڑی آہستگی سے

معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اور آج رات دلہن کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی دواؤں کا بیگ اٹھا کر چلا گیا۔ اس کے ساس سر تھوڑی دیر سے تسلیاں دیتے رہے اور اسے سمجھاتے رہے کہ یہ اس کے لئے اجنبی ماحول ضرور ہے لیکن وہ سب اس کے دشمن نہیں ہیں۔ اگر کسی سے خوف آتا ہو تو بلا جھجک کہہ دے اس کے دل سے خوف و دہشت دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اسے سمجھانے کے دوران اس کی ساس نے اپنے خاندان کو آنکھوں ہی آنکھوں پر اشارہ کیا کہ یہ سہاگ کا کمرہ میں نے اپنے بیٹے کے لئے سجایا ہے۔ چلو یہاں سے۔

وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ کمرے میں صرف اس کا دل رہ گیا۔ وہ شرمہا کر پڑ گئی تو اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”یہ شرمہا کا موقع نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہہ گیا ہے۔“

جہیں زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔“

وہ اٹھنا چاہتی تھی مگر اس نے جبراً اس کے شانے کو تھام کر لٹا دیا اور مسکراتا ہوا بولا۔ ”میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ صرف مجرم ہی دیکھ کر چیخ کر بھاگتے ہیں۔ آج پتہ چلا کہ جسے اپنی زندگی کا ساتھی بنایا وہ بھی مجھے دیکھ کر ہار گیا ہے۔“

وہ اپنی ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کو چھپاتی ہوئی بولی۔ ”میں..... میں آپ سے شرمندہ ہوں۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم شرمندہ ہو اور میں بھی یہ سوچ کر شرمندہ ہوں کہ پولیس والوں کے چہرے کتنے بھیانک ہوتے ہیں۔“

وہ ندامت سے بولی۔ ”مگر میں نے تو آپ کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک ہی کسی کا ہاتھ میری ٹھوڑی اور گردن تک آ گیا۔“

اس کے انسپکٹر خاندان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”بھئی وہ میرا ہاتھ تھا۔ کیا پیچھے ہاتھ آئے تو تم ڈر جاتی ہو؟“

اس نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ پھر ایک بار ہنستے ہوئے بولا۔ ”مجیب افذر ہے۔ ایک پولیس انسپکٹر ہونے کی حیثیت سے میں اس بات کا حادی ہو گیا ہوں کہ مجرموں کو پیچھے سے جا کر پکڑتا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مگر میں اپنی حادث سے مجبور ہوں۔“

کر تمہارے پیچھے آگیا تھا۔ میرا یہ مذاق ہر حال مجھے مزگا پڑا۔ دیکھو نا ڈاکٹر معنی خیز انداز میں کہہ گیا ہے کہ میں تمہیں ڈسٹرب نہ کروں۔ اب تو میں حسرت سے تمہیں دیکھ رہا ہوں اور ساری رات دیکھتے ہی دیکھتے گزر جائے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے اس کے نازک سے ملائم ہاتھوں کو تھام لیا اور اس کی گلابی ہتھیلی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر نے ہاتھ پکڑنے کو تو منع نہیں کیا ہے۔“
 ماریہ نے کہہ ”میں بزدل نہیں ہوں لیکن نہ جانے کیوں پیچھے سے کوئی ہاتھ آئے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ محبوب کا ہاتھ کسی مجرم کا ہاتھ نہیں ہوتا کہ پیچھے سے آئے۔ آپ کا ہاتھ جب بھی محبت سے سامنے آئے گا، اس کی اہمیت میری جان سے زیادہ ہوگی۔“

اس کے خاندان نے حوصلہ پا کر اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔ دستور کے مطابق پہلی بار مرد کی انگلیاں عورت کی ٹھوڑی کو چھوتی ہیں تاکہ ہلکا سا ٹھہکا دے کر اس کے چہرے کو اٹھائے، روشنی کی زد میں لائے اور چہرے کے نقوش کو جی بھر کر دیکھے۔

وہ دہی ہاتھ تھا جس کا لمس پاتے ہی وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی تھی لیکن اب وہ سامنے آیا اور محبت سے آیا تو وہ مارے شرم کے چھوٹی موٹی کی طرح سمٹ گئی۔ اس کے خاندان نے کہہ ”ہمارے رسم و رواج بڑے ہی فرسودہ ہیں۔ شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے۔ ماں باپ دیکھتے ہیں، پسند کرتے ہیں اور سہاگ کے اس رنگین پنجمرے میں دو اجنبیوں کو قید کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر لڑکی ایک اجنبی کی موجودگی سے سم کر بے ہوش ہو جاتی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ آؤ پہلے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ تم نے نکاح پڑھانے کے دوران میرا نام سنا ہوگا۔ میرا نام مراد علی ہے اور میں تمہارا نام جانتا ہوں لیکن اصل تعارف یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے مزاج سے آشنائی ہو اور مزاج تو رفتہ رفتہ سمجھ میں آتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ماریہ کے پھول جیسے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں کے گلدان میں سجا لیا۔

جیل کی آہنی سلاخوں کو توڑ کر ٹکٹا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لئے زبردستی ہے کہ قانون کے محافظ بھی مجرموں کا ساتھ دیں۔ ایک سپاہی نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ آدھے دروازے کا تالا توڑنے میں اس کی مدد کی تھی اور اسے فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ جب جیل کے اسلٹ کی اونچی دیوار پر چڑھ گیا تب اس سپاہی نے خطرے کا الارم بجایا۔ جیل وسیع چار دیواری میں ایک ہلچل مچ گئی۔ دزدی بوٹوں سے زمین کی چھاتی وٹنے لگی۔ وہ جیل کی اونچی دیوار پر دوڑتا رہا۔ دوڑنے کے دوران اسے پتہ چلا کہ کوئی اس کے بہت قریب اسے اپنی گرفت میں لینے آگیا ہے۔ اس نے دیوار کی بلندی سے چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے نے بھی چھلانگ لگائی اور دونوں ایک ساتھ پانی میں آ گئے۔ سرچ لائٹ کی روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ جہاں تھے وہاں تقریباً اندھیرا تھا۔ اس لئے وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ اس نے قریب آنے والے پر ہاتھ چھوڑا۔ دوسرے نے اس کے حملے کو رد کرتے ہوئے کہا۔

”کیا کرتے ہو“ میں بھی تمہاری طرح ایک مجرم ہوں۔ لڑنے بھگڑنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ چلو بھاگو جہاں سے۔“

پھر وہ دونوں تیرتے ہوئے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف جانے لگے۔ جب سرچ لائٹ گھومتی ہوئی ان کی طرف آتی تو وہ پانی میں غوطہ لگا دیتے اور اندر ہی اندر تیرتے ہوئے دور تک نکل جاتے۔ دوسرے کنارے پر پہنچنے کے بعد وہ چند لمحوں تک کتوں کی طرح ہانپتے رہے۔ انہوں نے پلٹ کر دور جیل کی چار دیواری کو دیکھا پھر پلٹ کر بھاگنے لگے۔ ان کے پیچھے سپاہی نہیں تھے لیکن جیل کا سائمن رات کے سنائے میں ”تک چیخا ہوا ان کا پیچھا کر رہا تھا۔“

رات کا پھیلا ہوا تھا۔ راستے اور گلیاں دیر ان تھیں۔ اس لئے کوئی ان کے راستے میں حائل نہ ہوا۔ کبھی کبھی کسی گلی سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ بہت دور جا کر وہ ایک ریلوے لائن تک پہنچ گئے۔ ان سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ آڈٹر سنگل کی سرخ روشنی بتا رہی تھی کہ ٹرین کو آگے بڑھنے کے لئے سبز روشنی کا انتظار ہے۔ وہ ٹرین کی طرف بھاگنے لگے۔ مسلسل دوڑتے رہنے کی وجہ سے ان کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ تھک ہار کر گر پڑتے لیکن وہ تھکنے اور ہارنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ بانٹتے تھے کہ اگر انہوں نے ذرا بھی تاخیر کی تو پولیس والے انہیں بھاگنے کا موقع نہیں دیں گے۔ تمام شر کی ناکہ بندی کر دیں گے۔ لہذا وہ محاررے کے مطابق سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ آدھے فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے سرخ روشنی کو سبز روشنی میں بدلتے دیکھ کر ٹرین اب چلنے ہی والی تھی۔ ان کے دوڑنے کی رفتار میں تیزی آگئی۔ جب پچاس گز کا فاصلہ رہ گیا تو انہیں نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز انہیں بلا رہی تھی۔ ”آؤ جلدی آؤ۔“ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور میں بانے والی ہوں۔ تمہیں قانون کی گرفت سے دور لے بانے والی ہوں۔“

پھر ٹرین کے رنگ آلود پئے حرکت میں آ گئے۔ دونوں دانت کچکپاتے ہوئے دوڑنے لگے۔ جیسے جیسے ان کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی، ٹرین کا آخری ڈبہ بھی ان کے قریب سے گزرتا جا رہا تھا۔ ایک نے اچھل کر ہینڈل کو پکڑ لیا اور پائیدان پر دونوں پاؤں جما کر اپنا دوسرا ہاتھ نیچے بھاگتے ہوئے ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ دوسرا ساتھی دوڑنے کے معاملے میں اتنا تیز نہیں تھا لیکن ایک ہاتھ نے اسے بہت سہارا دیا۔ وہ ہاتھ کو تھام کر اچھلتے ہوئے پائیدان سے لپٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا آدھا نچلا جسم زمین پر گھسٹنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ پیلوں کی زد میں آتا، اس کے ساتھی نے اس کا گریبان پکڑ کر پوری قوت سے اوپر اٹھایا۔ دوسرے کے لئے اتنا سہارا کافی تھا۔ وہ بھی پائیدان پر کھڑے ہونے کے قائل ہو گیا۔

وہ کسی آفیسر کا سپیشل کمپارٹمنٹ تھا۔ انہوں نے کھڑکی کے شیشے سے دیکھا۔ اندر ہلکی ہلکی نیلی روشنی تھی۔ ایک ادیبز عمر کا آدمی برتھ پر بیٹھا ہوا ولایتی دھبے کی چسکیاں لے رہا

تھا اور ایک نیم عریاں عورت اس کے شانے سے نیک لگائے ایک ہاتھ سے اس کا سر
 رہی تھی۔ وہ دونوں مجرم و بک کر پائیدان پر بیٹھ گئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔
 ”اس کمپارٹمنٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شراب پینے والا آدمی کوئی بہت بڑا
 ہے۔ اس کے پاس یقیناً ریوالور ہو گا۔ اگر نہ ہو تب بھی وہ ہمیں دیکھتے ہی زنجیر کھینچے گا۔
 دوسرے نے تاکید میں سر ہلایا اور کہا۔ ”ہاں، ہمیں ایسی کوئی حرکت نہیں
 چاہئے جس سے ٹرین رک جائے۔ یہ ہمیں جتنی دور لے جاسکتی ہے، ہم جائیں گے۔
 میں ہماری بہتری ہے۔“

وہ دونوں خاموشی سے پائیدان پر بیٹھے رہے۔ ٹرین شہری حدود سے باہر نکل آئی
 اور اب جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک نے ذرا سر
 اٹھا کر دیکھا۔ وہ آفیسر اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ جلدی
 و بک کر اپنے ساتھی سے بولا۔ ”وہ کبخت اسی طرف آ رہا ہے، اب کیا ہو گا؟“
 دوسرے نے کہا۔ ”اگر اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر ہمیں دیکھا تو میں اس
 ایسی تیشی کروں گا ورنہ وہ زنجیر کھینچ کر یا ہمیں ریوالور کی زو میں لا کر ہماری ایسی تیشی
 دے گا۔“

وہ دونوں پائیدان سے اٹھ کر شیشے کی کھڑکی کے اطراف ایک دم محتاط ہو کر کھڑے
 گئے۔ ٹرین کھناکھٹ کی آواز کے ساتھ اپنی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی اور ٹرین
 سے گزرنے والے درختوں کے پتے ان کے چہرے پر جھاڑو پھیرتے جا رہے تھے۔
 آفیسر شراب کے نشے میں جھومتا ہوا بالکل شیشے کے قریب آ کر رک گیا اور کھڑکی کے شیشے
 کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ڈارلنگ! ادھر آؤ۔ ذرا باہر کی تازہ ہوا کھائیں۔“
 وہ اپنی جگہ ذرا نزاکت سے اٹھلاتی ہوئی بولی۔ ”میں نہیں آؤں گی، ٹھنڈی ہوا
 مجھے زکام ہو جاتا ہے۔“

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”نازک بدن حسیناؤں کی نزاکت کا کیا کہنا۔ انہر
 تازہ ہوا سے بھی زکام ہو جاتا ہے۔“
 اس عورت نے کہا۔ ”کھڑکی نہ کھولو، دیکھو باہر کتنا اندھیرا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا
 ہے۔“

”عورت کے خوفزدہ ہونے سے مرو کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ سم کر پناہ لینے کے لئے اپنے آپ ہی آغوش میں آجاتی ہے۔ مرو تو خطرات سے کھیلنے کا فاوی ہوتا ہے۔“ یہ دیکھو میں باہر اندھیرے میں اپنا ہاتھ نکال رہا ہوں۔ کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ تو نہیں لے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کے باہر اپنا ہاتھ نکال دیا۔ وہ ہاتھ ایک مجرم کے بالکل قریب سے سرور کر آگے کی طرف پھیل گیا۔ وہ ویدے پھیلا کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھی نے اشارے سے سمجھایا کہ خطرہ ہو تو ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کھینچ لو۔

ٹرین طوفانی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ وہ دونوں وردازے کے اطراف ہینڈل کو تھامے چپکے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک تیسرا ہاتھ تھا جو ان کی ذرا سی غلطی سے انہیں قانون کے حوالے کر سکتا تھا۔ لہذا وہ دونوں غیر قانونی حرکتوں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کمپارٹمنٹ کے اندر اس عورت نے حیرانی سے کہا۔

”ہائے ڈارلنگ! تم کتنے دلیر ہو۔ کیا تمہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔ پلیز ذرا باہر دیکھو تو آسمان بالکل تاریک ہے یا تارے نظر آ رہے ہیں۔“

کچھ شراب کا نشہ تھا اور کچھ یہ بات تھی کہ عورت کی موجودگی میں اپنی مرواگی کا ثبوت دینے کا کوئی موقع ہاتھ آئے تو اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ اس نے ذرا اکر کر اپنی گردن جھکائی اور مرو کو کھڑکی سے باہر نکالا۔ وہ آسمان پر تارے دیکھنا چاہتا تھا لیکن دو طرف سے دو ہاتھوں نے آکر اسے کتنے ہی رنگ برسنگے تارے دکھائے۔ تابڑ توڑ کتنے ہی گھونٹے اس کے منہ پر پڑے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کمپارٹمنٹ میں واپس جاتا دو ہاتھوں نے اس کے سر کے بالوں کو مضبوطی سے جکڑ کر باہر کی طرف کھینچ لیا۔ وہ کھڑکی پر آؤھا اؤھر اؤھا اؤھر ہو گیا۔ پھر ان دو ہاتھوں نے اس کے بالوں کو جھوڑ کر اس کی کمر پر پتلون میں ہاتھ ڈالا اور اسے پوری قوت سے باہر کی طرف کھینچ کر پھینک دیا۔ اس کی چیخیں دور تک سنائی دیتی رہیں۔ چونکہ وہ آخری کمپارٹمنٹ تھا اس لئے اس کی چیخیں پیچھے ہی رہ گئیں آگے کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں۔

موت کا یہ تماشا دیکھنے والی صرف ایک عورت تھی جو ذرا دیر کے لئے سم کر ایک جگہ دبک گئی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس کی جان کا بھی خطرہ ہے اسے خطرے کی زنجیر کھینچنا چاہئے۔ وہ زنجیر کھینچنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھی لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ موت

کا کھیل کھیلنے والے کسی کو اتنی مہلت کب دیتے ہیں۔ اتنی دیر میں وہ دونوں کھڑکی راستے اندر آ گئے تھے۔ ایک نے کھڑکی کا شیشہ گرایا، دوسرے نے اس عورت کا روک لیا۔ پھر اس عورت کی کلائی تھام کر اپنے ساتھی سے ہنستے ہوئے بولا۔

”یار یہ تو بڑی کراری چیز ہے۔ ماں کسم سات برس تک جیل کی ان سخت دیواروں کو دیکھا ہے۔ ایسا حسین مکھڑا دیکھنے کو تو ترس کر رہ گیا تھا۔“

یہ کہہ کر اس نے حسین مکھڑے کو اپنی جانب کھینچا تو وہ گھبرا کر چیخنے لگی۔ اس نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے کی طرف گئی، میز پر دو ہوئی شراب کی بوتل سے ٹکرائی اور فرش پر گر پڑی۔ وہ اپنی داڑھی سمجھاتے ہوئے پیٹ سفائی سے بولا۔ ”سالی آواز کرتی ہے۔ ابھی اپنے یار کے ساتھ رنگ رلیاں منارہی تھی اری میں بھی تو مرد ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اپنی حالت بگڑی ہوئی ہے، بدن پر قید خانہ کے کپڑے ہیں۔ لا! وہ صاحب بہادر کے کپڑے نکال۔ ابھی میں بھی تیرے ساتھ کھیلنے والا ایک شریف آدمی بن جاؤں گا۔“

اتنے میں دروازے کے قریب کھٹکا سانسائی دیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ٹائلٹ میں ڈا اور ایک نوجوان کی گردن پکڑ کر اسے کپار ٹمنٹ میں لا رہا تھا۔ پھر اس نے اس کے سر ایک چپت مار کر اپنے ساتھی سے کہا۔ ”یہ آلو کا پٹھا ٹائلٹ میں چھپا ہوا تھا۔ ابے منہ سے بول! کیا کر رہا تھا ٹائلٹ میں؟“

یہ کہہ کر اس نے پھر ایک چپت رسید کی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر رونے کے انداز میں بولا۔ ”تم دونوں کون ہو؟ مجھے کیوں مار رہے ہو؟ میرے بڑے صاحب کہاں گئے ہیں؟“

دوسرے ساتھی نے پھر ایک چپت بھرتے ہوئے کہا۔ ”ابے ہم سے سوال کئے جا رہا ہے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ پہلے یہ بتا کہ تو کون ہے؟ اور ٹائلٹ میں کیا کر رہا تھا؟“

اس کے ساتھی نے ہتھمہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی سگی بڑے صاحب کے سامنے جوانی کے کھیل کھیل رہی تھی اور یہ آلو کا پٹھا شرابا کر ٹائلٹ میں چھپ گیا تھا۔ کیوں ہے نا یہی بات؟“

اس کے ساتھی نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ ”تو سچ میں نہ بول، مجھے اس سے پوچھنے

کے لئے نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ تمام سامان کی تلاشی لینے لگا۔ وہ سرے نے پلٹ کر اس ٹائٹ سے ڈالے نوجوان سے کہا۔ ”ہاں اب بتاؤ تم کون ہو؟“

وہ نوجوان ایک مجرم کی طرف کپار ٹمنٹ کے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں ایک جوئیز کلرک ہوں، میری ایک چوی ہے جو اپنے جینز میں ایک دائمی پٹا لے کر آئی ہے۔ چار بچے ہیں جو پیٹ بھر کر کھانے کے باوجود اچھی اچھی چیزیں کھانے کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ پھر میری اپنی زندگی کی ضرورتیں بھی ہیں جو ایک جوئیز کلرک کی تنخواہ سے پوری نہیں ہوتیں۔“

قیدی نے اس کے سر پر چیت مارتے ہوئے کہا۔ ”اے میرے سامنے اپنی زندگی دکھڑا کیوں رو رہا ہے، تجھے یہ باتیں اپنے افسروں سے کہنی چاہئیں۔“

”میں نے افسروں سے کہا تھا مگر رشوت کے بغیر ترقی نہیں ہوتی۔ میرے محلے کے ایک سینئر کلرک نے بس کی تنخواہ چار سو روپے ہے اور بس کی ادپری آمدنی آٹھ سو روپے ہے، اس نے مجھے رشوت دینے کا آسان طریقہ سکھایا۔ اس نے بتایا کہ ہمارا بڑا صاحب بڑا رنگین مزاج ہے، وہ جب بھی دورے پر جاتا ہے تو اپنے ساتھ فرسٹ کلاس چھوٹری لے کر جاتا ہے۔ تم بھی کسی فرسٹ کلاس چھوٹری کا تحفہ پیش کرو تو تمہاری ترقی ہو جائے گی۔“

دوسری طرف دوسرے قیدی نے تمام سامان کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اس نے دو جوڑے کپڑے نکالے، شیونگ کا سامان نکالا، کھانے کا کچھ سامان لیا۔ پھر ان حب کو ایک تھیلے میں رکھ کر دوبارہ اس حسینہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس عورت نے شاید سمجھ لیا تھا کہ شور مچانے سے اور ان درندوں سے لکڑھانے سے جان نہیں چھوٹے گی لہذا وہ بڑی خاموشی سے اس کی آغوش میں آگئی۔

اسی وقت جوئیز کلرک نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے لئے اے چھوٹو۔ میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔ مجھے ترقی نہیں چاہیے۔ میں اس کی عزت کو کھانا نہیں بنانا چاہتا۔“

اس حسینہ کو آغوش میں لینے والے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اے ایسا ہی شریف آدمی

ہے تو پھر اپنے بڑے صاحب کے سامنے اے کھلونا کیوں بنا رہا تھا؟“
اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میں نے کہا نا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں فرشتہ نہیں ہوں، انسان ہوں۔ غلطی کی ہے تو بچھتا بھی رہا ہوں۔ آپ میری مجبوریوں کو نہیں سمجھتے۔ میری بیوی سبکی ٹورم میں ہے، میرے بچے بھوک سے ہلک رہے ہیں۔ اس لئے میں بہت مجبور ہو کر بہت مجبور ہو کر اپنی بہن کو سیل لے آیا ہوں۔“
یہ سنتے ہی اس کے سامنے کھڑے ہوئے قیدی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے ذہن کی تاریکیوں سے ایک بھائی اپنی بہن کو چیخ چیخ کر پکارنے لگا۔ ”ماریہ..... ماریہ.....“

ماریہ میں تیرے لئے جیل کی سلاخیں توڑ کر آ رہا ہوں میری بہن! جتنی تیزی سے اس کا ذہن چیخ رہا تھا، اتنی ہی تیزی سے ٹرین بھاگتی جا رہی تھی۔ کھٹ کھٹا کھٹ کی ہر تال پر بہن کا نام بج رہا تھا۔ وہ جو سامنے نوجوان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، وہ سیدھے ایک مجرم بھائی کے دل پر ٹپک رہے تھے۔ اس نے غراتے ہوئے پلٹ کر اس قیدی کو دیکھا جو ایک بھائی کی بہن کو بھنڈوڑ رہا تھا۔ وہ ایک دم سے لرز گیا۔ اس سینہ کی جگہ اسے ماریہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک بارگی دوسرے قیدی پر چھلانگ لگائی۔ پھر اسے ہینچتا ہوا در تک لے گیا۔ اس کے بعد اسے ایک گھونسہ مار کر زمین پر گراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تجھے منع کیا تھا کہ اس عورت کو ہاتھ نہ لگاتا۔“

مار کھانے والا جھلا کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”سارے! یہ کیا تیری بہن ہے کہ تو منع کرتا ہے۔“ یہ کہتے ہی پھر اس کے منہ پر ٹھوکر لگی۔ وہ پھر زمین پر آ گیا۔

ٹھوکر مارنے والے قیدی نے کہا۔ ”ہاں، یہ میری بہن ہے۔ اگر ایک بھائی بے غیرت بن کر اپنی بہن کا سوا کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرا بھائی غیرت مند نہیں ہے۔ اگر تو میری غیرت کو آزمانا چاہتا ہے تو اس عورت کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ، میں تیری آنکھیں نکال لوں گا۔ آگے بڑھ کر اسے ہاتھ لگا، میں تیرے ہاتھ توڑ دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ تو بہت بڑا قاتل ہو، مای گرای بد معاش ہو، لیکن میرا نام بھی باہر ہے اور باہر کا نام سن کر صرف قاتل اور مجرم ہی نہیں، قانون کے محافظ بھی تھراتے ہیں۔“

زین پر گرا ہوا قیدی اپنی بانچھوں سے رستے ہوئے خون کو پوچھتے ہوئے پنے

مخاطب کو غصے سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ زمین پر سے اٹھتا ہوا اور اس عورت کو کن انکھیں سے دیکھتا ہوا سوچنے لگا۔ باہر کا نام تو میں نے بھی سنا ہے، واقعی یہ ہے تو بڑا خطرناک، میں اس سے کمزور تو نہیں ہوں اور پھر ایک عورت کے سامنے مار کھا کر خاموش رہنا بڑی شرم کی بات ہے۔ ابھی اس نے میرا ہاتھ نہیں کھایا ہے، ذرا میں بھی اسے دو چار ہاتھ کا مڑا چکھا دوں۔

یہ سوچتے ہی اس نے ایک ایک اس پر حملہ کیا۔ باہر اس خوش فہمی میں مار کھا گیا کہ اس کا مخالف اس سے مرعوب ہو گیا ہے۔ اس نے سچ مچ بڑے کرارے ہاتھ جمائے تھے پھر اسے رگیدتا ہوا دردناکے تک لے گیا تھا۔ اس کے بعد باہر بھی سنبھل گیا، اس نے بھی جوابی دواؤں پیچ و کھائے۔ وہ دونوں پھرے ہوئے سائنڈل کی طرح لڑ رہے تھے۔ کپار ٹمنٹ میں جیسے زلزلہ آگیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے نہ ہار بلکہ رہے تھے اور نہ ہی ہار جیتا فیصلہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

بست دیر بعد ان دونوں کو ذرا ہوش آیا کیونکہ ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ وہ لڑائی جھگڑا بھول کر دروازے کے باہر دیکھنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے، ان کے راستے الگ الگ تھے لیکن خطرہ ایک تھا۔ قانون کے محافظوں کا خطرہ، جیل کی چار دیواری میں دوبارہ بھیج دیئے جانے کا اندیشہ۔ دونوں اس خیال سے کانپ گئے کہ کیسا پولیس دالوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔

جب ٹرین رک گئی تو ایک قیدی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”باہر مجھے یاد رکھنا میرا نام شکر ہے۔ شیر کے سنہ سے نوالہ چھیننا آسان ہے لیکن شوکت کی آغوش سے کسی حسینہ کو چھین لینا گویا موت کو دعوت دینا ہے۔ آئندہ تو کبھی میرے سامنے آئے گا تو اپنی موت کے سامنے آئے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے کھلے ہوئے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ باہر نے اندھیرے کی جانب حقارت سے دیکھا پھر اس نے کپار ٹمنٹ میں بیٹھی ہوئی اس نوجوان عورت اور اس کے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ اور اب شرافت کی زندگی گزارو۔ ماں اور بہن کے مقدس رشتے کا یو پار نہ کرو۔ اگر آئندہ میں نے تم دونوں کو اس روپ میں دیکھا تو وہیں تمہیں ذبح کر کے رکھ دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ بھی اپارٹمنٹ سے باہر تاریکی میں گم ہو گیا۔

☆-----☆-----☆

ماریہ ڈریسنگ نہیں کے سامنے سکھار میں مصروف تھی۔ اس کے جسم پر بہترین لباس تھا، قیمتی زیورات تھے اور پھول کی طرح کھلا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار ہے۔ اب وہ اپنے ماضی کے متعلق نہیں سوچتی تھی، صرف اپنے خاندان مراد علی کے متعلق سوچتی تھی۔ خاندان کا تعلق صرف حال اور مستقبل سے ہوتا ہے، اس لئے وہ مراد کے ساتھ مستقبل کے سہانے چہرے دیکھتی رہتی تھی۔ البتہ جب وہ مراد کو پولیس انسپکٹر کی دروی میں دیکھتی تو اس دروی کی نسبت سے اسے اپنا مجرم بھائی یاد آ جاتا تھا اور وہ سوچنے لگتی۔ ”بھائی کیسا ہو گا؟ کیا اسے یاد کرتا ہو گا۔“

اسے بھائی کے ساتھ گزری ہوئی بچپن کی بہت سی باتیں یاد تھیں۔ پتہ نہیں وہ یادیں بھائی کو بھی تڑپاتی تھیں یا نہیں؟ ایک بہن کے لئے بھائی کا رشتہ کتنا قابل فخر ہوتا ہے مگر اس نے مراد کو فخر سے اب تک یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا بھائی ایک مجرم ہے جو بچپن سے لاپتہ ہے اور اس کی یاد اسے بہت تڑپاتی ہے۔

ماضی کی یادیں بڑی مکار ہوتی ہیں۔ کتنی ہیرا پھیری سے بھائی کی محبت کا سہارا لے کر پھیل یا دول کے در سے بچے کھول دیتی ہیں اور وہ جسے دعویٰ تھا کہ ماضی کو بھول چکی ہے، وہ ٹوانٹنگی میں پھر اسی طرف لوٹ جاتی تھی۔

باہر موٹر سائیکل کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ سراد آ گیا تھا۔ وہ جلدی سے اپنے چہرے کے میک اپ کو آخری ٹچ دیتے لگی۔ وہ بڑی عجلت سے اپنے چہرے کی نوک پلک درست کرتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھی تو مراد اندر آ گیا۔ وہ پولیس انسپکٹر کی دروی میں تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر رونق نہیں تھی۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ماریہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟ آپ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے ہیں۔“

”پولیس کی ڈیوٹی ہی ایسی ہے کہ تھکن اور پریشانیوں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔“

”میں آپ کی شریک حیات ہوں۔ آپ کے فرائض کو اچھی طرح سمجھتی ہوں لیکن آج سے پہلے آپ کبھی اتنے پریشان نظر نہیں آئے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ آج کوئی نامناسب

قسم کی پریشانی ہے۔“

”ہاں، تمہارا خیال درست ہے۔ پچھلی رات جلال آباد کی سنٹرل جیل سے دو قیدی فرار ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بابر مام کا مجرم بہت ہی خطرناک ہے اور میری جان دشمن ہے۔“

بابر کا نام سنتے ہی ماریہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ چند ساعتوں تک اس پر سکتہ طاری رہا۔ اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے بھائی کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے اگلے کبھی کبھی اس کے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے اور یہ بھی تاکید کرتے رہتے تھے ”بھائی کو سیکے کی چمار دیواری میں یاد کرو اور سسرال کی وسیع دنیا میں جا کر بھول جاؤ کہ تم کسی کی بہن ہو۔“

انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا بھائی بابر ان دنوں جلال آباد کی سنٹرل جیل میں ہے۔ سکتے کے عالم میں وہ چند ساعتیں صدیوں کی طرح گزر گئیں۔ مراو نے اسے جھنجھو کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم تو بالکل پتھر کا مجسمہ بن گئی ہو۔ شاید یہ بات تمہیں خوفزدہ کر رہی ہے کہ بابر میری جان کا دشمن ہے۔ ادنہ، اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ کتنے مجرم جو میرے ہاتھوں سے گرفتار ہوتے ہیں اور جن کے خلاف میں ٹھوس ثبوت فراہم کرتا ہوں، وہ سب میرے دشمن بن جاتے ہیں۔ میری ملازمت ہی ایسی ہے۔ آج پہلے میں تبھی اتار پریشان نہیں ہوا لیکن آج کی پریشانی محض تمہاری وجہ سے ہے۔“

وہ چونک کر مراد کو دیکھنے لگی۔ وہ اپنے نیال کے مطابق درست کہہ رہا تھا اور اپنے طور پر سوچ رہی تھی کہ میرا بھائی میرے سہاگ کا دشمن ہے لہذا بھائی کے غلطی مراد کی پریشانیوں کا باعث بنوں گی۔ اس کے جی میں آیا کہ اپنے خاندان کے سامنے حقیقت اگل دے کہ بابر جیسا خطرناک مجرم اس کا بھائی ہے اور سب بھائی کو معلوم ہو گا کہ آپ میرا سہاگ ہیں، آپ میری زندگی ہیں تو وہ بہن کی کھلیوں کی چوڑیاں نہیں لڑے گا۔

لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ بچپن ہی سے اس کے اگل اسے سمجھاتے آئے تھے۔ ”ہمارا عزت کا نیال کرو۔ تمہارے ڈیڈی کے انتقال کے بعد میں نے تمہیں عزت و آبرو اپنے پاس رکھا ہے لیکن اس گھر میں کبھی تمہارے بھائی کا نام بھی آیا تو میری عزت

میں مل جائے گی۔“
 برسوں کے سکھانے پڑھانے کا بڑا گمراہ اثر تھا لہذا اس نے مراد کے سامنے اپنی کتبلی زندگی کے اس درق کو چھپا لیا جس پر اس کے بھائی کا نام لکھا ہوا تھا۔
 مراد نے کہا۔ ”تم شاید نہیں سمجھیں کہ میں تمہاری وجہ سے کس لئے پریشان ہوں۔ بات یہ ہے کہ پہلے میں تھا تھا کوئی ذمے داری میرے سر پر نہیں تھی۔ مگر اب تمہاری ذمے داریاں میرے سر پر ہیں۔ صرف ذمے داریاں ہی نہیں تمہاری وہ محبت بھی جو ڈیوٹی کے اوقات میں یاد آتی رہتی اور تڑپاتی رہتی ہے۔ ان سب باتوں نے مجھے کمزور بنا دیا ہے۔ سوچتا ہوں اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تمہارا کیا ہو گا؟“

ماریا نے تڑپ کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور پریشان ہو کر بولی۔ ”آپ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔ آپ کو کچھ نہ ہو گا“ میری محبت سچی ہے۔ اگر باہر اس دردناکے پر آئے گا اور میری پیار بھری خوشگوار زندگی کو دیکھے گا تو خاموشی سے سر جھکا کر لوٹ جائے گا۔“
 مراد نے بٹتے ہوئے کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگایا اور کہا۔ ”بعض اوقات تم بالکل نفیسی سی بچیوں کی طرح باتیں کرتی ہو۔ یہ چور بد معاش اور قاتل اپنے سینے میں فولاد کا دل رکھتے ہیں۔ بیوی، بیٹی یا بہن کی خوشیاں بھی انہیں موم نہیں بنا سکتیں۔“
 ماریا نے کہا۔ ”آپ اپنے تجربات کے اعتبار سے درست کہتے ہیں لیکن آپ میری بات مان لیں۔ کسی طرح مجھے اس مفرد قیدی سے ملنے کا موقع دیں۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔“

”ماریا! ذرا عقل سے کام لو۔ اگر میں تمہیں اس سے ملنے کا موقع دے سکتا تو کیا اب تک اسے گرفتار نہ کر لیتا۔ کیا مفرد قیدی یہ بتا کر باتے ہیں کہ وہ کس پتے پر ملاقات کریں گے؟“

ماریا الجھ گئی۔ بھائی کے وجود کو چھپانے کے لئے پتہ نہیں کیسی الٹی سیدھی باتیں کہنے جا رہی تھی۔ مراد نے اسے پیار سے چومتے ہوئے کہا۔ ”میری پریشانیوں نے تمہیں پریشان کر دیا ہے۔ تمہارا دماغ اس دقت معقول باتیں سوچنے کے قابل نہیں ہے۔ اس وقت تمہیں تفریح کی ضرورت ہے اور مجھے یاد ہے کہ آج ہم نے انگریزی فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا ہے۔ تم تو تیار ہو چکی ہو۔ اب مجھے تھوڑا سا وقت دو۔ میں لباس بدل کر

تمہارے ساتھ چلا ہوں۔“

ماریہ نے کہا۔ ”پہلے آپ غسل کریں۔ غسل کرنے سے دماغ کا بوجھ ہلکا ہو جائیگا۔ پھر گرم گرام چائے پلاؤں گی۔ شاہے چائے پینے سے فرحت اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہم کچر دیکھنے جائیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ چائے بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ تفریح کے لئے باہر نکلے۔ بہت دیر تک سمندر کے ساحل پر مشلتے رہے۔ وہ ماحول بڑا رومان پرور تھا لیکن رومان پرور گفتگو کے دوران ان دونوں کے دماغ میں ایک کانٹا کھٹک رہا تھا۔ مراو کے دماغ میں ایک مفروز قیدی کی چھین تھی جو اس کا جانی دشمن تھا اور ماریہ کے دماغ میں ایک مجرم بھائی کا رشتہ چھ رہا تھا۔

جب وہ سینما ہال میں آکر بیٹھے تو ان کا خیال تھا کہ کم از کم دو گھنٹے تک انہیں فلم موج و فکر سے نجات مل جائے گی اور وہ فلمی کہانی کی خیالی دنیا میں پہنچ جائیں گے۔ جب فلم شروع ہوئی تو اسکرین کے مناظر بڑے بھیانک ثابت ہوئے۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ پولیس انسپکٹر نے مقابلے کے دوران ایک مجرم کے ہاتھ کو کھائی سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔ مجرم اسی وقت مر گیا لیکن اس کے بعد کہانی نے ایک بھیانک روپ اختیار کر لیا۔ مجرم کے مرنے کے بعد بھی اس کا کٹا ہوا ہاتھ زندہ رہا۔ اب وہ ہاتھ اپنی انگلیوں کے بل بوتے آہستہ آہستہ زمین پر رینگتا تھا اور پولیس انسپکٹر کا پیچھا کرتا تھا۔

اس کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھتے ہی ماریہ کی جیسے جان نکلنے لگی تھی لیکن خوف و دہشت ابھی اتنا کو نہیں پہنچی تھی۔ ابھی وہ رینگتا ہوا ہاتھ لگاہوں کے سامنے ہی تھا اور جو ہاتھ سامنے سے آئے اس سے ماریہ خوفزدہ نہیں ہوتی تھی البتہ کسی بہت بڑے خطرے کی پیش نظر اس نے احتیاطاً مراد کے بازو کو تھام لیا تھا۔

فلم کا ہر منظر ایسا تھا کہ وہ ہر منظر کے نکتہ عروج پر کانپ کانپ جاتی تھی۔ اس کا بڑی آہستگی سے لرزتے ہوئے لہجے میں مراد سے التجائی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز بیلد سے چلے۔ یہ تفریح عذابِ جاں بن گئی ہے۔“

مراد نے اس کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے کر تھکتے ہوئے کہا۔ ”تم واقعی مضیٰ بھیجی ہو۔ بمبئی یہ تو محض ایک فلم ہے، سچ سچ کا واقعہ تو نہیں ہے کہ وہ ہاتھ تمہارے پاس

آئے گد میری جان! تم پولیس انسپکٹر کی بیوی ہو۔ تمہیں دلیر بن کر رہنا چاہئے۔“
 اس نے پھر التجا نہیں کی۔ دلیر بننے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ ہاتھ کمائی کے
 کلائمکس تک پہنچ رہا تھا اور زیادہ سے زیادہ وہشت انگیز بنتا جا رہا تھا۔ اس ہاتھ نے چشم
 تصور میں اس کی ماں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور دو چھ سال کی بچی سمی ہوئی اپنے بستر پر
 سڑی سمی سی پڑی ہوئی تھی اور وہ ہاتھ اس کی ماں کی لاش پر سے گزرنے کے بعد اس
 کی طرف آ رہا تھا اور پیچھے سے آ رہا تھا کیونکہ اس نے بال کے اندھیرے میں بیٹھے ہی
 بیٹھے ہاتھ کی کلائی کو اپنی گردن سے مس ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر وہ ہاتھ اس کے
 دائیں کان کے قریب سے گزرتا ہوا اس کے رخسار کو چھوتا ہوا اس کی ٹھوڑی کے نیچے
 ہتھیلی کا پیالہ بن گیا۔ اس نے ایک زور کی چیخ ماری پھر اسے ہوش نہ رہا کہ اس کی چیخ نے
 سینا بال میں کیسی کھلبلی مچا دی تھی اور مراد کو یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ ہال کی تاریکی سے
 ڈمدہ اٹھا کر اس نے اپنی پیاری بیوی کو چومنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔

☆-----☆-----☆

بار صبح سے شام تک جنگلوں میں بھٹکتا رہا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ شام کے قریب وہ ایک بستی میں پہنچ گیا۔ بستی میں داخل ہونے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اس کے فرار ہونے کی خبر اس علاقے کے تھانے تک پہنچ چکی ہے یا نہیں۔ وہ بستی چھوٹی سی تھی۔ سو ڈیڑھ سو کچے کچے مکانات پر مشتمل تھی۔ بستی کے سرے پر جو مکان تھا وہ کھیتوں کی طرف دوسرے مکانات سے ذرا دور ہوا تھا۔ کھلیان میں سوکھی زرد گھاس پر اونچا سا ایک پہاڑی نما ڈھیر تھا۔ وہ چھپتا چھپاتا گھاس کی بلندی تک پہنچ گیا۔ اس نے سوکھی ہوئی زرد گھاس کے تنکوں کو اپنے اوپر ڈال لیا اور ایک ذرا سا سر نکال کر بستی کا جائزہ لینے لگا۔ دور بہت دور جہاں بستی کی گھنٹی لہرائی تھی وہاں کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لئے لوگ اپنے مکانوں کی چار دیواری تک محدود ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک باسات برس کی لڑکی بستی کی طرف سے آئی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اچانک اسے یاد آ گئی۔ آخری بار جب اس نے ماریہ کو دیکھا تھا تو وہ چھ برس کی تھی اور وہ بیس برس کا جوان تھا۔ زندگی کے چھ برس بھائی بہن نے کتنی محبت سے گزارے تھے۔ اس محبت ایک لمحہ اسے یاد آ رہا تھا۔

تقدیر کتنی ظالم ہوتی ہے۔ صرف چھ برس کے لئے منہ سی معصوم بہن کی جان دی پھر اسے عمر بھر کے لئے جیل کی ملاخوں کے پیچھے بھیج دیا۔ کاش وہ مجرم بننے سے پہلے یہ سوچ لیتا کہ بہن ہمیشہ کے لئے پکھڑ جائے گی اور اس کی محبت کے بغیر چچا اور چچی کا محتاج بن کر اپنی زندگی گزارے گی۔

لیکن وہ قاتل بننے پر مجبور تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کے ڈیڈی کو شراب پڑا

نے بے حد کمزور بنا دیا تھا۔ ڈیڑی وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے تھے اور محی وقت گزرنے کے بعد بھی جوان تھیں اور ڈیڑی کا ایک عیاش دوست شمشاد علی اس کی ماں پر بری نظر رکھتا تھا۔ وہ اس رات جاگ رہا تھا جب شمشاد علی چوروں کی طرح اس کی ماں کی خواب گاہ میں کھڑکی کے راستے داخل ہوا تھا۔ اس نے شمشاد علی کو خواب گاہ میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا اسے واپس بھاگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت اسے لٹکارنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کی ماں بدنام ہو جاتی۔ وہ ماں کی موت پر بظاہر خاموش رہا لیکن انتقام کی آگ اس کے اندر لادنے کی طرح پکتی رہی۔ دوسری رات اس نے شمشاد علی کی خواب گاہ میں جا کر اسے قتل کر دیا۔ انتقام کی آگ تو سرد پڑ گئی لیکن بہن کا بچپن اور اس کی تھائی اسے ڈسنے لگی۔ ایک سال کے بعد اس کے چچا نے آکر بتایا کہ اس کے ڈیڑی کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ ماریہ کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہے۔ وہ وقتی طور پر کسی حد تک مطمئن ہو گیا لیکن دس سال بعد جب اسے پتہ چلا کہ اس کی بہن ہوان ہو چکی ہے اور بیابان کے قابل ہو گئی ہے تو وہ بہن کو ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپ گیا۔ اس کے چچا نے کہا تھا۔

”تمہاری محبت اس کی زندگی نہیں سنوار سکتی۔ تم نے جو قتل کیا ہے اس جرم کا داغ تمہاری بہن کی پیشانی پر اس قدر نمایاں ہو گیا ہے کہ اب میں جلال آباد چھوڑ کر حسن آباد جا رہا ہوں۔ یہاں اس کا رشتہ نہیں آتا کیونکہ وہ ایک قاتل کی بہن ہے۔ تم نے دس سال کے عرصے میں کئی بار جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر تم کبھی فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤ تو ماریہ کی طرف رخ نہ کرنا اور نہ ہی کسی کو بتانا کہ تم اس کے بھائی ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بہن سہاگن بنے تو ایک بار پھر قاتل بن کر بھائی کے رشتے کو قتل کر دو۔ اس کے لئے سرجاؤ۔ بس میں یہی کہنے آیا تھا۔“

یہ کہہ کر اس کے چچا جلنے لگے۔ بار نے جیل کی ملاخوں سے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”مٹھیے! میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا لیکن ایک بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اجنبی بن کر ہی اسے ایک بار دیکھ لوں؟“

اس کے چچا نے سختی سے کہا۔ ”میں۔ میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ تم اس کے لئے سرجاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے لئے مر جائے۔ کیونکہ کوئی بھی عورت خواہ وہ

بٹی ہو یا بہن، اپنے سہاگ پر آج آتے نہیں دیکھ سکتی اور میں تمہاری اطلاع کے لئے کہہ دوں کہ اس کا رشتہ انسپکٹر مراد علی سے ہونے والا ہے جس نے تمہیں گرفتار کیا اور جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ جیل کی سلاخوں سے باہر آ گیا تو اسے ضرور قتل کر دیا۔ اب تم ان سلاخوں کے پیچھے سوچتے رہو، کیا اپنی جن کا سہاگ اجازت دے سکتا ہو؟

وہ سوچتا رہ گیا اور اس کے چچا چھپے گئے۔ وہ چند دنوں تک بڑی کشمکش میں رہا اور ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی معصوم بہن کے سہاگ کا دشمن بن جاتا۔ پھر جس دن اسے بڑی کی شادی کی اطلاع ملی، اس نے اسی دن انسپکٹر مراد علی کو معاف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فیصلہ کیا کہ اب جیل کی چار دیواری میں زندہ نہیں رہے گا اور یہاں سے فرار کر باقی زندگی کسی دوسرے ملک میں گزارے گا۔ یہاں رہ کر بہن کی یاد تازہ پاتی رہے گی اور یہاں سے جانے سے پہلے وہ ایک بار اپنی بہن کو دیکھے گا۔ ایک بار اس کی زبان سے وہ نام سنے گا۔ پتہ نہیں بہن کی زبان میں کیسی مٹھاس ہوتی ہے کہ نام کیسا ہی ہو، اس زبان کی ادائیگی سے خوبصورت بن جاتا ہے۔ باہر کو مجرم کہنے والوں کی دنیا میں صرف ایک ہی زبان زبان تھی جو اسے بھائی کہہ سکتی تھی۔

وہ ایک گہری حانس نے کر جیل کی چار دیواری سے لوٹ آیا اور گھاس کے ڈھیر میں لیٹے ہی لیٹے پھر اس چھ سالہ لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اب وہ لڑکی قریب آگئی تھی۔ باہر بے خوف و خطر گھاس کے ڈھیر سے باہر آ گیا۔ وہ لڑکی ٹھٹھک کر بولی۔ ”کون ہو تم؟“

باہر نے آرام سے دونوں پاؤں کو گھاس پر پھیلا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بھول گئیں ماریہ کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔“

لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میرا نام ماریہ نہیں مریم ہے اور تم میرے بھائی کیسے ہو سکتے ہو؟ تم اتنے بڑے ہو، تمہاری داڑھی بھی کتنی بڑھی ہوئی ہے۔ تم تو بوڑھے ہو، تم میرے بھائی نہیں ہو سکتے۔ میرا بھائی تو اتنا بڑا ہے، جو ان ہے اور لام پر گیا ہوا ہے۔“

باہر نے کہا۔ ”جب ماریہ چھ برس کی تھی تو میں بھی تمہارے بھائی کی طرح جوان تھا اور تمہارے بھائی کی طرح زندگی کی جنگ لڑنے چلا گیا تھا۔ جب تمہارا بھائی لام سے دایا آئے گا تو وہ بھی میری طرح بوڑھا نظر آئے گا۔ دیکھو تم میری ماریہ بن جاؤ، میں تمہارا بھائی بن جاتا ہوں۔ تم ابھی بچی ہو، تم نہیں سمجھو گی کہ اس طرح دردِ مانی میں بھائی بہن

کی محبت کے گزرے ہوئے لمحات پھر ہماری منٹھی میں آجائیں گے۔“
 لڑکی نے معصومیت سے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”پتہ نہیں تم کیسی ٹیڑھی میڑھی باتیں کرتے ہو۔ میرا بھائی بھی ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔ اس لئے میں تمہیں بھائی کہتی ہوں۔ آؤ اب میرے ساتھ گھر چلو۔ یہ میرا گھر ہے، یہاں میرے بوڑھے بابا رہتے ہیں۔ میں اپنے بابا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور بچی کا نازک سا ہاتھ تھام کر اس کے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ مریم نے مکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج بابا کو کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تک جی نہیں جلائی۔ گھر میں اندھیرا ہو تو مجھے براؤر لگتا ہے۔ مگر ابھی تو تم میرے ساتھ مونا..... مجھے ڈرنا نہیں چاہئے۔“

بابا نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، تمہیں نہیں ڈرنا چاہئے۔ میری بہن ماریہ بہت دلیر ہے۔ چونکہ تم میری بہن بن گئی ہو، اس لئے تمہیں بھی دلیر بننا چاہئے۔“

وہ مکان کے برآمدے میں پہنچ گئے۔ مریم نے اونچی آواز میں کہا۔ ”بابا، تم جی کیوں نہیں جلائی؟ دروازہ کھولو۔ دیکھو میرا ایک بھائی واپس آ گیا ہے۔“

مکان کی تاریکی سے ایک بوڑھی اور جذبات سے لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ”میرا بیٹا..... میرا بیٹا شاید لام سے واپس آ گیا ہے۔ مجھے جانے.....“

بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی آواز اندھیرے میں گھٹ گئی۔ یوں لگا جیسے بوڑھے کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی دبی دبی سی سرگوشیاں سنائی دیں۔

بابر جیسا مجرم ایک دم سے محتاط ہو گیا۔ اس نے مریم کے کان کے پاس منہ لے باکر بڑی آہستگی سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے بابا کے علاوہ اور بھی کوئی اس مکان میں رہتا ہے؟“

مریم نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی وقت اندر سے بوڑھے کی آواز آئی۔ ”بیٹی اپنے بھائی سے کمو، ابھی اندر نہ آئے۔ اندر اندھیرا ہے اور..... اور خطرہ.....“

پھر اس کی آواز گھٹ گئی۔ آواز بالکل دروازے کے قریب سے آئی تھی۔ بابا نے سمجھ لیا کہ بوڑھے کی آواز کو دبانے والا بھی دروازے کے قریب ہی ہے۔ اس نے مریم کو

اشادے سے کہا کہ وہ برآمدے کے آخری سرے پر چلی جائے۔ وہ دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ اسی دقتِ بابر نے دروازے پر ایک زور کی لات ماری۔ دروازہ یکبارگی کھلا اور اس نے پیچھے کھڑے ہونے والے اس کی زد میں آکر دور تک لڑکھڑاتے چلے گئے۔ بابر نے اندر کر دروازے کو بند کر دیا۔

اندر گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ بابر کمرے کے حدود اور پھر واقف نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ وہ آگے بڑھے نہ جانے کس سے ٹکرا گیا، دوست سے یا دشمن سے.....؟ لیکن وہ جو اندھیرے میں تھے وہ کسی قدر تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئے تھے لہذا بابر اندھے پن میں مار کھا گیا اچانک ہی کسی کا گھونسا اس کے منہ پر پڑا تھا۔ اسے اندھیرے میں تارے نظر آ گئے۔ اس حماقت کا احساس ہوتا ہی کہ اسے دروازے پر جم کر نہیں رہنا چاہئے وہ فوراً ہی ہٹ گیا لیکن دوسری جگہ پہنچتے ہی دوسرا گھونسا اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ تکلیف کی شدت نہ کر سکتے ہوئے ذرا جھک گیا۔ جھکتے ہی تیسرا گھونسا اس کے منہ پر آیا لیکن اس بار اس نے مارنے والا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے لپٹتے ہوئے بولا۔

”تم ویر سے اس کمرے میں ہو، اس لئے اندھیرے میں دیکھ لیتے ہو لیکن اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ہم اسی طرح لپٹ کر ایک دوسرے کی خیریت پوچھ لیں گے۔“
دوسرا بھی اس سے لپٹ کر اسے ہالے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری آواز تو کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے، کون ہو تم؟“

”ہوں۔“ بابر نے غراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مجھے نہیں پہچانا لیکن میں نے تمہاری آواز سے پہچان لیا کہ تم شوکت ہو۔“

”اچھا، تو تم بابر ہو۔“

وہ ایک دم سے بھر کر اسے پوری قوت سے رگیدنے لگا۔ بابر تھوڑی دیر تک سنبھل نہ سکا۔ اس درندے کے ہماؤ میں آکر پیچھے ہی پیچھے لڑکھڑاتا ہوا ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ تب اسے سنبھلنے کا موقع ملا۔ اتنی دیر میں اب وہ بھی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے سر سے شوکت کے سر پر ایک زوردار ٹکرا ماری۔ شوکت کا دماغ جھنجھٹا کر رہ گیا۔ اس کے سنبھلنے سے چلے ہی سر کی دوسری ٹکرا اس کی ناک پر لگی۔

ہوئے کہا۔ ”دیکھو! مریم کے سارے زیورات میں نے باندھ لئے ہیں۔ ان کی مالیت کم کم پانچ ہزار روپے ہے۔ سرحد تک پہنچنے کے لئے یہ روپیہ کافی ہے۔ ہم آج رات دوستوں کی طرح یہاں رہیں گے اور صبح یہ زیورات لے کر چلے جائیں گے۔“

باہر نے گٹھڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لاؤ! یہ گٹھڑی مجھے دے دو۔“ شوکت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جب ہم و دست بن گئے ہیں تو یہ زیورات کم کے پاس رہیں، کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ لے لے اسے تو بھاری رکھ لے۔“

یہ کہہ کر اس نے گٹھڑی باہر کی طرف اچھال دی۔ باہر نے اسے ہاتھوں میں روک لیا۔

”ہم چور، بد معاش اور قاتل ہیں لیکن کیا تجھے نہیں معلوم کہ چور اپنے گھر میں کچھ چوری نہیں کرتا اور یہ میرا گھر ہے؟ اس لئے کہ ایک معصوم بچی مجھے بھائی بنا کر یہاں لایا ہے۔ اگر تو دوستی برقرار رکھنا چاہتا ہے تو تو بھی اسے اپنا ہی گھر سمجھ کر ان زیورات کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔“

اس کی بات سنتے ہی شوکت کے تیور بگڑ گئے۔ اس نے فصے سے کہا۔ ”کیا تیرا دل خراب ہو گیا ہے۔ جہاں پہنچتا ہے، عورتوں اور لڑکیوں کو اپنی بہن بنا کر میرا نقصان کرتا ہے۔ میں یہ نقصان برواشت نہیں کروں گا۔ ابھی میں دھوکے میں مار کھا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تجھ سے کمزور ہوں۔ اگر تو بھلائی چاہتا ہے تو وہ گٹھڑی مجھے واپس کر دے۔“

باہر نے کہا۔ ”یہ زیورات ایک بہن کے سہاگ کی آبرو ہیں۔ میں اپنی بہن مددگار شادی میں اسے کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ پھر دوسری بہن کے زیورات چھین کر تجھے کچھ دے دوں؟“

اس کی بات ختم ہوتے ہی شوکت نے یکبارگی اچھل کر اس کے سینے پر لات مار دی۔ باہر کو اس حملے کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنے پیچھے ایک کرسی پر دست پڑا۔ شوکت بھاگتا ہو مریم کی طرف پہنچا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس بچی کو اٹھایا اور اس کی چھوٹی سی گردن میں اپنے دوسرے بازو کا پھندا ڈال کر کہا۔ ”باہر! تو جہاں ہے وہیں رک جا۔ اگر تو مجھے حملہ کرے گا تو اس سے پہلے ہی میں تیری اس منہ بولی بہن کو اتنی سختی سے دباؤں کا کہ

اس کا دم نکل جائے گا۔“

باہر ٹھک کر کھڑا رہ گیا۔ بوڑھے نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، میری بچی کو نہ مارو۔ میرے بڑھاپے کی یہی ایک معصوم ساتھی ہے۔ اس کے بدلے تم زیورات لے لو اور جو کچھ یہاں سے سمیٹ کر لے جانا چاہتے ہو، لے جاؤ۔“

باہر مریم کی جانب بے بسی سے دیکھتا رہا۔ شوکت نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”جہاں جاتا ہے کسی نہ کسی کو بہن بنا کر میرا کباڑا کرتا ہے۔ دیکھ! تیرے ہاتھ میں زیورات ہیں اور میرے قبضے میں تیری بہن۔ زیورات اپنے قبضے میں رکھے گا تو بہن کی ڈولی کبھی نہ اٹھے گی، تجھے اس کا جنازہ ہی اٹھانا پڑے گا۔ فیصلہ کر لے، بہن عزیز ہے یا زیورات۔“

مریم کی گردن اس کے بازو کے حلقے میں پھنسی ہوئی تھی اور وہ دیدے پھیلائے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ باہر نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”توجیت گیا، میں بار گیا۔ یہ زیورات لے اور مریم کو چھوڑ دے لیکن کیا ضمانت ہے کہ زیورات لینے کے بعد تو مریم کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟“

شوکت نے کہا۔ ”میں بھلا کیا ضمانت دے سکتا ہوں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نگے اس بچی کی جان لے کر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ البتہ یہ زیورات مجھے سرحد پار پہنچا دیں گے۔ میں دروازے کے باہر جاتا ہوں تو وہ گٹھڑی میری طرف پھینک دے۔ گٹھڑی ملنے ہی میں مریم کو کمرے میں چھوڑ کر دروازے کو باہر سے بند کر کے چلا جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کے باہر چلا گیا۔ دو دشمنوں کے درمیان تقریباً پندرہ فٹ کا فاصلہ قائم ہو گیا۔ باہر نے زیورات کی گٹھڑی اس کی طرف اس انداز میں اچھالی کہ وہ اس کے سر پر سے ہوتی ہوئی اس کے پیچھے جا گری۔ شوکت ذرا دیر کے لئے بہک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر سے گزرنے والی گٹھڑی کو دیکھا اور ایک ہاتھ اٹھا کر اسے لپکنے کی کوشش کی پھر اسی دھن میں گٹھڑی کی طرف پلٹ گیا۔ باہر کے لئے اتنا موقع کافی تھا۔ جب شوکت گٹھڑی اٹھانے کے لئے زمین پر جھکا تو اس کے سر پر قیاحت ٹوٹ پڑی۔ سر پر پڑنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ ڈنڈا جس نے اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مریم اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا گری۔ باہر نے اسے اتنا موقع نہیں دیا۔ ٹوٹے ہوئے ڈنڈے سے ہی اس کی مرحت کرنا راجحی کہ اس نے

بے ہوش ہو کر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ پھر وہ اسے کھینچتا ہوا اندر کمرے میں لے گیا۔
بوڑھے بابا سے ایک مضبوط رسی طلب کی اور بڑی مضبوطی سے اس کے ہاتھ پاؤں باہر
کر اسے فرش پر چھوڑ دیا۔

مریم باہر سے دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ کر بولی۔ ”تم کتنے بہادر ہو! اب
بھائی بھی بڑا بہادر ہے۔ اب تم میرے پاس ہی رہنا۔ جب من بنایا ہے تو چھوڑ کر
جانا۔“

بابا نے اسے میز پر بٹھا دیا اور کرسی پکڑتے ہوئے بولا۔ ”مجھ پر اپنی ایک بہن
محبت کا قرض ہے۔ اس قرض کی ادائیگی کے لئے میں تیریہ کے پاس جاؤں گا۔ مجھے افسوس
ہے کہ میں یہاں ٹھہر نہیں سکتا۔“

مریم نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ارے ہاں! میں تو بھول ہی گئی تھی
ابھی تم نے کہا تھا کہ تمہاری ایک بہن ہے۔ اس کا نام تیریہ ہے۔ کیا تم مجھے تیریہ کے پاس
لے چلو گے؟“

”وہ بہت دور رہتی ہے۔ دور نہ بھی ہو تب بھی میری پہنچ سے دور ہے کیونکہ
کی زندگی کا محافظ ایک پولیس انسپکٹر ہے اور میں ایک مجرم بھائی ہوں۔ پتہ نہیں اپنی
تک کیسے پہنچوں گا۔ جب میں راستہ نہیں جانتا تو تمہیں کس طرح دہاں تک لے جاؤں
ہوں۔“

استن میں بوڑھے نے ردی اور سالن کی پلٹیں میز پر رکھے ہوئے کہا۔ ”بیٹا بابا!
اسی طرح تمہارا سر کھاتی رہے گی۔ تمہارے کھانے کی اسے فکر نہیں ہے۔ دیے
معصوم کیا جانے کہ جیل سے بھاگنے والے کس طرح بھوکے پیاسے بھاگتے ہیں۔“

بابا واقعی بھوکا تھا۔ بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے بعد
بوڑھے نے کہا۔ ”تم نے مجھ بوڑھے پر جو احسان کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ تم
شریف آدمی ہو لیکن میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم مجرم کیسے بنے کیونکہ بعض
حالات ایک شریف آدمی کو جرائم کی پستی میں پھینک دیتے ہیں۔ دیے تم نے یہ بہت
کیا۔ قانون کے خلاف تمہیں جیل سے فرار نہیں ہونا چاہئے تھا۔“

بابا نے جواب دیا۔ ”میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔ آپ بتائیے کیا میں اسی لئے

ہوا ہوں کہ ساری زندگی ایک پنجرے میں بند رہ کر گزار دوں۔ تاکہ مجھ سے ایک قتل ہوا ہے لیکن سزا دینے والوں کا فرض تھا کہ فیصلہ سنانے سے پہلے ان سالات کو پیش نظر رکھتے، جنہوں نے مجھے قاتل بنا دیا تھا۔ انہوں نے یہ سوچنے سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ میں اصلاح کے قابل تھا۔ انہوں نے میرے جتنے کھیلے مستقبل کو جیل کی کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ میں یہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن جیل کی تمنا میں ہر لمحہ اپنی بہن کی یاد مجھے تڑپاتی رہی۔ میں سوچتا رہا کہ بہن اس جیل کے باہر ہے، مجھ سے زیادہ درد نہیں لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکتا، اس کی آواز نہیں سن سکتا۔ محبت کی یہ محرمیاں مجھے تارے ڈالتی تھیں۔ آخر میرے صبر کا پیمانہ چھٹک گیا، مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں جیل کی سلاخیں توڑ کر باہر آ گیا۔ لوگ دولت کی ہوس میں یا کسی عورت کے عشق میں قانون سے کھیلے ہیں لیکن مجھے تو ایک بہن کی پاکیزہ محبت یہاں تک لے آئی ہے۔ بابا! تم صرف میرے جرم کو دیکھتے ہو، میرے پیار کی پاکیزگی کو بھی تو دیکھو۔“

بوڑھے نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ہاں بیٹا! ہم محبت کی نظر سے دیکھیں تو قانون بہت ہی ظالم نظر آتا ہے۔ بعض اوقات ہم قانون کا احترام کرنے کے باوجود محبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی دیکھو تاکہ میرا فرض تو یہ تھا کہ میں اس علاقے کے تھانے سے مدد لیتا اور تمہیں قانون کے حوالے کر دیتا لیکن اس معصوم مریم کے وجود میں ہم دونوں کی محبت مشترک تھی۔ تم نے محبت سے مریم کی جان بچائی، اس کے زیورات بچائے، کیا میں تمہیں قانون کے ہاتھوں سے نہیں بچا سکتا؟ ایسے ہی مقام پر پہنچ کر محبت افضل ہو جاتی ہے اور قانون کانٹے کی طرح چبھنے لگتا ہے۔ بہر حال اب تم یہ بتاؤ کہ کہاں جاؤ گے؟“

بابا نے جواب دیا۔ ”میں جنگلوں میں بھٹکتا ہوا اس بستی کی طرف آ گیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہاں سے سمن آیا کتنی دور ہے۔“

بوڑھے نے کہا۔ ”سمن آیا تو یہاں سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے کیا تم ساری بہن اسی شہر میں رہتی ہے؟“

”ہاں۔ اسی شہر میں بیانی ہوئی ہے۔ مجھے وہاں جا کر معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کس محلے میں رہتی ہے۔ میں دن کے اجالے میں نہیں جاسکتا، رات کی تاریکی ہی سر زگار رہے گی۔ سوچتا ہوں جب پندرہ میل کا فاصلہ ہے تو ابھی کیوں نہ چلا جاؤں۔ کیا آپ مجھے پہننے۔“

لئے کوئی معقول سا لباس دے سکتے ہیں؟“

”ہاں‘ ضرور دے سکتا ہوں لیکن تم بہت زیادہ تھکے ہوئے ہو۔ میرا مشورہ ہے آج رات یہاں آرام کر لو۔ کل تمام دن میں تمہیں چھپا کر رکھوں گا۔ رات ہوتے ہی حسن آباد چلے جائے۔“

باہر نے کہا۔ ”نہیں بابا! منزل کے قریب پہنچ کر صبر نہیں ہوتا۔ میری ماریہ مجھ صرف پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔ میرا جانا ہی بہتر ہے۔“
بوڑھا ایک صندوق کے پاس گیا اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ”یہاں آکر دیکھ اس صندوق میں میرے جوان بیٹے کے کپڑے ہیں جو تمہیں پسند ہوں‘ پہن لو۔“

باہر نے صندوق کے پاس آکر ایک لباس نکالا اور اسے پہننے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ بوڑھے نے پوچھا۔ ”یہ بد معاش ابھی تم سے سرحد پار کرنے کی بات کر رہا تھا‘ کیا تم بھی اس ملک سے باہر چلے جاؤ گے؟“

باہر نے دوسرے کمرے سے جواب دیا۔ ”ہاں۔ آزادی کی سانس لینے کے لئے یہاں سے جانا ہی ہو گا۔ میں بہن کے ساتھ اس لئے نہیں رہ سکتا کہ میری بد قسمتی سے“
بہن کی خوش قسمتی سے اس کا خاندان ایک پولیس انسپکٹر ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جو قانون کے سائے میں اپنی بہن سے محبت کیسے کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر دل دکھتا ہے کہ ہمیں بہن کو جی بھر کر دیکھ بھی سکوں گایا نہیں۔“

وہ لباس پہن کر دوسرے کمرے سے نکل آیا۔ شوکت اب تک بے ہوشی کی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اسے اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد رہبر کی بندش سے قوراد نہیں ہو سکتا تھا۔ باہر نے کہا۔ ”بابا! تم اور مریم میرے ساتھ چلو۔ مکان کو باہر سے منتقل کر دو۔ میں حسن آباد کی طرف چلا جاؤں گا۔ تم تھانے میں بارہ بیان دینا کہ دو مفرد قیدی کیے بعد دیگرے تمہارے مکان میں داخل ہوئے تھے۔“
”بیٹی کے زیورات کے لئے آپس میں جھگڑا کر رہے تھے۔ جھگڑے کے نتیجے میں ایک نے دوسرے کو مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ پھر اسے رسی سے باندھ کر میرے مکان کے ایک کمرے میں چھوڑ گیا اور میری بیٹی کے زیورات لے کر بھاگ گیا۔“

بوڑھے نے چونک کر کہا۔ ”یہ کیا کہتے ہو بیٹا! کیا میں تم پر چوری کا جھوٹا الزام لگاؤں۔“

بابر نے کہا۔ ”مجھ پر جھوٹا الزام لگانا ہی ہو گا۔ اگر تم نے میری ہمدردی اور محبت میں میری حمایت کرتے ہوئے پولیس کو بیان دیا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ چونکہ تم اور مریم مجھ سے متاثر ہو اس لئے تم نے مجھے فرار ہونے کا موقع دیا ہے اور صرف ایک ہی مفرد ذہنی کو قانون کے حوالے کر رہے ہو۔“

بوڑھے نے اچکپاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے! تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ مریم کی زندگی اور اس کے زیورات کی حفاظت کی ہے۔ یہ زیورات یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ پھر میں کس زبان سے تمہیں چور کہوں۔“

”مجبوری سب کچھ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ شوکت گرفتار ہونے کے بعد بیان دے گا کہ زیورات کے لئے ہمارا جھڑا ہوا تھا اور تم بیان دو گے کہ میں تم سے زیورات چھین کر نہیں لے گیا تو پھر بات بگڑ جائے گی۔ پولیس والے تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ تفتیش کے دوران وہ تمہیں حراست میں رکھیں۔ ایسی صورت میں ننھی مریم میلنا تمہارے لئے کی گئی۔ کیا تم اپنی معصوم بچی کو بے یار و مددگار چھوڑ سکتے ہو؟ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ فی الحال مجھ سے ہمدردی نہ کرو۔ میں تو پہلے ہی بے شمار الزامات کا نشانہ بنا ہوا ہوں اور ایک سادی مجرم کہلاتا ہوں۔ اگر الزامات کے سمندر میں تم جھوٹ کا ایک چھوٹا سا کنکر پھینک دو گے تو کوئی بالکل نہیں بچے گی۔ ہاں یہ جھوٹ بول کر بھی تم مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہو۔“

”وہ کیا؟“ بوڑھے نے جلدی سے پوچھا۔

بابر نے کہا۔ ”تم اپنے بیان میں یہ نہ لکھو انا کہ بابر حسن آباد کی طرف گیا ہے۔ مجھے پولیس کے تعاقب سے بچانا چاہتے ہو تو انہیں کسی دوسری سمت لگا دینا۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے مریم کو ساتھ لے کر باہر آ گئے۔ بوڑھے نے مکان کے تمام دروازوں کو مقفل کرنے کے بعد اپنی جیب سے ایک ہزار روپے نکال کر بابر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے رکھ لو۔ میرے پاس اتنے ہی نقد روپے ہیں۔ شاید یہ تمہارے کام آجائیں۔“

”نہیں بابا! صرف پندرہ میل کا سفر ہے۔ میں پیسوں کے بغیر بھی وہاں تک پہنچ سکتا

ہوں۔“

وہ انکار کرتا رہا۔ بوڑھا بابا اصرار کرتا رہا کہ وہ باپ بن کر اسے روپے دے دے۔ اسے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے بے حد اصرار پر بابر نے اس رقم کو لیتے ہوئے کہ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ باپ محبت سے دے تو بیٹے کو انکار نہیں کرنا چاہئے اور بھائی محبت سے دے تو بہن کو بھی انکار نہیں کرنا چاہئے۔“

یہ کہہ کر اس نے مریم کو پکڑا، اس کی ہتھیلی کھوئی اور اس پر ایک ہزار روپے دیے۔ مریم نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہل ”بھائی میں ان پیسوں کی ایک خوبصورت بولنے والی گڑیا خریدوں گی۔“

بابر نے مریم کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر چوم لیا۔ پھر اسے فضا میں اسی طرح رکھتے ہوئے بولا۔ ”تو میری بولنے والی گڑیا ہے۔ یہ معصوم رشتے معاف ستھری محبت پاکیزہ جذبے جیل کی چار دیواری میں نہیں مل سکتے تھے۔ میں ایک آزاد پنچھی ہوں آزادی سے اڑتا ہوا اپنی ماریہ تک پہنچ جاؤں گا۔“

بوڑھے نے کہل ”خدا تمہیں ضرور منزل تک پہنچائے گا۔“

”بابا! عزم سفر ہو تو منزل مل جاتی ہے۔ کسی بزرگ نے کہا ہے کہ جب تم خانہ کعبہ کی طرف جاؤ، یا مسجد کی طرف جاؤ یا کسی بھی مقدس مقام تک پہنچنے کا عزم کرو تو رات میں نیکیاں کرتے جاؤ۔ میں بھی بہن کے مقدس دیار کی طرف جا رہا ہوں۔ میں بھی نیکو کرتا جا رہا ہوں اور دریا میں ڈالتا جا رہا ہوں۔ آج رات میں ضرور اپنی بہن تک پہنچ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر مریم کو چومنا پھر اسے بابا کی گود میں دے کر خود آباد کے راستے پر جانے لگا۔

بوڑھا بابا اسے سمجھا رہا تھا۔ بابر کو دد تک اس کی آواز بتا رہی تھی کہ اسے آباد پہنچنے کے لئے کن راستوں سے گزرنا چاہئے پھر بابا اور مریم دور رہ گئے اور دو آدھ بڑھتا چلا گیا۔ اب اس کے جسم پر جیل کے کپڑے نہیں تھے۔ ایک سادہ سا لباس تھا۔ اس کے باوجود وہ چہرے سے خطرناک نظر آتا تھا کیونکہ جیل کی پتھریلی زندگی نے اس کے چہرے کو بھی سخت اور کھردرا بنا دیا تھا۔ اس پر بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخی مائل بڑی آنکھیں رات کے دقت بڑی بھیانک لگتی تھیں۔

وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتا گیا۔ کبھی وہ تیز رفتاری سے چلتا تھا کبھی ایک ہرکارے کی طرح سست رومی سے ددڑاتا جاتا تھا۔ ہر قدم پر اس کی بہن قریب آتی جا رہی تھی۔ رات کے گیارہ بجے اسے شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

جب وہ شہر میں داخل ہوا تو وہاں رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حسن آباد اتنا بڑا شہر تھا کہ سمندر کی طرح اس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ ایک اجنبی کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنے بڑے شہر میں اپنی بہن کی رہائش گاہ ڈھونڈ نکالتا لیکن جس طرح پولیس تھانوں میں شہر کے تمام چوروں اور بد معاشوں کے پتے لکھتے ہوتے ہیں، اسی طرح ہر چور بد معاش کے دماغ کی چھوٹی سی ڈائری میں پولیس دالوں کے رہنے سنے اور اٹھنے بیٹھنے کے اوقات، مقالت اور مصروفیات کی معلومات درج ہوتی ہیں۔ وہ کسی بد معاش سے انسپکٹر مراد علی کا پتہ معلوم کر سکتا تھا۔

باہر نے وہاں پہنچ کر سب سے پہلے شراب اور جوئے خانے کا پتہ چلایا پھر وہاں کے ایک بد معاش سے انسپکٹر مراد علی کا پتہ دریافت کیا۔ اس بد معاش نے پتہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”میرے بڑوں میں ایک شخص محسن علی رہتا ہے۔ انسپکٹر مراد علی اکثر وہاں آتا رہتا ہے۔“ باہر نے کہا۔ ”محسن علی تو میرے چچا ہیں۔ تم میرانی کر کے مجھے وہاں تک پہنچا دو۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔“

وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے بد معاش نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یار چلیے تو ہماری برادری کے معلوم ہوتے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ پولیس دالوں کے رشتے دار ہو۔“

نقدیر ایسے ہی کھیل کھیلتی ہے۔ کبھی کبھی چور اور سپاہی کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیتی ہے۔“

اس بد معاش نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔ میں اپنے مکان کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہیں راستے میں محسن علی کے گھر کا پتہ بتا دوں گا۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اڑے سے باہر نکل آئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد باہر اپنے چچا محسن علی کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے مکان تک پہنچانے والا آگے بڑھ گیا تھا۔ باہر نے دروازے پر دستک دی۔ دستک کی آواز پر اس کے چچا ہی نے دروازہ کھولا پھر اسے

دیکھتے ہی چونک کر بولے۔ ”تم..... تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہاری چچی نے جسب سنا ہے کہ تم جیل سے فرار ہوئے ہو، تب سے وہ یہی کہہ رہی ہیں کہ تم بھاگ کر برا آدگے اور ہمارے لئے مصیبت بن جاؤ گے۔“

بابر نے کہہ۔ ”انکل! پہلے مجھے اندر تو آنے دیجئے۔ میں ابھی چلا جاؤں گا۔ کہ لوگوں کے لئے مصیبت نہیں بنوں گا۔“

اس کے چچا نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کی اجازت دی پھر دروازہ بند کرتے ہوئے کہہ۔ ”اگر مراد یہاں آگیا اور اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ہم اسے دیکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

”اس بات کو میں اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ آپ یقین کریں، اگر وہ ابھی کہا میں آپ لوگوں سے اپنا رشتہ ظاہر نہیں کروں گا۔ میں صرف ناریہ کو ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔ میں نے ایک جگہ سے مراد کا پتہ حاصل کیا ہے۔ آپ بتائیں کیا یہ پتہ درست ہے؟“

اس نے پتہ بتایا۔ اس کے چچا نے کہہ۔ ”پتہ درست ہے مگر تمہیں وہاں نہیں جانا چاہئے۔ کیا وہاں جاؤ گے تو مراد سے سامنا نہیں ہوگا؟“

”میں چھپ کر باؤں گا۔ وہاں میری ناریہ ہوگی۔ میں اسے دور سے دیکھوں گا۔ اگر وہ تنہا ہوئی تو اس سے دو باتیں کروں گا۔ اس سے ہمیشہ کے لئے دور جانے سے پہلے کہ میں دو باتیں کرنے کا بھی حقدار نہیں ہوں؟“

اس کے چچا نے کہہ۔ ”یہ دانش مندی نہیں ہے۔ تم جیل سے فرار ہو کر ایک پولیس انسپکٹر کے مکان میں داخل ہونا چاہتے ہو۔ اگر اس سے سامنا ہو گیا تو دو تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ کیا تم بھی اپنی بہن کے سہاگ کو نقصان پہنچا سکو گے؟“

”میں تمام راستے نیکیاں کرتا آیا ہوں۔ منزل پر پہنچ کر کسی کی برائی یا نقصان کب چاہوں گا۔ میں صرف اپنی بہن کے پتے کی تصدیق کرنے کے لئے آیا تھا۔ آپ اطمینان رکھیں، اگر مراد سے سامنا ہو گیا تو میں خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دوں گا۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ میری گرفتاری سے مراد کو ترقی ملے گی اور مراد کی ترقی سے میری بہن کو خوش حالی نصیب ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور خدا حافظ کہہ کر وہاں سے

☆-----☆-----☆

ماریہ ایک دم سے بیمار ہو کر بستری ہو گئی تھی۔ جب سے اس نے وہ فلم دیکھی تھی، تب سے اس کا یہی حال تھا۔ وہ کٹا ہوا ہاتھ کئی بار اس کی چشم تصور میں آچکا تھا۔ مراد اسے تفریح کے لئے لے گیا تھا لیکن وہ تفریح اسے مٹ گئی تھی۔ وہ سنیمال ہی میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ پہلے اسے منبر کے کمرے میں لے جا کر ہوش میں لایا گیا۔ گھر آنے کے بعد ایک ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا، دوائیں دیں، اسے حوصلہ دیا کہ اسے آن دیکھی چیزوں سے منور نہ نہیں ہونا چاہئے۔ ماریہ نے خود ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ ایک ہاتھ اکثر اس کے خوابوں اور خیالوں میں آکر اسے دہشت زدہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے سمجھایا۔ ”وہ محض ایک خیالی ہاتھ ہے۔ وہ تمہارے پاس کیسے آئے گا؟ حقیقتاً اس ہاتھ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پھر اس سے ڈرنا کیسا؟ پھر یہ کہ تم ایک پولیس انسپکٹر کی بیوی ہو۔ اگر کوئی تمہارا دشمن ہوا بھی تو وہ ایک پولیس انسپکٹر کے گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرے گا۔“

ماریہ نے نقاہت سے کہا۔ ”میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چلا۔ پھر کوئی بلا وجہ اپنا ہاتھ میری گردن تک کیوں لائے گا۔ یہ بات میں اچھی طرح سمجھتی ہوں اور اپنے دل کو اچھی طرح سمجھاتی ہوں، اس کے باوجود دہشت زدہ رہتی ہوں۔“

ڈاکٹر نے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں صرف وہم کی بیماری ہے۔ مراد صاحب! آپ انہیں تھانہ چھوڑیں۔ خصوصاً رات کے وقت ان کے پاس کسی کو موجود رہنا چاہئے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔ پھر درمیری رات کو بھی اس نے آکر ماریہ کو دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ زرد پڑ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے بدن سے خون نچوڑ لیا گیا تھا۔ اس کے اندر جو ایک آن دیکھا ہاتھ تھا، وہی اس کا لہو نچوڑ رہا تھا۔

ڈاکٹر مایوس ہو کر چلا گیا اور مراد سے کہہ گیا کہ ماریہ کے دماغ میں بچپن ہی سے خوف سلایا ہوا ہے۔ اس خوف کی جڑیں بہت گہرائی تک مضبوط ہو چکی ہیں۔ اس کے دماغ سے دہشت کو نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔

ڈاکٹر درست کہہ گیا تھا۔ واقعی وہ ناقابل علاج ہو گئی تھی۔ اب تو ہلکی سی آہٹ سن

کر چوٹک جاتی تھی۔ اگر دروازہ زور سے بند ہوتا تو اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگتا۔ مراد نے گھر کی ملازمہ کو تاکید کی تھی کہ وہ آہستگی سے دروازہ کھولے اور بند کرے۔ بیگم صاحبہ سو رہی ہوں تو چپ چاپ کمرے کی صفائی کر کے چلی جایا کرے۔

ملازمہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا مگر چپ چاپ کمرے میں آنا بھی منگنا پڑا۔ ایک بار ماریہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ پکار کر اٹھ بیٹھی تھی۔ بعد میں اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ کمرے میں ملازمہ ہے۔

اس رات بھی مراد ہمیشہ کی طرح ماریہ کے ساتھ خواب گاہ میں آرام کر رہا تھا۔ اسے مختلف لطیفے سنا کر اس کا دل بہلا رہا تھا۔ ٹھیک آدھی رات کو ایک سپاہی نے آکر دروازے پر دستک دی۔ مراد نے ماریہ سے کہا۔ ”میں باہر کا دروازہ کھولنے جا رہا ہوں میرے آنے تک ملازمہ تمہارے پاس رہے گی۔“

ماریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ بستر پر پڑی رہی۔ مراد نے ملازمہ کو باہر کمرے میں رہنے کے لئے کہا پھر باہر کا دروازہ کھولنے کے لئے وہاں سے چلا گیا۔ ماریہ گم صم پڑی ہوئی تھی۔ پچھلی رات سے اس کی یہی حالت تھی۔ وہ سو جتی زیادہ تھی اور بولتی کم تھی۔ وہ مراد کو سمجھا نہیں سکتی تھی کہ اس کا دل کس قدر کمزور ہو چکا ہے اور وہ کس طرح اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔

مراد نے کمرے میں آکر ماریہ سے کہا۔ ”اس وقت میرا اٹھانے پہنچنا بہت ضروری ہے۔ یہاں سے پندرہ میل دور جیل سے فرار ہونے والا ایک مجرم شوکت پکڑا گیا ہے۔“ اور باہر دونوں ایک ساتھ فرار ہوئے تھے۔ اب ہم شوکت سے یہ معلوم کر لیں گے کہ کس علاقے کی طرف گیا ہے۔“

ماریہ اپنے بھائی کا نام سن کر اٹھ بیٹھی۔ مراد نے سمجھا کہ وہ گھبرا رہی ہے۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ تم یہاں تنہا نہیں رہو گی۔ میں سپاہی کو بہل چھوڑے جا رہا ہوں۔ تمہارے پاس ملازمہ رہے گی اور باہر سپاہی سپرہ و قمار ہے گا۔ تم ڈرو گی تو نہیں؟“

ماریہ نے غمی میں سر ہلایا۔ مراد مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا چونکہ ملازمہ ٹینڈ سے اٹھ کر ماریہ کے کمرے تک آئی تھی اس لئے اس کی آنکھیں

میں نیند کا بخار تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک جبراً جاگتی رہی پھر آہستہ آہستہ ادغکنے لگی۔ ماریہ تھوڑی دیر تک اسے ہلاتی رہی تاکہ وہ کسی طرح جاگتی رہے لیکن وہ سو گئی اور کیوں نہ سوتی؟ اسے کسی کانوف تو نہیں تھا کہ ڈر کے مارے جاگنے میں ماریہ کا ساتھ دیتی۔

ماریہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سوچا کہ بیچاری بوڑھی عورت تمام دن گھر کا کام منبھالتی ہے۔ اس وقت اسے سونے کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ پھر بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دو فرس پر ملازمہ سو رہی تھی۔ بچھلی شب کی ہواؤں سے کھڑکیوں کے پردے لہرا رہے تھے۔ ان کی ہر لہر سے اسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کھڑکی کے راستے کوئی پردے کو ہٹا کر آ رہا ہو۔

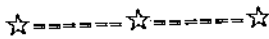
اور وہ آ رہا تھا۔ ایک کمرے سے گزرتے ہوئے اس نے قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو ٹھک کر رد گیا۔ اسے اپنا چہرہ بڑا ہی ڈراؤنا لگ رہا تھا سالانہ بد صورت نہیں تھا مگر حالات نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس نے سوچا۔ ”بہن سے پچھڑے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے۔ وہ مجھے نہیں پہچانے گی۔ رات کے وقت میرا یہ چہرہ دیکھ کر ڈر جائے گی اور اگر اس نے ڈر کر چیخ ماری تو گھر کے دوسرے لوگ اٹھ کر آجائیں گے۔ انسپکٹر مراد علی کو تو میں نے اس گھر سے جاتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اس کی طرف سے تو اطمینان ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟ جتنے بھی ہوں اگر انہوں نے شور مچایا تو مجھ پر مصیبت آجائے گی لہذا مجھے اچانک ہی ماریہ کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ پھر قریب پہنچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں گا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ تب اسے سرگوشی میں بتاؤں گا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ اس کے بعد بہن اپنے منہ پر محبت کا ہاتھ دیکھ کر اسے چوم لے گی۔“

دوسری طرف ماریہ اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے کھڑکی یا دروازے پر کھٹکا سا محسوس ہوا تھا۔ دل کی دھڑکنیں اچانک ہی تیز ہو گئی تھیں۔ خوف سے اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے قدم بڑھتی ہوئی دروازے کی طرف جا رہی تھی تاکہ سپاہی کو آواز دے کر اندر بلائے۔ اپنی خواب گاہ سے باہر نکل کر وہ دوسرے کمرے میں پہنچی۔ اس کمرے کے بعد ایک برآمدہ تھا۔ وہ برآمدے میں کھڑے ہوئے سپاہی کو اندر بلانا چاہتی تھی۔ اسی کمرے میں پیچھے سے بھائی آ رہا تھا۔

اس نے اپنی بہن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ”زندگی راستے میں عجیب موڑ آتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہاتھ محبت کے لئے دشمن کی طرف بڑھتا ہے کیونکہ پیچھے سے آنے والا ہاتھ ہمیشہ دشمن کا ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ بھی پیچھے بڑھ رہا ہے مگر یہ ایک بھائی کا ہاتھ ہے۔“

ماریہ ایک دم سے ٹھنک گئی۔ پہلے اسے اپنی گردن کے پیچھے بالوں میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی جیسے کوئی زہریلا سانپ رینگتا ہوا آ رہا ہو۔ اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا وہ ہاتھ اس کے بائیں کان کے پاس سے گزرتا ہوا ٹھوڑی کے نیچے آ کر ہتھیلی کا پالہ بن گیا۔ چھ برس کی ماریہ کے دماغ میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ اس دھماکے کی زد میں سولہ برس کی ماریہ آ گئی۔ بچپن سے جوانی تک خوف کا سفر مکمل ہو گیا۔ وہ چیخ بھی نہ سکی، بے کوار ہو گئی۔

ایک سرگوشی نے کہا۔ ”میری بہنا! میں تیرا بھائی باہر ہوں، شور نہ مچانا۔“ اس نے شور نہیں مچایا۔ محبت کے ہاتھ نے بار بار پیار سے دستک دی لیکن وہ پھر بولی۔



خوگرفتہ

انسان کی اچھی بری عادات بدلی جاسکتی ہیں لیکن کوئی عادت اگر فطرت بن جائے تو اسے بدلنا ناممکن ہے۔

ایک سیدھی سادی لڑکی کا دلچسپ قصہ، اسے نت نئے زیورات پہننے کی عادت تھی اور اس کے لئے دو کسی بھی حد تک جاسکتی تھی۔

وہ ایک دیوار کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے آدھے چہرے پر روشنی تھی اور
چہرہ تاریکی میں چھپا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا آدھا منہ اُجلا اور
کالا ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دیدہ بینا سے وہ کالک نظر نہیں آتی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے کشادہ سڑک کے اس پار جیولری کی ایک دکان تھی۔
دکان کے سامنے ایک سرخ رنگ کی کار آکر رک رہی تھی۔ کار ڈرائیو کرنے والی لڑکی
دیکھ کر وہ دیوار کی آڑ میں آگیا تھا۔ لڑکی بے حد حسین تھی۔ جب وہ کار سے باہر آئی
اس کا دلنشیں سر ہانپا نظر آیا۔ گہرے رنگ کی پھول دار میکسی اس کے بدن پر سج رہی تھی۔
سیاہ ذھنوں میں زرد رنگ کا پھول یوں لگ رہا تھا جیسے رات کو سورج نکل رہا ہو۔

شام کا وقت تھا۔ بادل چھانے کے باعث قہقہے پہلے ہی روشن ہو گئے تھے۔ روشنی
تاریکی کے سنگم پر وہ آدھا منہ سفید اور آدھا منہ کالا کئے کھڑا تھا۔ حسینہ کو دیکھتے ہی اس
کچھ شبہ سا ہوا۔ دماغ نے کہا اسے اس لڑکی کے پیچھے جانا چاہئے۔ جب دماغ حکم دیتا ہے
پاؤں اس راہ پر بے اختیار چل پڑتے ہیں۔ وہ کشادہ سڑک کو پار کرنے لگا۔

لڑکی اپنے پرس کو ایک اداے ناز سے شانہ پر رکھے جیولری کی دکان میں داخل
ہو گئی تھی۔ وہ کار کے پاس آکر ذرا دیر کے ملے رک گیا۔ لڑکی کا ملازم جو پچھلی سٹاپ
بیٹھا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل کر کار کو لاک کر رہا تھا۔ وہ ملازم پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر
جیولری کی دکان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ شو دینڈو کے شیشے کے اس پار لڑکی شوکیس پر جم
ہوئی زیورات پسند کر رہی تھی۔ دکان کے مالک نے مسکرا کر اس سے کچھ کہا۔ آواز باہر نکلا
نہ اسکی۔ لڑکی نے جواباً مسکرا کر سر ہلایا پھر وہ دونوں دکان کے پارٹیشن کے پیچھے چلے گئے۔

وہ چلی گئی تو نظارہ خالی ہو گیا۔ دکان کے باہر وہ کھڑا رہ کر سوچنے لگا۔ ”مہب کچھ ہوتا
والا ہے؟ لیکن کیا ہونے والا ہے۔ یا تو لڑکی سے دوستی ہو جائے گی یا پھر اس لڑکی کو کالک

حادثہ پیش آئے گا۔“

وہ کچھ دلوں سے محسوس کر رہا تھا کہ اس کا دماغ اندر سے بولا ہے۔ یوں تو سب ہی کے دماغ سوچ کی زبان سے بولتے ہیں لیکن اس کی بات کچھ اور تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ دماغ کے کسی چور خانہ سے آواز آتی ہے کہ یہ کرو۔ آگے بڑھو پیچھے ہٹو۔ فلاں پر شبہ کرو اور فلاں کے ہاتھوں میں جھکڑی پسندو۔ بس ایسی ہی ہدایت یا احکامات ملتے تھے۔ جیسے کوئی ٹیلی پیٹھی جاننے والا اسکے دماغ کو کبھی کنٹرول کر رہا ہو یا کبھی بے لگام چھوڑ رہا ہو۔

بہر حال دماغ میں کوئی چور تھا۔ اس چور نے اسے حکم دیا کہ اسے بھی دکان کے اندر پارٹیشن کے پیچھے جانا چاہئے۔ لہذا وہ دکان کے اندر پہنچ گیا۔ دکان کے منیجر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”فرمائیے!“

اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ”میں اس پارٹیشن کے پیچھے جانا چاہتا ہوں۔“

منیجر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام آصف حمزہ ہے۔“

وہ کارڈ ستا رہا تھا کہ آصف حمزہ انٹیلی جنس کا چیف آفیسر ہے منیجر کے ہاتھ میں وہ کارڈ کانپنے لگا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی کال کرتا ہوں۔ سیٹھ صاحب پارٹیشن سے باہر آجائیں گے۔“

اس نے ریسیور کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے ہی آصف حمزہ نے ٹیلی فون اور ریسیور کو اپنے ہاتھ کے چوڑے پنچے سے ڈھانپ دیا۔ ”کوئی کال یا کوئی اشارہ اُدھر نہیں پہنچنا چاہئے۔“

منیجر نے عاجزی سے کہا۔ ”ہماری عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ ایک بار معاف کر دیں۔ ہم آپ کا ہر مطالبہ پورا کریں گے۔“

”تم نے اس دروازے کو باہر سے لاک کیا ہے۔ میرا مطالبہ ہے کہ چابی میرے حوالے کر دو۔“

اس نے دراز کھول کر نوٹوں کی ایک بھاری گڈی آگے رکھ دی۔ آصف حمزہ کا دماغ پھر بولنے لگا۔ ”میں ایک ایمان دار افسر ہوں۔ رشوت قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے چابی

چاہئے۔“

اس نے فیبر کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچا پھر دو سرا ہاتھ اس کی جیب میں ڈال چابی نکال لی۔ اس کے بعد اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ پیچھے جا کر پارٹیشن کی دیوار سے ٹکرایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار کے دوسری طرف ایک سرو کی اذیت ناک کراہیں سنائی دیں۔ آصف حمزہ شوکیس کے ادھر سے چھلانگ لگا کر دروازے کے پاس پہنچا۔ پھر پھرتی سے چابی کے ذریعے دروازہ کھولا ہوا اندر پہنچ گیا۔ وہ چاقو لئے کھڑی تھی۔ چاقو پھل سے لہو نچک رہا تھا۔ دکان کا مالک اپنے لہو میں بھیگا ہوا فرش پر تڑپ رہا تھا۔ لڑکی اسے دیکھتے ہی شدید حیرانی سے پوچھا۔ ”آصف تم؟“

دماغ کے چور خانہ سے کوئی بولنے لگا۔ ”یہ لڑکی میرا نام جانتی ہے۔ میرا کام بھی جانا ہوگی۔ بہت دور تک پہنچی ہوئی ہے۔ اسی لئے تو قتل کرنا بھی آتا ہے۔“

یہ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”اچھا تو تم میرا نام جانتی ہو؟ لیکن میں تمہاری چم آوارہ لڑکیوں کو پہچاننا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”آصف! ایسا نہ کہو۔ اس وقت میں مصیبت میں ہوں۔ تم ہی مجھے قتل کے ارادے سے پہچا سکتے ہو۔“

یہ کہتے ہی اس نے میکسی کے دامن سے چاقو کے ہتھے کو پونچھ کر ایک حذر پھینک دیا۔

”اچھا تو تم ثبوت ضائع کر رہی ہو لیکن مجھ جیسے چشم دید گواہ کی آنکھیں کیسے ہٹا سکتی ہو؟“

وہ آگے بڑھی۔ پھر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”میں دشمنوں کی آنکھ پھونک سکتی ہوں مگر تمہاری یہ آنکھیں جو مجھے دیکھنے اور مجھے پہچاننے کے لئے ہیں۔ میں ان کی سلامتی کے لئے دسائیں مانگتی ہوں تاکہ ایک دن تم اپنی سالک کو پہچان سکو۔“

”سالک..... سالک..... سالک.....“ یہ نام اس کی کھوپڑی کے گنبد کو بجنے لگا۔ پھر اس کے دماغ نے کہا۔ ”غیس میں سالک نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ فراڈ ہے۔ مجھ پر اپنے سمن و شباب کا جال پھینک رہا ہے۔ مجھے ایک سراغ رساں کی داری پوری کرنی چاہئے۔“

اس وقت تک سائلہ نے اس کی گردن میں اپنی بانسوں کا ہار پٹنا دیا تھا۔ جال کی مہرقت مضبوط ہو رہی تھی۔ آصف حزمہ نے اس کی بانسوں کے ریشمی جال کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”دور ہٹو میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تم سے کوئی برا سلوک نہ کروں تو میرے سوالات کا سیدھی طرح جواب دو۔“

اتنے میں دکان کا منیجر اندر آچکا تھا۔ اپنے مالک کی لاش دیکھ کر وہ سکتے کے سالم میں کھڑا رہ گیا۔ آصف نے اس سے کہا۔ ”دکان کا شٹر گرا دو۔ کوئی گاہک یہاں نہ آنے پائے۔“

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں ابھی دکان بند کر دیتا ہوں مگر یہ قتل کا کیس جو گیلہ میں سجاد صائب کو سمجھاتا تھا کہ شراب اور شباب سے توبہ کریں۔ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ اب وہی انجام سامنے آگیا۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ آصف نے سائلہ سے پوچھا۔ ”اب بتاؤ کیا مقتول کا نام سجاد ہے؟“

”ہاں۔“ سائلہ نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتی تھی کہ یہ بری نیت سے مجھے یہاں لائے گا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میری پسند کا ایک سیٹ یہاں اندر رکھا ہوا ہے۔ میں یہاں دیکھنے آئی۔ اس نے مجھے لپٹانے کے لئے زیورات کی یہ الماری کھول دی۔“

آصف نے دیکھا۔ ایک طرف کھلی ہوئی الماری میں مونے چاندی، ہیرے موتیوں کے زیورات جگمگا رہے تھے۔ اس نے سائلہ کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ایسی جگہ پہنچ کر عورت کی حرص و ہوس برا چھہ برے مرحلہ سے گزر جاتی ہے یہی تم نے کیا۔“

”میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا۔ یہ میری عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ میں باہر جانے لگی تو یہ چاقو کھول کر کھڑا ہو گیا لیکن یہ ہوس کے مارے بوکھلایا ہوا تھا۔“

چاقو کھول کر آگے بڑھتے ہی لڑکھڑا گیا۔ میں نے اپنے پرس کو زور سے اس کے ہاتھ پر مارا تو چاقو گر پڑا۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ وہ گھبرا کر پارٹیشن کی دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھو اور کھڑا ہوا تھا۔ میں نے قریب آکر اس کے سینے کی طرف چاقو تان کر کہا۔ ”اب میرا راستہ روکو گے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ میرا قتل کا ارادہ نہیں تھا لیکن اسی وقت باہر سے پارٹیشن کی دیوار کو کسی نے دھکا مارا جس کے نتیجے میں یہ ادھر دھکا کھا

”کر چاقو کی نوک پر آگیا۔“

آصف حمزہ کو یاد آیا کہ اس نے منیجر کا گریبان پکڑ کر اسے دھکا دیا تھا اور منیجر اسی جگہ دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیوار کا معائنہ کیا۔ اس ہارڈ دیوار کے ایک طرف کیلیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ اندر کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو دھکا لگ سکتا تھا۔

اس کے دماغ نے کہا۔ ”سائلہ کا بیان درست ہو سکتا ہے۔ اگر وہ چاقو تیرا سجاد کا ہے۔“

اس نے میجر سے پوچھا تو تصدیق ہو گئی کہ چاقو میجر کا تھا۔ سائلہ نے کہا۔ ”امیر اب تمہیں یقین ہو جانا چاہئے کہ میرے ہاتھ کا چاقو مقتول کی طرف نہیں بڑھا تھا۔“

انسان کا داغ اس کا سب سے بڑا رہنما ہوتا ہے۔ وہ صحیح راہ بھی دکھا سکتا ہے اور غلط بھی۔ وہ اندر بیٹھ کر ہر حال میں بولتا ہے۔ لہذا وہ بولنے لگا۔ ”اگر میں فیجر کو دھکا دے تو وہ دیوار سے نہ ٹکراتا اور سجاد کا سینہ اس چاقو کی نوک پر نہ جاتا۔ ایسی صورت میں اس سالہ سے غیر ارادی طود پر قتل ہوا ہے تو اس قتل کا مرتکب میں بھی ہوں کیونکہ میں فیجر کو دھکا دے کر سجاد کو چاقو پر گرایا ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ نادانستی میں ہوا۔ تاہم اس غیر ارادی قتل کے عمل میں میں اور سالہ برابر کے شریک ہیں۔“

جب تک وہ سوچتا رہا میجر بولتا رہا۔ ”جناب آصف صاحب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا ہو گیا۔ آپ نے مجھے دھکا دیا تھا میں نے دیوار سے ٹکرانے کے بعد سجاد صاحب کراہیں سنی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت اس لڑکی نے انہیں قتل کیا ہے۔“

سائلہ نے کہا۔ ”اچھا تو آصفؔ نے تمہیں دھکا دیا تھا تب تو میرے بیان کی جڑ ثابت جو باقی ہے۔ قتل میں نے نہیں کیا اگر الزام مجھ پر آتا ہے آصفؔ! تو اس الزام تم بھی میرے برابر کے شریک ہو۔ آگے میرے ہاتھ میں چاقو تھا۔ پیچھے سے تمہارا ہاتھ کر دھکا تھا۔ اب بولو مجرم کون ہے؟“

دہ سوچنے لگا۔ کبھی کبھی دماغ فیصلہ کن انداز میں بول نہیں سکتا۔ اس لئے یہ
 آدھر سوچنا پڑتا ہے۔ منجر رونے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”جناب! سجاد صاحب ایک م

خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر اس مقدمہ میں یہ بات آئے گی کہ انہوں نے کسی لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا تو ان کی جوان بیٹیاں بدنام ہو جائیں گی۔ آپ کسی طرح اس معاملہ کو یہیں ختم کر دیجئے۔“

ساملہ نے اس کی تائید کی۔ ”ہاں آصف! یہ فیجر ہمارا ساتھ دے گا۔ اس معاملہ کو یہیں ختم کر دو۔ ہم دونوں خواہ مخواہ کے الزامات سے اور عدالتوں کے چکر لگانے سے بچ جائیں گے۔ میں پہلے بھی تمہاری تھی۔ یہاں سے نکل کر آئندہ بھی تمہاری رہوں گی۔“

یہ کہہ کر وہ اس کے بازو سے لگ گئی۔ بازو سے ایسا بدن لگا کہ آصف کا دل آپ ہی آپ دھڑکنے لگا۔ دماغ کے کینے سے ہی دل دھڑکتا ہے۔ ”اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے۔“

قتل کے مقدمہ میں پریشانیوں ہیں اور پیار کے مقدمہ میں آرام اور سکون ہے اس کی بات مان لینا چاہئے۔“

یہ سوچ کر اس نے کہا۔ ”قتل کو چھپایا نہیں جاسکتا کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ لاش کو کہیں چھپا دیا جائے۔“

”ہاں اگر ایسا ممکن ہے تو ضرور چھپا دینا چاہئے۔“

”ناممکن ہے۔“ فیجر نے کہا۔ ”یہاں کوئی تہ خانہ نہیں ہے کہ لاش چھپا دی جائے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ سجاد مرحوم عزت و احترام سے سپرد خاک کئے جائیں تو کوئی انہیں جوس پرست نہ کہے۔“

ساملہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”دراہ بڑے وفادار اور نمک حلال ملازم ہو۔ اپنے مالک کی عزت رکھنا چاہتے ہو اور میری عزت تو جیسے کوئی چیز ہی نہیں ہے۔“

فیجر نے کہا۔ ”میں آپ کی بھی عزت رکھنا چاہتا ہوں۔ آصف صاحب چاہیں تو اسے دیکھتی اور قتل کا کیس بنا سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ آپ دونوں یہاں مجھے اچھی طرح یاد دہ کر چلے جائیں۔ میں بعد میں پولیس والوں کو بیان دوں گا کہ چند آدمی معزز گاہک بن کر آئے تھے لیکن لباس کے اندر ریوالبور اور چاقو رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں پارٹیشن کے پیچھے جانے پر مجبور کیا ہم یہاں آئے تو پہلے انہوں نے مجھے رسیوں سے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ سجاد صاحب نے شور مچانے کی کوشش کی۔ انہوں نے۔ اتو سے ہلاک کر دیا۔“

سانلہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”بہت عمدہ تدبیر ہے۔“ وہ پھر آصف سے پلٹ کر
”ہاں آصف! جلدی اس کی بات مان لو۔“

وہ میرے کی کئی تھی۔ دیکھتا ہوا انگارہ تھی۔ انگارہ جہاں جہاں بدن سے چپکنا
حصوں کو جلاتا ضرور ہے۔ آصف کا ہاتھ بے اختیار اس کی کمر کے خم پر آگیا۔ جیسے
ہو۔ ”اور جلاؤ.....“

سانلہ اسے بوجھ دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ شکاری کو اپنے آپ پر اتنا اعتماد ہوتا ہے
وہ اعتماد سے بولی۔ ”اسے زکیتی کا کیس بھی بتانا ہے۔ اس لئے میں یہاں سے اپنی پندرہ
زیورات سمیٹ کر لے جاؤں گی۔“

منیجر نے کہا۔ ”میں اپنے مالک کی زندگی میں نمک حلال اور دفاوار رہا مجھے
دفاواری کا کچھ ضلہ ملنا چاہئے۔ جتنا مال آپ یہاں سے لے جائیں گی۔ اس کے تین
ہوں گے۔ ان میں سے ایک حصہ آپ ابھی میری گھر والی کے پاس پہنچائیں گی۔ مل گوا
پتہ بتا رہا ہوں۔ آسان ہے آپ یاد کر لیں۔“

اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔ سانلہ نے پتہ یاد کرنے کے بعد وعدہ کیا۔ ”میں ایک
گھنٹہ کے اندر تمہارا حصہ تمہاری بیوی کے پاس پہنچا دوں گی۔“

”دیکھئے سانلہ صاحبہ! میں اور آصف صاحب آپ کو قتل کے الزام سے بھاری
ہیں۔ اگر حصہ پہنچانے میں بے ایمانی ہوگی تو میں بعد میں اپنا بیٹان بدل دوں گا۔ ان سے
کہوں گا کہ سانلہ اور آصف حمزہ صاحب نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں آپ دونوں
ذکر نہ کروں۔ ورنہ آپ لوگ میرے بچوں کو بھی ہلاک کر دیں گے۔ میں اپنے بچوں
نہیں چاہتی۔ ذکر کے بعد صحیح بیان دے رہا ہوں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا کہ میں
آسانی سے اپنا بیٹان بدل سکتا ہوں۔“

وہ سمجھ گئی۔ بستر کی چادر اٹھا کر کھلی ہوئی الماری کے پاس بچھادی پھر سونے چلا
اور بے موتیوں سے بنے ہوئے زیورات اٹھا کر چادر پر رکھنے لگی۔ دس منٹ
جب ان نے گھڑی باندھ کر آصف کو دیکھا تو وہ منیجر کو اچھی طرح باندھ کر فرش پر
گھڑی بنا چکا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر پیٹی باندھ دی گئی تھی۔

وہ دونوں زیورات کی گھڑی اٹھا کر دروازے کے پاس آئے۔ اسے ایک طرف

رکھ کر دروازے کا شٹر گرا ہوا تھا۔ آصف شوکیس پر چڑھ کر دینی لیٹر سے باہر جھانکنے لگا۔ باہر قلعے ردشن تھے۔ کشادہ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ اس دکان کے فٹ پاتھ پر بھی لوگ چل رہے ہوں گے۔ جو نظر نہیں آرہے تھے۔ سائلہ کا ملازم کار کے پاس کھڑا انتظار کر رہا تھا۔

آصف نے شوکیس سے اترتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مجھے مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ ابھی ہم باہر نہیں نکل سکتے۔“

وہ پیار سے اس کا بازو تھام کر بولی۔ ”میں مصیبت نہیں تمہاری محبت ہوں، افسوس کہ تم مجھے پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔“

آصف نے پہلے تو اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانک کر دیکھ۔ دماغ نے کہا۔ ”نہیں! میں اسے نہیں پہچانتا۔“ پھر اس نے سائلہ کے رخسار کی لالی کو اور لیوں کی پگھلیوں کو چھو کر دیکھ۔ دماغ کے چور خانہ سے کسی نے کہا۔ ”یہ چہرہ میں دیکھ چکا ہوں۔“

مثلید ایک بار دیکھا ہے۔ اس لئے بھول گیا ہوں مجھے پہچاننے کی کوشش کرنا چاہئے۔“

وہ اسے اپنے بازوؤں میں لئے پہچاننے لگا۔ سائلہ نے سانسوں کی لچل میں پوچھا۔ ”ہم یہاں سے کب نکلیں گے؟“

وہ لچل مچاتی ہوئی سانسوں میں بولا۔ ”نکل جائیں گے پہلے مجھے پہچاننے دو.....“

شٹر کے پیچھے دکان کے اندر خاموشی چھا گئی۔ ان دونوں کے پیچھے شوکیس تھا۔ شوکیس کے پیچھے دیوار تھی اور دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر جلی ہندسوں میں انیس سو ساٹھ لکھا ہوا تھا۔

☆-----☆-----☆

مینٹل ہسپتال کی ایک دیوار پر ایک کیلنڈر آویزاں تھا۔ اس پر جلی ہندسوں میں انیس سو ساٹھ لکھا ہوا تھا اور کیلنڈر کا ورق دسمبر کا مہینہ بتا رہا تھا۔

مینٹل ہسپتال کے پیچھے ایک پاگل خانہ تھا۔ اس کے ایک آپریشن تھیٹر میں ایک حسینہ ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں چمڑے کے تسموں سے بندھے ہوئے تھے۔ بیڈ کے اطراف دو زنانہ پولیس ایک لیڈی ڈاکٹر اور ایک اسسٹنٹ نظر آرہے تھے۔

بیز پر لیٹھا ہوئی حسینہ سینے سے شرابور تھی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے اسے دماغی جھٹکے

پہنچائے گئے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر ایک تویہ سے اس کے چہرے اور گردن کا پیمندہ پونچھ رہی تھی۔ پھر ڈاکٹر کا اشارہ پا کر دونوں پولیس عورتیں اس کی بندشوں کو کھولنے لگیں۔
ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ نقاہت سے بولی۔ ”میرا نام سائلہ ہے۔“

”تم اپنا نام یاد رکھتی ہو مگر یہ یاد نہیں رکھتیں کہ تمہاری ایک خراب عادت کتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔“

”مجھے شک نہ پہنچاؤ۔ اب یاد رکھوں گی۔“

”سناؤ، تمہاری عادت یا تمہاری کمزوری کیا ہے؟“

”زیورات.....“ وہ ایک گہری سانس چھوڑتی ہوئی بولی۔

”کیا تم زیورات کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں؟“

”رہ سکتی ہوں۔ اب میں کسی عورت کا زیور نہیں اتاروں گی۔“

”تم نے پہلے بھی وعدہ کیا تھا۔ تمہاری باتوں اور طور طریقوں سے پتہ نہیں چلا کہ نہ پاگل ہو۔“

”پاگل نہیں پگی کہو۔ ڈاکٹر تمہاری گرامر درست نہیں ہے۔“

ڈاکٹر نے جھینپ کر لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”شاہانہ سائلہ! تم تو بہت ذہین ہو۔ دوسروں کی غلطیاں پکڑ لیتی ہو۔ کیا اپنی ایک غلطی سے باز نہیں آ سکتیں؟“

”میں باز آگئی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔“

”ایک ماہ پہلے تمہیں نارمل سمجھ کر چھٹی دے دی گئی تھی۔ ایک ماہ تک تم بالکل ٹھیک رہیں۔ صرف اپنے زیورات پر صبر کرتی رہیں۔ تین دن کے بعد تم نے بیگم حشمت بیگم کے زیورات پر ہاتھ صاف کیا۔ گیس سلنڈر کو کھول کر انہیں کچن میں بند کر دیا۔ یہ نہیں جانتی تھیں کہ تمہیں عارضی رہائی دی گئی تھی اور ہمارا ایک آدمی برابر تمہارا گھرائی کر رہا تھا۔ اگر وہ موقع پر تمہیں گرفتار نہ کرتا اور کچن میں نہ پہنچتا تو گیس کی زیادہ سے بیگم حشمت بیگم کا دم گھٹ جاتا۔“

سائلہ نے کہا۔ ”میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ ان کے گلے سے ہار اتارنے

وقت دو مجھ سے الجھ رہی تھیں۔ میں تے ہار اتارتے ہی انہیں دھکا دیا۔ وہ سنڈر سے جا کر نکرائیں۔ سر پر چوٹ لگتے ہی بے ہوش ہو گئیں۔ شاید ان کے ٹکرانے سے سنڈر کی چابی گھوم گئی تھی۔“

”کچھ بھی ہو۔ تمہیں زیورات سے اتنی محبت ہے کہ تم نے اس بے ہوش عورت سے ہمدردی نہیں کی۔ کچن کا دروازہ بند کر کے بھاگنے لگیں۔ اگر عین وقت پر وہ نہ آ جاتا تو تم ایک نیکس کے لالچ میں قاتل بن جاتیں۔“

”چلو یہ تو ثابت ہو گیا کہ میں بیگم صاحبہ کو ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”ہاں بیگم حشمت بیگ کے بیان سے تم بچ گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ تم نے گیس آن نہیں کی تھی۔ سنڈر سے ٹکرانے کے بعد بھی وہ چند لمحوں تک ہوش میں رہیں۔ وہ باہنی تھیں کہ ان کا ہاتھ لگنے سے سنڈر کی چابی گھوم گئی ہے۔ وہ گیس کو سناڑج ہونے سے روکنا چاہتی تھیں مگر اسی لمحہ ان کا سر چکرا گیا لیکن ہم یہاں بیگم حشمت کی نہیں تمہاری باتیں کر رہے ہیں۔ تم کب تک الزامات سے بچتی رہو گی۔ اگر چوری اور چھینا جھٹی کے دوران کسی کی جان جائے گی تو تم قاتل کہلاؤ گی۔“

”قاتل نہیں قاتلہ کہو۔ لیڈی ڈاکٹر تمہاری گرامر بھی درست نہیں ہے۔“

اس بار لیڈی ڈاکٹر جھینپ کر ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”سائلہ! تم بہت بڑی فراڈ ہو۔ ہم تمہاری بھلائی کے لئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تم ایک نارمل لڑکی مگر لیکن تمہارا وکیل عدالت میں ایسے ٹھوس دلائل پیش کر کے تمہیں ذہنی مریضہ ثابت کرتا ہے کہ تمہیں جیل خانہ کے بجائے پاگل خانہ بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں تم پاگل خانہ کے ایک کمرہ میں آکر آرام فرماتی رہتی ہو۔“

”ڈاکٹر! تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ تم مجھے اب سے پہلے بھی بجلی کے جھٹکے پہنچا چکے ہو۔ میں ایسے اذیت ناک جھٹکے برداشت کرنے کے لئے جان بوجھ کر پاگل خانہ میں نہیں آسکتی۔“

”اپنی علوت سے مجبور ہو کر اپنا شوق پورا کرنے کے لئے بعض لوگ پھانسی کے تحت پر پہنچ جاتے ہیں۔ زیورات کو دیکھ کر تم پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔“

”تو پھر تم کس مرض کی دوا ہو ڈاکٹر۔ جب تم دیکھ چکے ہو کہ دماغ کو جھٹکے پہنچانے

کے باوجود میرا یہ جنون نہیں جاتا تو پھر دوسرا طریقہ علاج کیوں نہیں اختیار کرتے؟“ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ”پلیز ڈاکٹر! آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ سائلہ فراڈ ہے۔ یہ ہمارے لئے صرف ایک مریضہ ہے۔ اس کے وکیل نے عدالت میں جو باتیں وہ سب درست ہیں۔ یہ دوسری عورتوں سے زیورات ضرور چھینتی ہے لیکن کچھ شوق سے پہننے کے بعد مختلف ذرائع سے انہیں واپس کر دیتی ہے۔ پولیس رپورٹ کے حق میں ہے۔ رپورٹ کا متن یہ ہے کہ سائلہ چور نہیں، صرف ذہنی مریضہ ہے۔“ اور ہم ڈاکٹر نہیں گھسیارے ہیں۔“ ڈاکٹر نے چڑ کر کہا۔ ”میں دعوے سے ہوں کہ یہ فراڈ ہے۔“

”فراڈ نہیں، فراڈن کو۔ تذکیر و تانیث کا خیال رکھا کرو۔“

ڈاکٹر نے بولنے کے لئے منہ کھولا مگر غصہ کی زیادتی سے سمجھ میں نہیں آ سکا۔ اس نے منہ بند کر لیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے سائلہ کو مخاطب کیا۔ ”سائلہ! جب تم حشمت کا نیپلس چھین کر فرار ہونا چاہتی تھیں۔ تب کچن کے باہر ہمارے ایک آدمی تمہیں پکڑ لیا۔ بتاؤ کہ تم نے اس آدمی کو دیکھتے ہی کیا کہا تھا؟“

”میں اسے دیکھتے ہی حیرانی سے بولی، آصف تم؟“

”اس کا نام راشد ہے۔ تم نے اسے آصف کیوں کہا؟“

”اس لئے کہ یہ میرے محبوب کا نام تھا۔ کیا آپ نے میری ڈائری نہیں پڑھی؟“

لیڈی ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کے ہاتھ سے ایک ڈائری لے کر کہا۔ ”تمہاری ڈائری میں لکھا ہے کہ ایک بار تم سیٹھ کریم کی کوٹھی سے زیورات کا ایک سیٹ لے کر فرار ہو رہی تھیں۔ اگر ایک نوجوان تمہیں اپنی کار میں لفٹ نہ دیتا تو تم پکڑی جاتیں۔ اس سے متاثر ہو کہیں اس کا نام آصف جمال تھا۔“

سائلہ نے کہا۔ ”ہاں، میں اس سے متاثر ہو گئی تھی مگر وہ یو۔ کے سے آیا تھا۔ ملاقاتوں کے بعد واپس چلا گیا۔ پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ اب چوری کرنے کے بعد کوئی نوجوان میرے سامنے آتا ہے تو میں اسے آصف کہتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے آصف کہتے ہی وہ مجھے پیار کی بانہوں میں سمیٹ کر چوری کے الزام سے بچا کر لے جائے گا۔“ لیڈی ڈاکٹر نے سوال کیا۔ ”یعنی تمہیں آصف جمال کا پورا نام اچھا نہیں لگتا؟“

آصف جمال نظر آ رہا تھا۔

☆=====☆

آصف جمال سے وہ دوبار مل چکی تھی۔ وہ بہت ہی مختصر ملاقاتیں تھیں۔ پہلی ملاقات میں آصف جمال نے اسے اپنی کار میں لفٹ دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زیورات کے دو ڈبے تھے اور وہ شخص اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ بہر حال جب کار آگے بڑھ گئی اور اس کا تعاقب کرنے والے پیچھے رہ گئے تو آصف جمال نے ڈرائیو کرنے کے دوران اپنا ایک ہاتھ سائلہ کے زانو پر رکھ دیا۔ وہ فوراً ہی دروازے کی جانب کھسک گئی۔

بعض لوگ اچھے لگتے ہیں مگر ان کی بے باکی اور جلد بازی اچھی نہیں لگتی۔ آصف جمال نے مسکرا کر کہا۔ ”میں یو۔ کے سے آیا ہوں۔ انگلینڈ میں لڑکیاں برا نہیں مانتیں۔“ وہ خاموش رہی۔ اس نے پوچھا۔ ”بائی وی دے۔ وہاں دو آدمی تمہارا پیچھا کر رہے تھے؟“

سائلہ نے جواب دیا۔ ”مشرقی لڑکیاں برا مان جائیں تو مرد اسی طرح پیچھا کرتے ہیں۔“

”تم مجھ پر طنز کر رہی ہو۔“

”نہیں، تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ لفٹ نہ ملتی تو وہ پکڑ لیتے۔ اب اس احسان کے بدلے تم مجھے پکڑنا چاہتے ہو۔“

”میں دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ کل رات کی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا۔ کیا ہم تھوڑا وقت ساتھ نہیں گزار سکتے؟“

”یہاں شریف گھرانے کی لڑکیاں رات کو نہیں گھومتیں۔ میں کل صبح ملاقات کروں گی۔“

اس نے خوش ہو کر سائلہ کا پتہ پوچھا۔ مگر سائلہ نے گھر کا پتہ نہیں بتایا۔ اس سے گارڈن میں ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی۔ گھر پہنچ کر وہ تمام رات آصف جمال کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ اسے اچھا لگا تھا لیکن اچھا لگنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ایک پرسکاپ پر بھروسہ کر لیتی۔

دوسرے دن گارڈن میں ملاقات ہوئی تو آصف جمال نے ایک اخبار اس کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہل۔ ”یہ خبر پڑھو۔ پولیس ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں ہے جو پرنس کی ایک کوشی سے زیورات چرا کر بھاگی ہے اور وہ تم ہو۔ کل رات میں نے تمہارے ہاتھ میں زیورات کے دو ڈبے دیکھے تھے لیکن انہیں اہمیت نہیں دی تھی۔“

سانکھ وہ خبر پڑھ کر پریشان ہو گئی۔ آصف جمال نے طنزیہ انداز میں کہل۔ ”کیا مشرقی لڑکیوں کی پارسائی جتنا ہی تمہیں۔ کیا مشرقی لڑکیوں اس طرح چوری کرتی ہیں؟“ وہ ندامت سے بولی۔ ”میں چور نہیں ہوں۔ پتہ نہیں زیورات کو دیکھ کر مجھے ہو جاتا ہے۔ میرا دماغ میں ایک ہی ضد کرتا ہے کہ میں وہ زیورات پہن لوں۔ اس میں چھپنے چھپنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ کچھ روز انہیں پہننے کے بعد دل بھر جاتا ہے۔ میری بھالی اور بھائی جان ان زیورات کو اصل مالک تک کسی نہ کسی طرح چپکے سے دیتے ہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بھالی اور بھائی جان تمہاری اس چوری کی حالت چھپا کر تمہیں شہ دیتے ہیں۔“

”نہیں، وہ بھی میری اس حالت سے پریشان ہیں۔ مجھے سمجھاتے ہیں کہ ایسا کرنا چاہیے اور بب ایسا کرتی ہوں تو اپنی بدنامی کے ڈر سے مپ چاپ چوری کا مال دلو کر دیتے ہیں۔“

”تم اپنے بھائی جان کے ساتھ رہتی ہو؟“

”نہیں۔ اپنے ویڈی کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ اب اپنی کوشی پر تنہا رہتی ہوں۔“

”تو پھر چلو۔ ہم اس کوشی میں وقت گزاریں گے۔“

”نہیں آصف! آج تک کوئی غیر مرد میری کوشی میں نہیں گیا۔ میں اسے پسند نہیں کرتی۔“

”میں تو پسند کرتا ہوں۔ دیکھو میں تمہارا رازدار ہوں۔ تمہیں پولیس کے حوالہ نہیں کروں گا۔ بس میرا دل خوش کر دو۔“

”تم مجھے بے سار لڑکی سمجھ کر میری توہین کر رہے ہو۔“

”یہ فضول باتیں ہیں۔ انگلینڈ میں کوئی شخص کسی لڑکی کے ساتھ اتنا وقت نہ

نہیں کر رہے۔ معاملات فوراً طے ہو جاتے ہیں۔ جلدی فیصلہ کرو ورنہ میں تمہیں پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔

وہ تھوڑی دیر تک پرمیٹائی سے سوچتی رہی پھر کار کی اسٹیرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ آصف جمال نے پوچھا۔ ”کیا تم ڈرائیو کرو گی؟“

”ہاں۔ میں تمہیں اپنی کوٹھی میں لے جا رہی ہوں۔ مجھے ہی ڈرائیو کرنا چاہئے۔“ وہ دوسری طرف سے گھوم کر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ راستے میں آصف جمال عشق و محبت کی باتیں کرتا رہا۔ بب گاڑی ایسے راستے سے گزرتے گئی۔ جہاں ٹریفک برائے نام تھی تو اس نے اپنا ہاتھ سالک کے زانو پر رکھ دیا۔ سالک نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری طرف کا دروازہ اچھی طرح بند نہیں ہوا ہے۔“

”نہیں، اچھی طرح بند ہے۔“

”میں ڈرائیو کر رہی ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اچھی طرح بند نہیں ہے۔“

دروازے کو دوبارہ کھول کر بند کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ اس نے سالک کی بات رکھنے کے لئے دروازے کو کھولا۔ اسی لمحے اسٹیرنگ ایک جھٹکے سے گھوم کر پھر سیدھا ہو گیا۔ آصف جمال کی چیخ سنائی دی۔ وہ کار سے باہر جا چکا تھا۔ سالک نے بہت دور جا کر کار روکی۔ اس کا دروازہ بند کیا۔ پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

یہ واقعہ وہ اپنی ڈائری میں لکھ چکی تھی لیکن وہ حیران تھی کہ جہاں جہاں اس نے آصف جمال لکھا تھا وہاں اب ڈائری میں آصف حمزہ لکھا ہوا تھا۔ مزید حیرانی کی بات یہ کہ اس کی ڈائری سے آصف جمال کی تصویر برآمد ہوئی تھی۔

اب اس کے ایک ہاتھ میں ڈائری تھی اور دوسرے ہاتھ میں وہ تصویر تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے پیار سے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”سالک؟ اپنے ذہن کو زیادہ نہ الجھاؤ۔ اگر آصف حمزہ تمہاری ڈائری میں آیا ہے تو کسی دن تمہاری آنکھوں کے سامنے بھی آجائے گا۔ تب تم ہی سے بہت کچھ معلوم کر سکو گی۔ جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔“ دونوں کانٹیل عورتیں سالک کے اطراف آکر کھڑی ہو گئیں۔

☆-----☆-----☆

دکان کا شٹر گرا ہوا تھا۔ سانکھ نام کی عورت آصف حمزہ کے بازوؤں میں سکی اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسی لمحہ اسے لیڈی ڈاکٹر کی بات یاد آئی۔
نے کہا۔ ”سانکھ! یہ بات یاد رکھنا۔ ایک سراسر غریب ہمیشہ تمہاری نگرانی کرتا رہے گا۔“

یہ وہی سراسر غریب ہو سکتا تھا اور یہ لیڈی ڈاکٹر کی شرارت ہو سکتی تھی۔ یہ نفسیاتی طریقہ علاج ہو سکتا تھا کہ سانکھ پہلے آصف حمزہ کی تصویر دیکھ کر متاثر ہو جائے۔ جب اس سے سامنا ہو تو ایک چور لڑکی کی بجائے محبوبہ بن کر اس کے بازوؤں میں جائے۔

وہ آصف حمزہ کے بازوؤں میں کسمانے لگی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ کیا آصف حمزہ سے کیسے متاثر ہو رہی ہے؟ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا تم اب میری نگرانی کر رہے تھے؟“

”نہیں۔ میں نے آج ہی تمہیں دیکھا ہے۔ تم اس دکان کے سامنے کار روک کر اسٹینڈنگ سیٹ پر بیٹھی محتاط نظروں سے آس پاس دیکھ رہی تھیں۔ میں سامنے والی عمارت کے پاس چھپا ہوا تھا۔ مجھے تم پر شبہ ہوا۔ اس لئے میں یہاں چلا آیا۔ بعض اوقات مجھے لگتا ہے جیسے میں پیدا انٹی جاسوس ہوں۔ سیرا ویلج جس کے خلاف شبہ ظاہر کرتا ہے۔ آٹا میں وہ مجرم ثابت ہوتا ہے۔“

”سچ بچ بتاؤ۔ تم اپنا فرض نبھائو گے یا سہرا ساتھ دو گے؟“

”اگر میں تمہارا ساتھ نہ دیتا تو اب تک تم پولیس اسٹیشن میں نظر آتیں۔“

دو خوش ہو کر اپنے پیار کی دھوٹ دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر شوکیں پہن گیا اور دفعتی لیٹر کے باہر جھانکنے لگا۔ اب دو کشادہ سڑک ویران ہو چکی تھی۔ سانکھ ملازم کار کے قریب سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ آصف حمزہ نے شوکیں سے اترتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا ملازم بڑے صبر و استقلال سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

”وہ ملازم نہیں میرے.....“ دو کتے کتے ٹھٹھک گئی۔ پھر ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ”میرے بھائی جان ہیں۔“

سی۔ کم از کم مجھے سمجھانا تو چاہئے کہ یہ بری عادت ہے۔“

یہ سوچ کر اس نے کہل ”سائلہ! تمہارے بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر عادت سے تمہیں باز آنا چاہئے۔ تمہاری اداؤں نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ نہیں آتا کہ مجھے کس حد تک تمہارا ساتھ دینا چاہئے۔“

وہ کھٹک گئی۔ ”اچھا تو یہ وہی ڈاکٹروں والی فصیحیتیں کر رہا ہے۔ اگر میں اس کی باتیں مانوں گی تو یہ میرا ساتھ نہیں دے گا۔ پھر میں یہ سارے زیورات پہن کر بازار پورا نہیں کر سکوں گی۔“

شوق کی بات آئی تو اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ارمن غدیہ کی طرح بچھلنے لگے۔ ”میں پہنوں گی میں ایک ایک کر کے سارے زیورات پہنوں گی۔ مجھے نہیں روک سکتا۔“

دماغ ضد کر رہا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ آصف حمزہ ڈلیش بورا۔ اس کی ڈائری کھول کر پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے حیرانی سے کہل ”اس میں میرا نام لکھا ہے۔“

سائلہ نے ایک سرو آہ بھرتے ہوئے کہل ”ہاں۔ میری محبت کا یہ ایک ثبوت۔ کہ میں پہلے بھی تمہیں چاہتی تھی۔ اب بھی تمہیں چاہتی ہوں مگر تم مجھے زیور پہنے نہ دیکھ سکتے۔“

”کیوں نہیں۔ زیورات پہن کر تمہارے سمن کو چار چاند لگ جائیں گے لیکن زیورات خرید کر پہنے جاسکتے ہیں۔“

”میں خرید سکتی ہوں مگر چھین کر پہننے میں جو ایڈ دینگر ہوتا ہے ایک طرح کی قہر ہوتی ہے۔ اس کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ تم میری بات کو نہیں سمجھ سکو گے۔“

”میں صرف یہ سمجھتا ہوں کہ ایک جاسوس کو صرف جرائم کی روک تھام چاہئے۔“

وہ پھر کھٹک گئی۔ ”کھٹ کھٹ کھٹ“ بیسے دروازہ کھلا رہ گیا ہو اور ہوا کا جو کھٹ سے لگ کر کھٹ کھٹ بج رہا ہو۔ وہ فوراً ہی بولی۔ ”آصف! تم نے اپنی طرف دروازہ اچھی طرح بند نہیں کیا۔“

”نہیں۔ یہ اچھی طرح بند ہے۔“
 ”میں ڈرائیو کر رہی ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اچھی طرح بند نہیں ہے۔“
 آصف حمزہ نے اس کی تسلی کے لئے دروازے کو دوبارہ کھول کر بند کرنا چاہا۔ اسی
 اسے زبردست جھٹکا پہنچا۔ کار ایک جھٹکے سے گھوم گئی تھی۔ وہ چیخ مارتا ہوا باہر کی
 طرف لڑھک گیا۔ سہیل نے آگے کی طرف جھک کر دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا۔
 ”تم نے کیا کیا؟ اس سے پیچھا چھڑانے کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟“
 ”آپ چپ رہیں۔ میں بہتر سمجھتی ہوں۔“

”جب عورت پر زیورات کا جنون سوار ہوتا ہے تو اسے ایسی ہی حقائق بہتر نظر
 مآئیں۔ کیا وہ تمہیں بعد میں نہیں بچانے لگے۔ مجھے بھی اس نے دیکھ لیا ہے۔“
 ”آپ اتنی سی بات سے گھبرا رہے ہیں۔ ابھی تو میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس دکان کا
 سجاد میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔“

”ہاں؟“ وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔ کار کی چھت سے سر نکراتے ہی پھر بیٹھ گیا۔ ”قتل؟
 قتل کیا ہے؟ نہیں نہیں تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“

”ہاں میں ایسا نہیں کر سکتی تھی لیکن ایسا کرنا پڑا۔ جس ہارڈ بورڈ کی دیوار سے وہ
 لگائے کھڑا تھا۔ اس دیوار کو دھکا لگا۔ وہ اس کی زو میں آکر چاقو کی نوک پر آیا تو میں
 نے بھی پوری قوت سے چاقو اس کے سینے میں اتار دیا۔ اگرچہ قتل کا ارادہ نہیں تھا لیکن
 فری لمے ارادہ ہو گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ دکان کے منیجر کو اپنی اداؤں سے رجحانوں کی
 سے چوری کے مال میں حصہ دار بناؤں گی لیکن وہ آصف حمزہ اچانک آپہنچا۔ مجھے اس کے
 اتھ روٹلی ڈرامہ کھیلنا پڑا۔“

ایسا کہتے وقت وہ ڈاکٹر اسکرین کے پار تصویر کی اسکرین پر اس نے خود کو آصف حمزہ کی
 ٹوٹ میں دیکھ کر دو مضبوط بازوؤں کے حلقہ میں قید باشقیت یاد آنے لگی۔ عورت
 صرف زیور ہی نہیں، خوبرو مرد کی محبت بھی پہننا چاہتی ہے۔

وہ ڈرائیو کرتی ہوئی عقب نما آئینہ میں دیکھنے لگی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سہیل
 بالائی آئینہ میں نظر آ رہا تھا۔ اس میں خوبرو کی نہیں تھی۔ آصف حمزہ کے مقابلہ میں پھر
 لڑاکا تھا۔ اس جینے نے کان کے پاس ہاتھ جھٹک کر خیالی پھر کو اڑا دیا۔ وہ صرف

آصف حمزہ کو یاد کرنا چاہتی تھی لیکن سہیل نے مداخلت کی۔ ”تم کہیں گم ہو۔ میں کچھ کہہ رہا ہوں۔“

”آں۔“ وہ چونک کر بولی۔ ”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”تم نے مجھے اور خود کو مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ ایک تو تم نے قتل کیا۔ یہ کہ دوست بننے والے جاسوس سے دشمنی مول لی۔ آخر تم کس دماغ سے ہوتی ہو اس طرح فرار ہو کر قانون کے ہاتھوں سے بچ جاؤ گی؟“

”میں نہیں جانتی کہ مجھ سے کیسے قتل ہو گیا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ قانون ہاتھوں سے کب تک بچتی رہوں گی۔ وہاں زیورات سے بھری ہوئی الماری کھلی تھی میرا دماغ یہی کہہ رہا تھا کہ یہ سارے زیورات میرے ہو سکتے ہیں۔ شاید اسی لئے میرے بے اختیار اسے قتل کر دیا۔“

”تم اس جاسوس کی بات کرو۔ وہ تمہیں ڈھونڈ نہیں سکے گا لیکن مجھے پہچان لے اگر تم دوستی نبھالیتیں تو کیا نقصان ہوتا؟“

”بہت بڑا نقصان ہوتا۔ کیا آپ بھول گئے کہ ڈائری میں اسی آصف حمزہ کی تصویر تھی۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ یہ لیڈی ڈاکٹر کا بھیجا ہوا جاسوس ہے۔ ابھی یہ بھیجنا رہا تھا۔ اگر میں صحت پر عمل نہ کرتی تو یہ مجھے پولیس اسٹیشن پہنچا دیتا۔ اسی لئے میرے اس سے نجات حاصل کر لی۔“

سہیل صادق اپنا ہر تھام کر سوچنے لگا۔ عورت بھی کیا چیز ہے؟ مرد اسے خوش کرنے کے لئے رشوت لیتا ہے۔ چوری بھی کرتا ہے۔ میرا پھیری بھی کرتا ہے۔ سائلہ دانی کا ہے۔ ماہرین نفسیات کی رپورٹ کو قائم رکھنے کے لئے میں کسی نہ کسی طرح سائلہ چرائے ہوئے زیورات واپس کرتا رہا۔ تاکہ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ اس کا چچا دارا سہیل کوئی گھپلا کر رہا ہے۔ پولیس والوں کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد میں نے چچا چرائے ہوئے زیور کی تصویر اتاری۔ پھر ہو ہو دیا اسی ایک زیور بنوایا۔ اس زیور سونے میں کھوٹ شامل کیا۔ نئی ہیرے اور موتیوں سے اسے مکمل کیا۔ اتنے عرصے میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ پولیس والے واپس ملنے والے زیورات کو کہاں پر رکھ جاتے ہیں، میں نے اس پارکھ سے دوستی گاٹھ لی۔ اسے اپنے کاروبار کا حصہ دار بنا

اس لئے پچھل بار اس نقلی زیور کو دیکھ کر اس کی اصل مالکہ دھوکہ کھا گئی۔
اس بار لاکھوں روپے کے زیورات ہاتھ آئے ہیں لیکن اس لاکھوں روپے کے منافع پر انسانی لبو کے چھینے پڑ گئے ہیں ایک عورت کے لالچ اور اس کی حماقت سے منافع بخش کاروبار خطرے میں پڑ گیا ہے۔

کار ایک کوٹھی کے کپڑوں میں آکر رک گئی۔ دروں نے ڈگی کھول کر گٹھڑی نکالی۔
پھر اسے کوٹھی کے اندر لے گئے۔ ایک کمرے کے فرش پر گٹھڑی کو رکھنے کے بعد وہ غصہ سے بولی۔ ”آپ مرد ہیں؟ کیا یہ گٹھڑی تھا اٹھا کر نہیں لاسکتے تھے۔“

یہ کہہ کر وہ ہلنپے لگی۔ سوچنے لگی کہ آصف حمزہ ہوتا تو گٹھڑی کے ساتھ اسے بھی اغلا لاکہ دہ بھر خوابوں میں کھو گئی۔ وہ آدھا تھا اسے بڑی محبت سے اپنی آغوش میں سمیٹ رہا تھا۔ یک۔ یک۔ وہ چونک کر سہیل کو پرے ہٹا کر بولی۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں‘ جیسے پہلے بچاؤ کی تدبیر کیجئے۔“

وہ سنگار نیز کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔
”کل..... کل سے میں برقعہ پہنا کر دوں گی۔ آپ کچھ دنوں کے لئے ردپوش ہو جائیں یا شرے باہر چلے جائیں۔“

ایسا کھٹے وقت اس کے دماغ نے کہا۔ ”ہاں یہ بہتر ہے کہ سہیل گھر میں قید رہیں یا شرم میں نہ رہیں۔ میں اسی دوران آصف کو تلاش کر دوں گی۔ اس سے معافی مانگوں گی۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دوبارہ اسے مل کر خطرہ مول لینا چاہتی ہوں۔ بہر حال سہیل کو یہاں سے ٹال دینا چاہئے۔“

یہ حوج کر اس نے کہا۔ ”میں نے دکان کے منیجر کو ان زیورات میں سے حد۔ دینے کے لئے کہا تھا۔ اس طرح وہ اپنی زبان بند رکھے گا۔ میں پتہ بتا رہی ہوں۔ آپ اس کی گھر والی کو حصہ دے آئیں۔“

اس نے پتہ بتاتے ہوئے گٹھڑی کھولی۔ پھر اس میں سے کچھ زیورات الگ کر دیئے۔ اس کے دل میں خواہش چل رہی تھی کہ آئینہ کے سامنے باری باری تمام زیورات کو پہن کر اپنے حسن کا جائزہ لے لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔ جب سہیل کچھ زیورات لے کر چلا گیا تو اس نے باقی تمام زیورات کو آہنی الماری میں چھپا دیئے۔ وہ بڑی

الماری کو کھول کر ایک سیاہ برقعہ نکالا۔ اسے پہن کر کونٹھی سے باہر آئی۔ پھر کار میں
ایک طرف روانہ ہو گئی۔

☆-----☆-----☆

آصف حمزہ کار کے کھلے دروازے سے گرنے کے بعد سڑک کے کنارے ڈھلوان
سے لڑھکتا ہوا جھانپوں میں جا کر الجھ گیا تھا۔ ستارے گردش میں آگئے تھے۔ اس لئے کہ
پھرے ٹکراتے ہی دقیق طور پر ہوش دوا اس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔
وہ شعوری طور پر غائب تھا۔ ایسے وقت لاشعور سپنے دکھاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ
ذہین اور فرض شناس سراغ رساں تھا۔ ثمینہ سے اس کی ملاقات ایسے دور میں ہوئی جب
وہ مجرموں کے لئے دہشت بن گیا تھا۔ ثمینہ کی محبت نے اسے فرائض کی ادائیگی میں
ساقاقل بنا دیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ کہیں کسی مجرم کا سراغ ملتا یا اس کے تعاقب کی
ضرورت پیش آتی تو اتفاق سے ثمینہ کی زلفوں کا سایہ مل جانے کے باعث وہ تھک کر رہ
جاتا۔

اے جو تنخواہ ملتی تھی وہ ثمینہ کی فرمائشوں کی نذر ہو جاتی تھی۔ پہلے تو قرض لے کر
ردنی کپڑے کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ پھر وہ قرض کی ادائیگی کے لئے رشوت لینے پر
آمادہ ہو گیا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو سچے اصولوں کو توڑ
سکتے ہیں لیکن جھوٹی عورت کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اسے انٹیلی جنس کے دفتر کے دارننگ ملنے لگی کہ رلو راست پر آجائے۔ وہ
ملازمت سے جائے گا۔ عورت کے لئے جب جنت چھوڑ دی جاتی ہے تو پھر ملازمت کی
شمار میں آسکتی ہے۔ ایک باریوں ہوا کہ ایک رئیس زادے نے کسی کو قتل کر دیا۔ وہ سزا
سننے کے لئے قتل کا الزام کسی دوسرے پر تھوپنا چاہتا تھا۔ اس غرض سے اس نے
ثمینہ کو ایک نئے ماڈل کی کار خرید کر دی۔ پھر تو وہ عورت آصف حمزہ کے کمزور اصولوں
کے سامنے چٹان بن کر کھڑی کر ہو گئی کہ قتل کی تفتیش کا رخ دوسری طرف موڑ دیا
جائے۔

آصف حمزہ نے سمجھایا۔ ”ثمینہ! مقتول کے درمابھی دولت مند ہیں۔ وہ اپنے دولت مند
سے اسے قاتل ثابت کر کے بنی دم لیں گے۔ تم اپنی ضد سے باز آ جاؤ میری جان!“

لیکن میری جان نے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اپنے بال کھول دیئے۔ اسے مجبوراً قدموں سے اٹھا کر مٹھے لگانا پڑا۔ پھر اس نے اپنے طور پر تعقیب کا رخ موڑ دیا لیکن اٹیلی جس کے ایک افسر نے اپنے طور پر تعقیب کرنے کے بعد سچائی کو بے نقاب کر دیا۔ قاتل بھی پکڑا گیا اور رشوت خوری بھی ثابت ہو گئی۔

وہ صبح اور مکمل رپورٹ ابھی عدالت تک نہیں پہنچی تھی۔ آصف حمزہ کو پتہ چل گیا کہ وہ بھی حراست میں لیا جائے گا۔ یہ خبر ملنے ہی وہ بھاگا ہوا شینہ کے پاس پہنچا۔ شینہ کو توقع نہیں تھی کہ آصف حمزہ اچانک اتنی جلدی واپس آجائے گا۔ اس لئے وہ رئیس زادے کی آغوش میں دل بسلا رہی تھی۔ رئیس زادہ اس سے وعدہ کر رہا تھا کہ سزا سے بچتے ہی وہ اس کے لئے ایک کوٹھی خریدے گا۔

مارے غصہ کے آصف حمزہ کی کھوپڑی گھوم گئی۔ اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ اس کے دیوانہ دار قہقروں کی گونج میں ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

”ٹھائیں، ٹھائیں، ہلباہا میں دیوانہ ہوں، جو اپنے ہاتھوں سے اپنی دنیا اور اپنی عاقبت بگاڑ لیتا ہے۔“

ہلباہا! ہم جیسے لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آج سے میں زندگی کی آخری سانس تک مرتا رہوں گا.....“

یہ کہتے ہی وہ چکر کر شینہ اور رئیس زادے کی لاشوں کے پاس گر پڑا۔ اس کے بعد وہ آخری سانس تک زندہ رہ کر مرتے رہنے کے لئے ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔

ہوش آتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو جھانڑیوں میں الجھ گیا۔ اس کے آس پاس مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ سانکھ کے ساتھ کارشٹ بیٹھا ہوا تھا۔ دردناک کھول کر بند کرنے سے پہلے ہی گر پڑا تھا لیکن سانکھ اس کا بھائی اور وہ کار کہاں ہے؟

وہ چاند کی روشنی میں سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے دماغ کے اندر بیٹھے ہوئے سواغز سناٹے کہا۔ ”میں گرا نہیں، گرایا گیا ہوں۔ ایک عورت نے پھر مجھ سے فریب کیا ہے۔“

وہ غصہ سے تھلنے لگا۔ ”میں نے اس پر بھروسہ کیوں کیا؟ میں تو اس مقصد پر فرار ہوا تھا کہ جو بھی حسین عورت ملے گی، اسے قتل کر دوں گا۔ پھر میں نے اسے کیوں نہیں کیا؟“

اس کے دماغ کے چور خانہ سے کوئی بولنے لگا۔ شاید اس لئے کہ میں خوگرفنہ ہوں۔ عادتاً حسین عورتوں کی اداؤں سے بہل جاتا ہوں۔ میں عادتاً جاموس ہوں۔ اسی لئے اگر فرار بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں پاگل ہوں۔ احمق ہوں۔ مجھے ساری عادتیں بھول کر یہ انتقام کو یاد رکھنا چاہئے۔ میں سانکھ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ جھاڑیوں سے نجات پا کر اٹھنے لگا تو گیلی زمین پر پڑی ہوئی ڈائری ہاتھ آئی۔ یاد آیا کہ کار سے گرتے وقت اس کے ایک ہاتھ میں وہ ڈائری تھی۔ اس فریبی عورت پتہ پانے کے لئے وہ ڈائری اس کے ساتھ کار سے باہر چلی آئی تھی۔

آدھ گھنٹہ بعد جب وہ سانکھ کی کوٹھی کے سامنے پہنچا تو وہ مین گیٹ کے پار کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی آصف حمزہ نے آگے بڑھتے ہوئے۔ ”مکار عورت! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”اگر میں مکار ہوتی تو تمہارے انتظار میں یہاں کھڑی نہ رہتی۔“

وہ اس کی گردن دوپٹا چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ واقعی وہ اس کے انتظار میں کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”تم نے کیسے سمجھ لیا کہ ابھی میں یہاں آؤں گا؟“

”میں نے دیکھا تھا کہ تم ڈائری کے ساتھ کار سے گر پڑے ہو۔“

”کیا تم گاڑی روک کر میرے پاس نہیں آ سکتی تھیں؟“

”نہیں سہیل بھائی نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں گاڑی نہ روکوں۔ یقین کرنا، دل تمہاری طرف لگا ہوا تھا۔ میں بڑی مشکل سے سہیل کو دھوکہ دے کر کوٹھی سے آئی ہوں۔ میرا دل کتا تھا کہ میری محبت سچی ہے۔ تم یہاں ضرور آؤ گے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی مرمیں پانہوں کا ہار اس کی گردن میں پہنا دیا۔ وہ ایک سے کچھل گیا پھر دی حسین عورت کی اداؤں سے بہل جانے کی حاوت غالب آئی۔ بولی۔ ”آصف! میرے آصف یہاں سے فوراً چلو ایسا نہ ہو کہ سہیل یہاں پہنچ جائے۔“

آصف نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

وہ سوچنے لگی کہ فی الحال سہیل سے دور رہ کر آصف کے ساتھ کہاں وقت گزارنا چاہئے۔ سوچنے کے دوران وہ دونوں خاموشی سے کچھ دور چلتے رہے۔ اسی وقت کتنی ہی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ وہ روشنیوں کی زد میں آنے سے بچ گئے۔ گاڑیاں تیزی سے چلتی ہوئی سائلہ کی کوٹھی کو گھیرے میں لے رہی تھیں۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پولیس والوں کو قتل اور ذہنی کی واردات کا علم ہو چکا ہے۔ اس حینہ کے پاس صرف اداؤں کے ہتھیار تھے۔ اس لئے وہ نوراً ہی آصف حمزہ سے لپٹ گئی تاکہ اس سرخ رسل کو اپنا فرض یاد نہ آئے۔

پھر رات کے منانے میں ایک پولیس افسر کی آواز گونجنے لگی۔ وہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کہہ رہا تھا۔ ”سائلہ! ہم تم سے مخاطب ہیں۔ تمہارا بھائی سہیل صادق گرفتار ہو چکا ہے۔ اگر کوٹھی کے اندر تمہارے ساتھ کوئی ہے تو اس کے ساتھ چپ چاپ باہر چلی آؤ۔“

پولیس افسر کی یہ آواز آصف حمزہ کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی لیکن اسے اپنا فرض یاد نہیں آیا۔ کیونکہ اس کے سینے پر سائلہ کی جوانی دھڑک رہی تھی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں تمہاری ہوں۔ میرے بدن کا ذرہ ذرہ تمہارا ہے۔ مجھے قانون کے حوالے نہ کرو۔ ہم کہیں دور پلے جائیں گے۔ پھر میں تمہیں اتنی خوشیاں اتنا پیار دوں گی کہ تمہارے جانے جنت چھکی پڑ جائے گی۔“

آدی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ جنت کی تلاش میں جنت سے دور نکل جاتا ہے۔ وہ بھی نہ کچھ سکھ سکا۔ ایک پڑ فریب جنت کا ہاتھ تھام کر بھاگتا چلا گیا۔ بھاگنے کے دوران وہ برقعہ سنبھالتی ہوئی سوچنے لگی۔ ”ہائے ساری محنت اکارت گئی۔ جس الماری میں میں نے زیورات چھپائے ہیں۔ وہاں تک میں نہیں جاسکتی۔ جب سہیل گرفتار ہو چکا ہے تو پولیس دالے اس سے سب کچھ انگو الیس گے۔ اس الماری تک بھی شاید پہنچ چکے ہوں گے۔“

وہ بھاگتے بھاگتے لڑکھڑا کر گر پڑی۔ پھر تقریباً روتے ہوئے بولی۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کیا تمہارے پاس پناہ لینے کی کوئی جگہ ہے؟“

”نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں پولیس والے مجھے بھی تلاش کر رہے ہوں گے۔“

”تو پھر چلو۔ ایک نرس میری سہیلی ہے۔ ہم فی الحال اس کے ہاں پناہ میں ہیں۔“

اس کا دانی سے باہر پہنچتے ہی انہیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ تمام راستے وہ خاموش رہے۔ کیونکہ وہ ڈرائیور کی موجودگی میں موجودہ حالات پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ سہیلی پہنچ کر اسے حالات کا تجزیہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ دونوں بے تکلف سہیلیاں تھیں۔ اس نے پناہ دینے سے انکار نہیں کیا۔ وہ نما رہتی تھی۔ وہاں کوئی ان کی موجودگی اعتراض کرنے والا نہ تھا۔ اس نے دونوں کے لئے خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ آصف حمزہ نے حالات کا تجزیہ کرنے کے لئے پوچھا۔ ”وہ تمہارا سہیلی بھائی؟ گرفتار ہو گیا؟ تم اسے کہاں چھوڑ کر آئی تھیں۔“

”میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ دکان کے منیجر کا حصہ اس کی بیوی تک پہنچا دے۔ خیال ہے کہ منیجر نے پولیس والوں کے سامنے حقیقت اگل دی ہے۔ پولیس والے ڈانٹ منیجر کے گھر گئے ہوں گے۔ اس طرح سہیلی کو وہاں گرفتار کر لیا ہو گا۔“ یہ کہتے ہی وہ تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گر پڑی۔ ”ہائے میں بہت تھک گئی۔ یہ برقعہ اتار دو۔“

آصف حمزہ نے خواب گاہ کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر واپس آکر برقعہ اتارنے لگا۔

☆-----☆-----☆

سائلہ کے معنی ہیں موال کرنے والی۔ اس کی خوابیدہ خوابیدہ اسی آنکھیں پڑ خاموشی سے سوال کرتی رہتی تھیں کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ وہ چور اچکی کہلاتی تھی۔ دنیا والے اس کے سوال کے جواب میں اسے چوری اور شاید بے حیا بھی کہہ دیتے لیکن وہ ایسی حیا والی تھی کہ غیر سروں کے سوائے کترات تھی۔ آصف جمال نے اسے بلیک میل کرنا چاہا اور اس کے ساتھ دقت گزار کی خواہش ظاہر کی تو اس نے چلتی گاڑی سے اسے نیچے گرا دیا۔

اس کی زندگی میں آنے والا ایک اور شخص اس کا چچا زاد بھائی سہیل تھا۔ سہیل اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی چوری کی عادت چھڑا دے گا۔ اگر ناکامی ہوئی تو پھر عدالت کے سلسلہ میں اس کا ساتھ دے گا۔ اسے قانون کے نیچے سے بچا لیا کرے گا۔ اس کی

تھی کہ سائلہ اس سے شادی کر لے۔

لیکن ان دنوں سائلہ کا باپ زندہ تھا۔ اس نے شادی کی مخالفت کی۔ دو اپنے بھتیجے سہیل کو اچھی طرح جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کی عادتیں اور زیادہ بگاڑ دے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ سہیل نے مایوس ہو کر ریحانہ سے شادی کر لی۔ جب سائلہ کے ڈیڑی کا انتقال ہو گیا اور وہ کوٹھی میں تیار رہنے لگی تو سہیل اور ریحانہ اکثر اس کے پاس آکر اس کی دل جوئی کرنے لگے۔

دو محبت کی بھوکی تھی۔ اسے بھائی اور بھانج کا پیار ملا تو انہیں اپنا سمجھ کر دل کی باتیں کہنے لگی۔ جب بھی وہ کسی کا زیور چراتی اور جب اسے پسینہ کر اس کا دل بھر جاتا تو سہیل اسی زیور کو اس کی اصل مالکہ تک معذرت کے ساتھ پہنچا دیتا۔

جب وہ سینہ کریم کی کوٹھی سے زیورات لے کر فرار ہوئی تو اس چوری کی خبر انبارت تک پہنچ گئی۔ اسی وقت آصف جمال نے اسے اپنی کار میں لفٹ دی تھی اور دوسرے دن اس پر نیت خراب کی تھی۔ یہ تمام باتیں وہ سہیل اور ریحانہ کو بتا چکی تھی لیکن اس بار وہ دونوں اسے عدالت تک جانے سے نہ بچا سکے۔ پھر بھی جیل جانے سے بچا لیا۔ اس کے وکیل نے ثابت کروا کہ وہ دماغی مریضہ ہے۔

وہ کچھ عرصہ مینٹل ہسپتال میں زیر علاج رہی اور ہمیشہ نارمل ہونے کا ثبوت دیتی رہی۔ لہذا اسے ہسپتال سے اس طرح چھٹی دی گئی کہ اس کی نگرانی کے لئے ایک شخص کو مقرر کر دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے ایک تقریب میں ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ اس بار سہیل نے بھی اپنا کمال دکھایا۔ چوری کے زیور کی ہو ہو خنک تیار کی۔ پکڑے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ پولیس والے زیورات کو پرکھنے کے لئے جس پارکھ کے پاس لے جاتے تھے۔ وہ پارکھ سہیل کا بزنس پارٹنر بن گیا تھا۔

سائلہ نے پھر کچھ دنوں کے بعد بیگم حشمت بیگم کے نیکس پر ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ تقدیر اچھی تھی کہ بیگم کی قاتلہ بننے سے بال بال بچ گئی اور دوبارہ پاگل خانہ پہنچا دی گئی۔ وہاں اس کے دماغ کو برقی جھٹکے پہنچائے گئے۔ دماغ کو جھٹکے پہنچنے کے بعد اسے اپنا بچپن یاد کیا۔

اسے یاد آیا جب وہ نو برس کی تھی تو ایک شام اس کی مامی نے کسی پارٹی میں جانے

کے لئے زیورات پہن رکھے تھے۔ اس کے ڈیڈی نے سائلہ کو بچی سمجھ کر اس کے اس کی ممی کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”میری جان! عورت زیورات کے بغیر مکمل ہوتی۔ اب تم مکمل ہو.....“

سائلہ نے کہا۔ ”ممی! میں بھی زیور پہنوں گی۔“

ممی نے ڈانٹ کر کہا۔ ”بچے نہیں پہنتے۔ ہر بات کی نقد نہ کیا کرو۔“

ڈیڈی نے کہا۔ ”بھئی ایک نیکلس پہنا دو۔ میری بیٹی اچھی لگے گی۔“

”آپ اسے سر پر نہ چڑھائیں۔ بھلا اسے کون پسند کرنے آ رہا ہے کہ یہ ایگی۔“

زیور پہنے کی؟“

یہ کہہ کر ممی اس کے ڈیڈی کو نے کبھلی گئی۔ سائلہ کے ننھے سے دماغ میں دو بھرنے لگ۔ ایک تو ممی نے اسی چیز پر قبضہ جمار کھا تھا، بسے پہننے سے ڈیڈی انہیں پیار کرتے۔ دوسرے یہ کہ پیار کرنے والے ڈیڈی کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔

اس کا ذہن جیسے کسی آگ پر کھولتا رہا۔ ایک دن اس نے ممی کی غیر موجودگی میں سنگار میز کی دراز سے ایک نیکلس چرا لیا۔ اسے پہن کر ڈیڈی کو دکھایا تو انہوں نے ہاتھ کرتے ہوئے خوب تعریف کی۔ پھر سمجھایا۔ ”بیٹے تمہاری ممی کو معلوم ہوگا تو نہ ہو جائیں گی۔ اس نیکلس کو چپکے سے واپس رکھ دو۔“

پھر اس کے دماغ میں یہ بات نقش ہو گئی کہ زیور چرا کر پہننا اتنی بری بات نہیں۔ کیونکہ اسے واپس رکھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح شوق بھی پورا ہوتا ہے۔ پھر چوریاں مراصل سے گزرتے وقت عجیب سی سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ ممی کو بے وقوف بنانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔

جب وہ جوان ہوئی اور اسے زیور پہننے کے لئے ویسے گئے تو اسے اچھا نہ لگا۔ ممی کا انتقال ہو چکا تھا۔ سیدھی طرح خریدے ہوئے یا تحفہ کے طور پر آئے زیورات پہننے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ممی جیسی دوسری عورتوں کو بے وقوف بنا کر زیورات پہنے جائیں۔ بچپن کا انڈی دماغ اب جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ چھوٹی سی مٹی میں جو دستور بن گیا تھا، جو طریقہ کار پسند آ گیا تھا، اب اسی طریقہ پر چلنے کے لئے انہوں نے جنونی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

بنی جھٹکے کھانے کے بعد سانکھ نے یہ بیان دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ خود اپنی کوششوں سے اس بری عادت کو چھوڑ دے گی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اسے پھر رہائی مل گئی۔ سہیل اور ریحانہ پاگل خانہ آئے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

سانکھ نے اپنے وعدہ کے مطابق اس بری عادت سے باز رہنے کی کوشش جاری رکھی لیکن سہیل اس کے لئے درد سر بن گیا تھا۔ وہ تنہائی میں موقعہ پا کر اس کے قریب آنا چاہتا تھا اور وہ کتراتا رہتی تھی۔ ایک بار اس نے ریحانہ بھابی سے شکایت کر دی۔ ریحانہ نے اپنے میاں کی اچھی طرح خبر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو کچھ دنوں کے لئے ایک شریف آدمی بن گیا۔

لیکن سانکھ مطمئن نہیں تھی اور سہیل سے پیچھا چھڑانے کے لئے سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔

☆-----☆-----☆

وہ بستر پر لیٹی ہوئی موج رہی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی زلفیں ٹکیہ پر بکھری ہوئی تھیں اور وہ آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔

یہ اڑی اڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو

تیری صبح کہہ رہی ہے، تیری رات کا فسانہ

دھوپ کھڑکی کے راستے بستر تک پہنچ رہی تھی، آصف حمزہ نے ہاتھ روم سے نکلتے ہوئے کہا۔ ”اب اٹھ بھی جاؤ۔ ذرا اپنی سیلی سے کو کہ چائے پلا دے۔“

پھر اس نے فرش پر پڑے ہوئے اخبار کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری سیلی سمجھ دار ہے۔ اس نے دستک نہیں دی۔ دروازے کے نیچے سے اخبار پہنچا دیا۔“

یہ کہتے ہوئے دو اخبار کی دوق گردانی کرنے لگا۔ آخری صفحہ پر چھپی رات کے ایک قتل اور ذہنی کی خبر تفصیل سے شائع ہوئی تھی۔ وہ توجہ سے پڑھنے لگا۔ کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر وہ بستر پر بیٹھ کر ایک بھرپور انگڑائی لیتی ہوئی بولی۔ ”کیا وہ اخبار مجھ سے زیادہ دلچسپ ہے۔“

آصف حمزہ نے غصہ سے انہار کو دونوں مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ دو پریشان ہو کر بولی۔ ”کیا بات ہے۔ تم مجھے غصہ سے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

وہ وامت پس کر بولا۔ ”ذلیل، کمینہ عورت تو اب تک مجھے محبت کا فریب دے
تھی۔ سہیل کو بھائی کہنے والی بدکار عورت تو نے پہلے کیوں نہ بتایا کہ وہ تیرا بارہ
تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

یہ کہتے ہی اس نے بستر کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ پٹنگ کے دوسری طرف پہنچا
پھر دور بھاگتی ہوئی بولی۔ ”میں بے وفا نہیں ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔
مجھے مجھے چاہتے ہو۔ خواہ مخواہ دھمکی نہ دو۔“

اس نے غرا کر کہا۔ ”یہ دھمکی نہیں ہے۔ تجھ سے پہلے بھی ایک اور حسین
نے مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ کسی دوسرے کو یار بنا لیا تھا۔ میں نے اسے قتل کر دیا۔
تجھے بھی تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔“

اس پر واقعی جنون سوار ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں انتقام پکار رہا تھا۔ وہ تیزی
آگے بڑھا لیکن سامنے والی نے ایک کرسی آگے کر دی۔ وہ الجھ کر گر پڑا۔ پھر تھلا کر
لگا۔ اتنی دیر میں وہ دروازہ کھولنے کے بعد کہہ رہی تھی۔ ”تم یقین کرو۔ میں
سے پیچھا چھڑا کر تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”اور میں تمہارے لہو سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہوں۔ میں قاتل ہوں۔ اب
تمہارے جیسی حسین عورتوں کو معاف نہیں کروں گا۔“

وہ بھاگتی ہوئی اپنی سہیلی کو پکارتی ہوئی مکان سے باہر نکل گئی۔ کیونکہ سہیلی
مدد کے لئے موجود نہیں تھا۔ کہیں چلی گئی تھی۔ اب بھاگتے رہنے کے سوا کوئی چارہ
تھا۔ جو پچھلی شب کا ہمسفر تھا، وہ ایک جنونی قاتل کے روپ میں اس کا تعاقب کر رہا
تھا۔ اس کو خیال آیا کہ اس کی ذلیفیں بکھری ہوئی ہیں اور دو ماٹ گاؤں میں ہے۔
حیرانی سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ ایک ٹیکسی اس کے قریب آکر رک گئی۔ ڈرائیور
پوچھا۔ ”آپ کہاں جانا چاہتی ہیں؟“

وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”جلدی چلو۔ ایک قاتل میرا پیچھا
کرتا ہے۔“

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا بہت دور آصف حمزہ بھی ایک
دروازہ کھول کر بیٹھ رہا تھا۔ وہ چیخ کر بولی۔ ”تیزی سے چلاؤ۔ وہ بھی ٹیکسی میں

”ہاں“ ڈرائیور نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بی بی! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آپ کو پولیس اسٹیشن پہنچاؤں گا۔ وہاں آپ محفوظ رہیں گی۔“

ن ایک دم سے گھبرا گئی۔ تھانے کی طرف جانے کا مطلب یہی ہوتا کہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرے۔ پولیس والے تو پہلے ہی اس کی تلاش میں تھے وہ پھر پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگی۔ پیچھے کھڑا اور آگے کھلتی تھی۔ نہ اوجھڑ جاسکتی تھی، نہ ادھر، وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ”نہیں۔ میں پولیس اسٹیشن نہیں جاؤں گی۔ دوسری جگہ لے چلو۔“

”بی بی! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ قاتل سے بچنا چاہتی ہیں اور پولیس کی مدد بھی لینا نہیں چاہتیں، بات کیا ہے؟“

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک سڑک سے دوسری سڑک پر بھاگی جا رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ٹیکسی آہستہ آہستہ جھٹکے کھانے لگی۔ شاید کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ قسمت خراب ہو تو راستے میں ایسی ہی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ٹیکسی رکی تو وہ دروازہ کھول کر فٹ پاتھ پر بھاگنے لگی۔ آس پاس بچوں کا شور سنائی دیا۔ ”بگلی ہے۔ بگلی ہے۔ مارو۔ مارو۔“

اس کے ساتھ ہی وہ چار پتھر اس کی طرف آئے وہ اور تیزی سے بھاگنے لگی۔ کچھ دم بھاگتے رہنے کے بعد آصف حمزہ کی مگر جدار آواز سنائی دی۔ ”رک جا مکار عورت! تو مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتی گی۔“

مارے وہشت کے اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ تب اس نے ویکھا سامنے پاگل خانہ کا بیڑا سا دروازہ تھا۔ بچے اسے پگلی سمجھ کر پتھر مار پکے تھے۔ اس کی حالت بھی پگیوں جیسی تھی۔ دماغ نے بھی اسے سمجھایا کہ وہ پگلی بن کر ہی قانون اور قاتل دونوں سے بچ سکتی ہے۔

زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ دروازے پر کھڑے ہوئے سنتری کو دھکا دیتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سنتری اس غیر متوقع دھکے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے گر پڑا۔ جب دوبارہ اٹھا تو دوبارہ دھکا لگا۔ وہ پھر زمین بوس ہو گیا۔ اس بار آصف حمزہ اس سے کھڑا ہوا گزر گیا تھا۔

اخلاقی جنس والوں نے مشورہ دیا کہ اگر ایک چوبیا کو آزاد کر دیا جائے تو بلا فطرتاً اور ضرورتاً اس کا بچھا کرے گا۔ تم عادتاً ایک سر اغر سال ہو۔ سالکہ جیسی چور لڑکی کا بچھا ضرور کرتے اور ہماری نظروں میں آجاتے۔ لہذا ہم نے پاگل خانہ سے سالکہ کی چھٹی کر دی۔ عادت بدلی جاسکتی ہے لیکن عادت فطرت بن جائے تو تمہارے جیسا خو گرفتہ انسان فطرتاً پاگل بن جاتا ہے ہم تمہاری سر اغر سالی کی عادت سے تمہیں گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن تم انتقام لینے والے عاشق بن کر ہمارے دام میں آئے ہو۔“

ڈاکٹر کہہ رہا تھا اور آصف حمزہ اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا: "افسوس کہ تم انعام کی آگ بجھانے کے لئے اسے قتل نہ کر سکتے لیکن قانوناً اسے موت کی سزا ملے گی۔"

”نہیں۔ قانون اسے جس مار سکتا اس مکار اور بے دفا عورت کو میں قتل کروں“

وہ حلق پھار کر چیخ رہا تھا اور زنجیریں توڑنے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔

☆ = / / = = ☆ = = → = = ☆

لیڈی ڈاکٹر نے کسی تقریب میں شریک ہونے کے لئے خوب صورت سی سازھی پہنی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی زیورات کی جلمگاہٹ میں اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے شوہر نے آگے بڑھ کر اسے آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ ”زیورات پہننے کے بعد عورت کا سن مکمل ہو جاتا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ حسین چہرے پر جھک گیا لیکن قدموں کی آہٹ پاتے ہی فوراً الگ ہو گیا۔ دونوں نے سر گھما کر دیکھا۔ دروازے پر سانپ کھڑی ہوئی تھی۔

”سائلہ تم؟“ لیڈی ڈاکٹر شرافی ہوئی بولی۔ ”تم اب تک مارل میں ہو تمہیں یہ بھی سکھانا ہو گا کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے دستک دینا چاہئے۔“

سالمہ نے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”آج کا انبار پڑھ کر میں الجھ گئی ہوں۔۔۔ جیولری کی دکان کا منیجر اپنے بیان میں میرا نام لیتا ہے اور ریحانہ بھائی کو شناخت کرتے ہوئے انہیں سالمہ کہتا ہے‘ آخر یہ کیا چکر ہے؟ کیا میری بھائی نے سجاد کو قتل کیا ہے؟“

لیڈی ڈاکٹر نے اس کے شانہ پر ہمارے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں سائلڈ! میں اسی

مردہ خط کی واپسی

اے سرخ رنگ بہت پسند تھا اس کی محبوبہ کو سرخ لہو میں ڈبو دیا گیا تو
اس نے قسم کھائی کہ خون کا بدلہ اپنے ہاتھوں سے لے گا۔۔۔۔۔ مگر قاتل نے اے
ایسا فریب دیا کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اس فریب سے نہ بچ سکا۔

طیاروں نے ایسی زیروست بمباری کی تھی کہ وہ ہنستا بولتا شہر ایک دم سے کھو بن کر رہ گیا تھا۔ انسانی بستیاں بار بار اجڑتی ہیں اور بار بار بستی ہیں۔ وہ پہاڑی بستی رفتہ رفتہ پھر آباد ہونے لگی۔ جنرل پوسٹ آفس کی عمارت کا وہ حصہ جہاں مردہ خطوط کاؤنٹر ہوتا تھا وہاں کی ایک طرف کی دیوار گر پڑی تھی اور تمام خطوط تنکوں کی طرح کھڑکے تھے۔ وہ ایسے خطوط تھے جن پر یا تو نامکمل پتے تھے یا وہ ناقابل فہم تھے۔ کوشش کے باوجود پڑھے نہیں جاتے تھے یا پھر اپنے پتے پر جا کر اس لئے داپس آگئے تھے کہ انہیں وصول کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے خطوط مردہ کہلاتے ہیں اس لئے مردہ خطوط ایک الگ دفین میں رکھے جاتے ہیں۔ بمباری کے بعد وہ مردہ خط قید خانے سے آزاد ہو گئے یعنی ایک طویل مدت کے بعد اپنی قید سے نکل کر دور تک آزادی سے اڑ رہے تھے۔ انہی میں اب دو سال پرانا بند لفافہ تھا۔

اس لفافے پر ڈاک خانے کی مہتر رہی تھی کہ اس کی موت کو دو سال گزر گئے ہیں۔ اس پر جو پتہ تھا وہ واضح تحریر میں تھا۔ اس کے باوجود وہ اس شخص تک نہیں پہنچا تھا جس کا نام اس لفافے کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا۔ پہاڑ کی اس بلندی پر ہوا سائیں سر ہوتی تھیں۔ کتنی تیزی سے ہمہ رہی تھی اور اس لفافے کو ایک سمت بہا رہا تھا۔ کبھی کسی پر وہ رک جاتا تو درختوں کی شاخیں شور مچا دیتیں اور اپنے پتوں کی ہوا دے کر اسے آگے بڑھا دیتی تھیں۔

بست دور اڑنے کے بعد وہ ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چھپ گیا۔ لوگ بہانے کے باعث حواس باختہ تھے۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ کئی ہفتوں پہلے کو دوڑ کر پڑا۔ بچوں کو اس دنیا کا کوئی المیہ متاثر نہیں کرتا۔ ایک بچہ اپنی ماں کی انگلی پکڑے وہاں سے گزر رہا تھا اس نے وہ ڈکرا سے پتھر کی آڑ سے اٹھالیا۔ اس کی ماں نے ڈانٹ کر کہا ”کیا کر رہے ہو مٹھے..... جلدی چلو کہیں پھر دشمن نہ آجائیں۔“ وہ مٹھے کاٹا

وہ اندھے منہ پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے کے نیچے وہ لفافہ موجود تھا۔ ذرا دیر بعد سانسیں درست ہوئیں تو اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ڈاک خانے سے نکالا۔ لفافہ بہت پرانا ہو چکا تھا اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بوڑھے نے اپنے لیے اس میں دو مرے کانڈات کے ساتھ رکھ لیا۔ پھر کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کانڈات بھرے ہوئے جھوٹے کو اس نے پیٹھ پر رکھا۔ پھر دو مرے کانڈات پٹنے کے لیے اڑ بڑھتا چلا گیا۔

”پتہ نہیں کس کانڈ پر میرے بیٹے نے لکھا ہو گا۔ پیارے ابا جان! میں یہاں خیر سے ہوں اور خدا کے فضل و کرم سے آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے واپس آیا ہوں۔ ہاں ہاں میرے بیٹے نے ضرور کسی کانڈ پر لکھا ہو گا۔ میں اس بستی کا ایک کھ بھی نہیں چھوڑوں گا، بسب تک سانس باقی ہے کانڈ چنتا رہوں گا۔“

وہ کاشتے ہوئے بوڑھے ہاتھوں سے جگہ جگہ کانڈ چنتا ہوا ایک قبرستان میں پہنچ گیا۔ بستی بھی اجڑ کر قبرستان بنی ہوئی تھی۔ اس بوڑھے کے لئے دونوں ہی جگہیں براہ تھیں۔ وہ قبرستان میں داخل ہو کر سینٹ کے اس چوتھے پر آکر بیٹھ گیا جہاں نماز جانا پڑھائی جاتی تھی۔ بستی میں بلیک آؤٹ تھا۔ قبرستان میں ہمیشہ بلیک آؤٹ رہتا تھا۔ وہ پاگل اس اندھیرے میں اپنے بیٹے کا خط پڑھنے آیا تھا۔ پتہ نہیں اس اندھیرے میں نظر آتا ہی تھا یا نہیں۔ مگر وہ کانڈ سے بھرے ہوئے تھیلے کو کھولنے کے بعد ایک ایک کانڈ کو اٹھا کر اس تاریکی میں پڑھ رہا تھا۔

کوئی پورا کانڈ تھا، کوئی آدھا تھا، کوئی آدھے کا آدھا، کوئی انبار کا تراشا تھا، مگر سبھی کو خط سمجھ کر پڑھ رہا تھا اور وہی پڑھ رہا تھا جو اس کا پاگل پن اسے سمجھا رہا تھا۔ ہر کانڈ کرکھائے گئے۔ ان کے بعد وہ پھینک دیتا تھا۔

”نہیں یہ میرے بیٹے کا خط نہیں ہے، شاید یہ میرے بیٹے کا خط ہے۔“

اسی طرح وہ دوسرا کانڈ اٹھا لیتا۔ پھینکے ہوئے تمام کانڈ در در تک اڑ رہے تھے۔ اسی وقت تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ جھولے کے دو مرے کانڈات ہوا کے اس جھونکے کی زد میں۔ در در تک بکھر گئے۔ بوڑھے نے مٹھیاں بھینچ کر مرگ۔

”کون ہے یہ..... کون میرے بیٹے کا خط مجھ سے چھین رہا ہے؟ ارے کالوا مرنے کے بعد تو اپنی قبروں میں آرام سے پڑے رہو۔ میں اسی لئے بستی میں خط نہیں

ہوں کہ زندہ انسان چھین لیں گے مگر تم مردے ہو کر بھی انسانی فطرت کو نہیں
ایک دوسرے سے چھیننے کی عادت میں گئی.....

وہ اڑتے ہوئے کاغذات کو پکڑنے کے لئے دھڑا دھڑا بھاگنے لگا۔ مگر کاغذات چاروں
بکھر گئے تھے۔ وہ انہیں پکڑنے کے لئے کہاں کہاں جاتا۔ مگر وہ جہاں گیا وہاں ایک
دی قبر میں اس کا پاؤں دھنس گیا۔ وہ گرتے ہی کراہنے لگا اور اس قبر کے مردے کو
ادبے لگا۔ وہ لاڈلہ لطف بوڑھے سے بہت دور پہنچ گیا تھا۔ مگر ایک جگہ ٹھہرنا
دھڑا دھڑا قبروں کی گھنٹی گلیوں سے گزرنے لگا۔

کھلی فضا میں ہوا کا مزاج بدل جاتا ہے، وہ مستی میں سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی ہے۔
وہ سیٹیاں نہیں بجاتی، جن قبروں میں شگاف پڑ جاتے ہیں وہی سیٹیاں بجاتی ہیں۔
نا کی اندھیری گلیوں میں ایک انسان کا آخری مکان ذرا ٹوٹا ہوا تھا۔ قبر کی اس ٹوٹی
سے ایک استخوانی ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کی ہتھیلی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ لطف نئے
رشتہ جھوٹا اور ڈرگاتا ہوا آیا اور اس ہتھیلی پر آکر ٹھہر گیا۔

شاید وہ اپنے پتے پر پہنچ گیا تھا۔

☆ ----- ☆ ----- ☆

ڈانس کا ایک راؤنڈ ختم ہوتے ہی وہ دونوں ایک میز پر آکر بیٹھ گئے۔ ڈانس فلوور کے
ہر میز پر دھیمی دھیمی سی مدھنسی تھی اور میز کے چاروں طرف کرسیوں پر دھیمی
تار کی تھی۔ نوجوان جوڑوں کے لئے عجیب سا رد مانی ماحول تھا میز پر کمانے کی چیزیں
ماٹھیں اور کھانے والوں کے چہرے واضح طور سے نظر نہیں آتے تھے۔ پرکاش نے
ہی پر بیٹھی ہوئی رہتا کو دیکھا اور پوچھا۔

”کیا تم تھک گئی ہو؟“

”میں تھکا نہیں، تھکا جانتی ہوں۔ چلو ڈانس کا دوسرا راؤنڈ بھی ہو جائے۔“

پرکاش نے ہوس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بھرے بھرے بدن کی اس عورت
کی جستی اور پھرتی تھی کہ واقعی وہ دوسروں کو تھکا ڈالتی ہوگی۔ پرکاش نے کان پر
کتے ہوئے کمانے۔

”تھکا..... اب ڈانس کرنے جائیں گے تو دل کی بات دل ہی میں رہ جائے

ریتا نے شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہے تمہارے رات بات؟“

”بس تمہاری یہی ادائیں مار ڈالتی ہیں۔ سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بنی رہتی۔ آخر محسن میں کیا بات ہے کہ تم اس کے شجرے کی مینا بن گئی ہو؟“

وہ اپنے ہونٹ سکڑ کر ناگواری سے بولی۔ ”اس کا نام نہ لو۔ وہ بار میں بیٹھ کر ہے۔ نام لیتے ہی شیطان کی طرح یہاں پہنچ جائے گا۔“

پرکاش نے پھر ایک بار اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ دھندلی سی روشنی میں تک نظر آ رہی تھی اس کے بعد میز نے اسے چھپا لیا تھا۔ مگر جس حد تک نظر آ رہا تھا اس حد سے بہت آگے لپکا رہی تھی۔ ڈانس کرنے کے بعد اس کا زرخیز سینہ اسے سانسوں کی اپیل سے لرز رہا تھا، ہولے ہولے تھر تھرا رہا تھا اور بار بار دیکھنے والی نگاہیں لگا رہا تھا۔ اس کے جسم اور چہرے کی ساخت ایسی تھی کہ وہ اونچی سوسائٹی میں محسوس کی جاتی تھی۔ کتنے ہی منچلے اس کی تمنا کرتے تھے۔

”تمہاری تمنا کرنے کے لئے اس شیطان کا نام لینا ضروری ہے تم اس سے انکار کیوں ہو۔ کیا اس نے ڈرا دھمکا کر تم سے شادی کی تھی۔“

”نہیں..... اس نے مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ یہ وقت اس پر میرا دل آگیا تھا۔ اس وقت میں نے یہ بھی لیں سوچا کہ وہ مسلمان ہے۔ یہ بھی اونچی سوسائٹی میں دھرم ایمان کہاں ہوتا ہے۔ یہاں ڈانس فلور پر کتنے ہی دھرم عورتیں اور مرد رقص کرتے وقت گڈٹ ہو جاتے ہیں۔“

”پھر بھی تمہیں محسن سے شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔“

”مگر اب تو ہو چکی ہے۔ اگر میں اس سے طلاق لے کر تمہارے پاس آؤں۔ کیا تمہارے کتنے ہی رقیب ہیں جو مجھے بدنام کریں گے کہ میں رقص کے پارٹنر کی طرح ان کے پارٹنر بھی بدلتی رہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ خود ہی میرا پیچھا چھوڑ دے۔“

”مگر وہ تو خود تمہارا دیوانہ ہے تمہیں نہیں چھوڑے گا۔ میں ہی اسے اپنے رات سے ہٹا دوں گا۔“

”یہ تو تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔ خطرناک مرد پسند ہیں۔ تم زبانی دعوے نہ کرو، خطرناک بن کر دکھاؤ۔“

”تم مجھے چیلنج کر رہی ہو۔ میں آج ہی اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔“
 ریتانے کھانے کی چیزوں سے شغل کرتے ہوئے کہا۔ ”سانپ کو اس طرح مارو کہ
 اسے ٹوٹے۔ اس شہر میں اس کا بڑا نام ہے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران اس کی
 دیکھتے ہیں۔ وہ بہت پراسرار ہے، میرا اندازہ ہے کہ وہ یہاں کی اٹلی جنس کا بہت
 اہم آدمی ہے۔ اکثر کئی دلوں کے لئے مجھے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پوچھنے پر کہتا ہے کہ
 بار کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس کا کردار میری سمجھ میں نہیں آتا۔“
 ”کیا تم اسے پراسرار بنا کر مجھے خوفزدہ کرنا چاہتی ہو؟“

”نہیں۔ میں تو تمہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ اسے اس شہر سے دور لے جا کر
 لے لگا دو۔ اس سے میرا پیچھا چھڑاؤ۔ تم نہیں جانتے کہ میں تمہارے پاس آنے کے
 لئے بے چین ہوں۔ میں کل محسن کے ساتھ چند رپور کی پیاز کی بستی میں جا رہی
 تھی۔ پیازی علاقے میں اگر اسے کوئی حادثہ پیش آجائے یا وہ ہلاک کر دیا جائے تو ہم
 پر کوئی شبہ نہیں کرے گا۔“

”گنڈ آئیڈیا۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”میں یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں
 لی وہ تمہارے ساتھ جائے گا، پھر واپس نہیں آسکے گا۔“
 ریتانے بار کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس، چپ ہو جاؤ۔ وہ آرہا

پرکاش نے پلٹ کر دیکھا، چھ فٹ کا قد اور جوان نشے کی ترنگ میں ہاتھی کی طرح
 بنا ہوا آرہا تھا۔ پرکاش نے اپنی مٹھیوں کو بھینچ کر اپنی توت کا اندازہ کیا۔ وہ محسن سے
 لڑائی میں کسی طرح کم نہ تھا۔ اسے ہاتھوں کی قبضگی میں پھنسا کر اس کی گردن توڑ سکتا
 تھا۔ اس وقت محسن کے قریب آتے ہی وہ اخلافا مسکراتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
 نے کسی پر بیٹھے ہوئے ریتا سے پوچھا۔

”تم ہی بیویو انجوائے پور ڈانس؟“

”اوہ شیور۔“ وہ چمک کر بولی۔ ”پرکاش بہت اچھے ڈانس پارٹنر ہیں۔“
 محسن نے پرکاش کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تھینک یو پرکاش! تم نے
 نیکی کو تمہاری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ڈارلنگ! اب ہمیں چلنا چاہئے، وی آر
 لیٹ۔“

وہ بل ادا کرنے کے بعد پرکاش سے رخصت ہو کر محسن کے ساتھ جاتے تھے۔ پہلے چور نظروں کا ہاتھ لگا ہوا کہ جو منصوبہ بنایا گیا ہے اس پر پوری طرح عمل کیا جائے گا۔ کار میں بیٹھنے کے بعد پرکاش کلب میں واپس چلا گیا تو محسن نے ریتو کو اپنی طرف مڑ کر اس کو دبوچتے ہوئے کہا۔

”لٹ می ہواے کس۔“

وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے بولی۔ ”یہ کیا حرکت ہے، کوئی دیکھ کیا کہے گا۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”پارکوں میں، گلیوں میں اور کاروں میں یہی ہوتا ہے۔ کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے پہلو سے اٹھ کر ہماری طرف دیکھے۔ کوئی بات نہیں، گھر پہنچتے ہی قرضہ چکا دیتا۔“

اس نے بڑی درندگی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کار اسٹارٹ کی، پھر تیزی سے اڑا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ غصے سے کہنے لگی۔

”تم بہت ظالم ہو۔ عورت کو تو پھول کی طرح چھونا چاہئے، یہ نہیں جانتے کہ میں نے نہیں دیکھا کہ لوگ ڈانس فلور پر مجھے پھول کی طرح نازک سمجھ کر ہاتھ لگاتے ہیں؟“

”وہ سب تمہارے ناکام حاشق ہیں اور میں تمہارا پتی دیو بن گیا ہوں اور ایک جانتا ہے کہ عورت کو کس طرح چبانا چاہئے۔“

وہ پھر قہقہے لگانے لگا۔ قہقہے کے دوران یوں لگتا تھا جیسے کوئی پہاڑ زلزلے سے جھکا کھارہا ہو۔ وہ ڈرتی بھی تھی اور پہاڑ کے واسطے میں رہتی بھی تھی۔ اپنی کوٹھن میں کئی دن لباس تبدیل کرنے کے لئے ہاتھ روم میں چلی گئی۔ محسن دہسکی کی کیبنٹ کھول کر اس کے لئے ایک جام بنانے لگا۔ وہ لباس بدل کر واپس آئی تو جام خالی ہو چکا تھا۔ اس کی سارا شراب محسن کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

”اودھر آؤ۔“

”میں نہیں آؤں گی۔“

محسن نے آگے بڑھ کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ ”اچھا، تو لوگ نہیں پھول کی طرح چھونے ہیں، انہیں کیا معلوم کہ تم کس طرح قابو میں آتی ہو۔“

اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کراہتی ہوئی اور چیختی ہوئی کہتا۔

یوں میں آئی پھر اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے اسے نوچنے کھوٹنے لگی۔ محسن کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر کہا۔
میں نے کار میں تمہیں چومنا چاہا تم نے انکار کیوں کیا؟ کیا آج کل پرکاش پر دل آگیا

”ہاں۔ آگیا ہے۔“ وہ جھلا کر بولی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ پر ایک طمانچہ بھرا اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے لمبی کی طرح پیچ مارنے کے لئے آگے بڑھی۔ محسن کا طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ اس کے بعد اس کی شامت آگئی۔ وہ اس کے بال پکڑ کر ہاتھ اس کے کپڑے پھاڑ رہا تھا، درندے کی طرح غرا کر کبھی مار رہا تھا، کبھی دانتوں سے رہا تھا۔۔۔۔۔۔ آخر تھک ہار کر وہ صوفے پر گر پڑی۔ پھر ہائے ہائے کہتی ہوئی اس رہنے لگی جیسے ساری خشک حسرتیں سیراب ہو گئی ہوں۔ مہم وہ صوفے پر آیا تو وہ پارے اس کے سینے سے لگ گئی۔ محسن نے ایک بار اسے چومنے کے بعد کہا۔
”یہ حاشق نہیں جانتے۔۔۔۔۔۔ پتی دیو جانتا ہے کہ تم کس طرح قابو میں آتی ہو۔“

☆-----☆-----☆

ہاٹوں پر برف جم رہی تھی۔ گریحوں کا موسم گزارنے والے چندر پور کی بستی خست ہو گئے تھے کیونکہ کبھی کبھی شدید برفباری ہوئی تھی۔ اس وقت بھی دور دور سے مکانات کی دیواریں، کھڑکیاں اور دروازے باہر کی طرف برف سے چھپ گئے ہوائیں تیزی سے سرگوشیاں کرتی ہوئی کانوں کے قریب سے گزر جاتی تھیں۔ وہ ہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا گزر رہا تھا۔ راستے پر اتنی برف جمی ہوئی تھی کہ پاؤں کی اس میں دھنستی جاری تھیں۔ اس کے بدن کی ہڈیوں سے گزرتی ہوائیں کتنے ہی بے سُر سناٹی جارہی تھیں۔

ایک مکان کے اندر آتش دان روشن تھا۔ اس کے قریب ہی بستر پر ایک موٹی بی بی اپنی اس سالہ بیٹی کو ایک بھوت کی کہانی سناتے سناتے سو گئی تھی۔ وہ سو گئی تھی مگر لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کہانی کا بھوت ناچ رہا تھا۔ اس کی ماں نے سناتے وقت کہا تھا۔

”شہلا بیٹی! ہمارا عقیدہ ہے کہ آدمی مرنے کے بعد دوسرا جنم لیتا ہے۔ اگر وہ اپنی ماں اچھے گرم کرتا ہے تو دوسری بار پھر آدمی بن کر جنم لیتا ہے۔ اگر باپ کرتا ہے تو

بھوت بن کر اس دنیا میں بھٹکتا رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک آدمی تھا، اس کا نام جیون رام تھا۔ اپنی پتی کو بہت ستاتا تھا اور اپنی چھوٹی سی بچی کو بہت نارتا تھا۔ اس لئے وہ مرے کے بھوت بن گیا۔

شیلا نے معصومیت سے کہا۔ ”ممی! مجھ کو پاپا بہت نارتے تھے آپ کو بھی مرے لواتے تھے۔ کیا وہ مرنے کے بعد بھوت بن گئے ہوں گے۔“

”تم بچ میں مت بولو۔ چپ چاپ کہانی سنتی رہو۔ ہاں تو وہ جیون رام مرے کے بھوت بن گیا اور اپنی کرنی پر پچھتانے لگا۔ بھوان نے اس سے کہا اگر تیری جی اور جی بیٹی تجھے معاف کر دیں گی تو میں تجھے نرک سے نکال کر آدمی کے روپ میں پھر اس دنیا پر بھیج دوں گا۔ تب جیون رام اس دنیا میں آکر اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو تلاش کرنے لگا۔ ماں بیٹی پر اپنا مکان چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلی گئی تھیں۔ جیون رام بھرت بن کر رہا تھا اور گھر گھر باکران کا پتہ پوچھتا تھا لیکن اسے دیکھتے ہی لوگ ڈر باتے تھے اور بتانے سے پہلے ہی اپنے اپنے گھر کے دروازے بند کر کے چھپ باتے تھے۔“

”ہائے بچارہ۔“ ننھی شیلا نے ہمدردی سے کہا۔ ”وہ بیچارہ اپنی بیوی کو ڈھونڈ رہا تھا وہ لوگ اس کا پتہ کیوں نہیں بتاتے تھے ممی؟“

یہ سوال کرتے ہوئے اس نے ماں کی طرف دیکھا تو وہ کہانی سناتے سناتے سو گئی تھی۔ اس نے ماں کو آواز دی۔ پھر جواب نہ پا کر اس اور وری کہانی کو اپنی بچی عقل پوری کرنے لگی۔ مگر وہ جیون رام کا بھوت اپنی بیٹی تک کیسے پہنچے گا، اس کی سمجھ نہیں آیا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک سنائی دی۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آدمی رات گزر چکی تھی، باہر برف کا طوفان ایسے وقت کون آسکتا تھا۔ کیا پاپا آگئے؟ نہیں..... جیون رام ہو گا۔ وہ اور وری مکمل ہونے کے لئے اس کے دروازے پر آگئی تھی۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی بیٹے سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ دل ڈر رہا تھا مگر خوف سے زیادہ ہمدردی کا جذبہ تھا کہ جیون رام کو معاف کر دے اور وہ انسان کے روپ میں اپنی بیٹی کے پاس پہنچ جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پاپا بھوت بن گئے ہوں اور وہ اس کی ممی سے اور اپنی سے معافی مانگنے آئے ہوں۔ وہ معاف کر دے گی اور پھر اس کے پاپا آدمی بن جائیں گے۔ وہ مارتے تھے تو کیا ہوا، نانیوں بھی تو لاتے تھے۔ وہ سوچتے سوچتے بیردنی دروازے پر

مئی۔ اسی وقت وردازے پر دوبارہ دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی باہر سے آواز

کوئی ہے..... ہے ہے ہے.....
پچھنے والے کے منہ کی ہڈیوں سے ہوا پھسل رہی تھی، اسی لئے ”کوئی ہے“ کے
اف طور سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ رات کے منائے میں ”ہے ہے“ کی آواز
اتھر رہی تھی۔ شیلانے بند وردازے کی طرف دیکھا۔ اوپر چنچلی لگی ہوئی تھی،
نہتے ہاتھ دہل تک نہیں پہنچ سکتے تھے، اس نے پوچھا۔

”تم کون ہو..... کیا تم میرے پاپا ہو؟ دیکھو پاپا! میں بہت چھوٹی ہوں، ابھی ایک
اگر اس پر چڑھوں گی، پھر وردازہ کھولوں گی۔“
باہر سے آواز آئی۔ آواز سرد ہواؤں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ”وردازہ نہ کھولو، تمہیں
لگ جائے گی۔ میں اس مکان کے مالک سے ملنے آیا ہوں۔ تمہارے پاپا کا نام کیا

”میرے پاپا کا نام مرلی دھر تھا..... تم میرے پاپا نہیں ہو تو پھر جیون رام ہو؟“
”جیون رام نہیں ہوں۔ میں اس مکان کے مالک سے ملنے آیا ہوں۔ وہ میرا
ہے اور اس کا نام محسن ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک لفافہ ہے۔ اس کے اندر جو خط
اس سے پتہ چلا ہے کہ محسن نے مجھے قتل کیا تھا۔ وہ اس مکان کا مالک ہے۔ اس خط
کا مکان کا پتہ لکھا ہوا ہے۔“

شیلانے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”مئی نے مجھے بتایا ہے کہ ممب میں آٹھ برس
لا تو پچائے ایک مسلمان سے یہ مکان خریدا تھا۔ تم نے اس کا نام کیا بتایا ہے؟“
”محسن۔“ ایک سرد ہوا کے جھونکے نے کہا۔

”ہاں۔ شاید اس مسلمان کا نام محسن ہی تھا۔ مئی کہتی تھیں کہ وہ مکان بیچ کر فیض
بلا گیا تھا۔“

”فیض آباد۔“ سرو ہوا کے جھونکے بڑبڑانے لگے۔ ”میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔
ننا اس لئے آسان ہے کہ اس کے ساتھ ایک حسین عورت ہوگی جو لاکھوں میں پہچانی
ہے۔ میں اپنے قاتل کو پہچان لوں گا۔ تمہارا شکریہ بے بی..... باؤ سو باؤ، اچھے
اتنی رات تک نہیں جاگتے۔“

باہر شدید برفباری میں وہ آواز گم ہو گئی۔ شیلہ اسے آوازیں دینے لگی۔ اہلکار اس کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔

”شیلہ! تم وہاں کیا کر رہی ہو، کسے آوازیں دے رہی ہو؟“

وہ دودڑتی ہوئی ماں کے پاس آئی۔ پھر حیرت اور مسرت سے بولی۔ ”مئی! وہ کمال ہے۔ بھوت آیا تھا۔ مگر وہ جیون رام نہیں تھا۔“

”نیکو اس مت کرو۔ کمائی صرف کمائی ہوتی ہے۔ چلو یہاں آکر پیپ چاپ سو جاؤ۔“
ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ پھر اسے اپنی آغوش میں جھپٹ لیا۔
بعد تھک تھک کر سلائے لگی۔

☆-----☆-----☆

حسن نے چندر پور کے ایک ریٹورنٹ کے سامنے کار روکتے ہوئے کہا
”ریتا..... ایک ایک کپ کافی ہو جائے۔ بڑے غصہ کی سردی ہے۔ اس برفباری میں
تم اپنا مکان فروخت کرنے آئی ہو، کمال ہے۔“

کار کی بھیلی سیٹ پر ریتا کا مکان خریدنے والے وہ گاہک بیٹھے تھے۔ وہ بھی اس کے
ساتھ کافی پینے کے لئے ریٹورنٹ میں آگئے۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد مکان خریدنے
والے ایک سیٹھ نے ریتا سے کہا۔ ”شرمیستی جی! میں نے مکان کے کاغذات دیکھے ہیں۔
مکان لکھا ہے؟“

ریتا نے جواب دینے کے بجائے حسن کی طرف دیکھا، حسن نے جواب دیا۔ ”یہ
کے ذاتی معاملات ہیں۔ جب کاغذات چکے ہیں تو پھر آپ کو کوئی دوسرا سوال نہیں کرنا
چاہئے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے حسن صاحب۔ مگر ہم ڈرتے ہیں کہ بعد میں راجندر متہ اپنا
مکان کے لئے گھپلانا کرے۔“

”وہ کہاں سے آئے گا۔ وہ تو مرچکا ہے۔ آپ میری اسٹیٹ ایجنسی کے ذریعے رہنا
مکان خرید رہے ہیں۔ لہذا میں آپ کی نسلی کے لئے بتا دیتا ہوں کہ راجندر ریتا کا بیٹا
تھا۔ اس نے شادی سے پہلے ہی اپنا مکان اس کے نام لکھ دیا تھا۔ مگر موت کبھی بوجھ
نہیں آتی۔ وہ شادی سے پہلے ہی مر گیا۔ یا یوں سمجھئے کہ تقدیر نے ریتا کو میرے نام لکھ دیا۔“

اس لئے یہ میری پتی بن گئی ہے۔ اب میں نہیں چاہتا کہ پہلے مگسٹر کی کوئی نشانی میری کے پاس رہے، اس لئے ہم اسے فردخت کر رہے ہیں۔“
 ”میں خود نہیں چاہتی۔ مہر سے پتی کے پاس دھن دولت کی کمی نہیں ہے۔ آپ لگی ہیں، بہت سستے داموں میرا مکان خرید رہے ہیں۔“

کافی بچنے کے بعد وہ پھر کار میں آکر بیٹھ گئے اور ریتا کے مکان کی طرف جانے لگے۔ سڑکوں پر سے برف چٹائی جا رہی تھی۔ وہ دس منٹ کے بعد ہی ایک مکان کے سامنے گئے۔ چوکیدار جلدی سے پیچھے لاکر دروازے کے سامنے سے برف ہٹانے لگا۔ وہ تقریباً گھنٹے تک مکان کو اندر سے دیکھتے رہے اور رقم کی ادائیگی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہ طے ہو گیا کہ فیض آباد پنچ کر مکان خریدار کے نام منتقل کروایا جائے گا۔ محسن واپسی میں انہیں بستی کے باہر ٹیکسی کے اڈے پر پہنچا دیا اور ریتا کے ساتھ پھر واپس لے لگا۔

اس وقت شام کا دھندلا رات کی تاریکی میں مدغم ہو رہا تھا۔ محسن نے مکان کے منے کار روکتے ہوئے کہا۔

”ڈارلنگ! چلو ذرا برف میں پیدل چلیں۔ میدانی علاقوں میں یہ نظارے کہاں ملتے، ذرا تفریح رہے گی۔“

وہ کار سے باہر آگئے۔ ریتا نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”یہاں دور دور تک کیسی دیرانی ہے۔ مجھے دیران علاقوں میں بہت ڈر لگتا ہے۔
 ماہ ہے کہ یہ مکان فردخت ہو رہا ہے۔“

محسن نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
 ”جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر کس کا ڈر ہے؟ اس برف باری میں کوئی بھوت گے گا تو وہ بھی سروی سے ٹھکڑ کر مر جائے گا۔“
 ”بھوت کا نام نہ لو، مجھے ڈر لگتا ہے۔“

محسن نے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تعب ہے کہ تم بھوت سے ڈرتی ہو۔ کیا نہیں جانتیں کہ انسان تو انسان، شیطان بھی عورت سے پناہ مانگتا ہے؟“
 ”جی نہیں، یہ سب مردوں کی کہانی ہوئی باتیں ہیں، درنہ عورت بہت ہی معصوم اور ظہوم ہوتی ہے۔“

”رہتا جانی! تمہارے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ اس دو سال کے عرصہ تمہارے دو عاشق پر لوک سدھار گئے ہیں، اب تیسرے کی بھی شامت آگئی ہے۔“
رہتا غصہ دکھانے کے لئے اس کا ہاتھ جھٹک کر اس سے الگ ہو گئی۔ مگر تیسرا عاشق؟ تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ جھگڑا کر رہا ہے۔“

”نہیں..... اس برہنہاری میں لات گھونے مار کر گراؤں گا تو تم مری جاؤ۔“
”تو سرف بیڈ روم میں ہی جھگڑا کیا جاسکتا ہے۔“

وہ میٹھی ٹارا ننگی سے اسے گھور کر دیکھنے لگی۔ محسن کی پچھلی درندگی نے اس ٹارا ننگی میں مٹھاس پیدا کر دی۔ اسے بت کچھ یاد آ رہا تھا۔ محسن اس کے موڈ کو سمجھ ققبہ لگانے لگا۔ اس کے ققبے برفانی علاقے میں چاروں طرف گونجنے لگے۔ ٹھونڈ۔ جاکر اس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یاد ہے یہ مکان کبھی میرا تھا میں نے مرلی دھرنی ایک شخص کے ہاتھ لیا ہے۔ جب اتنی دور آگئے ہیں تو چلو مرلی دھرنی کی خیریت معلوم کر لیں۔“

وہ رہتا کا ہاتھ تھام کر چلتا ہوا دروازے پر آگیا اور دستک دینے لگا۔ ٹھوڑی دیر بعد مرلی دھرنی پتی نے دروازہ کھولا۔ محسن نے کہا۔

”میں مسٹر مرلی دھرنی سے ملنے آیا ہوں، کیا وہ موجود ہیں؟“

”جی نہیں، ایک سال پہلے ان کا دیسانت ہو گیا ہے، آپ کون ہیں؟“

”میرا نام محسن ہے۔ آپ کے پتی نے مجھ سے یہ مکان خریدا تھا میں پونی لے آیا تھا۔“

اسی وقت کمرے کے اندر سے ننھی شیلہ دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔
”بھوت نے یہی مام بتایا تھا، اس کا نام بھی محسن ہے۔“

محسن نے مسکراتے ہوئے ذرا جھک کر شیلہ کو دیکھا۔ پھر اس کا ٹھوڑی کو بچانے ہوئے پیار سے پوچھا۔ ”اچھا بے بی کیا تم بھوت سے دوستی کرتی ہو؟“

”میں دوستی نہیں کرتی۔ وہ خود ہی کل رات یہاں آپ کو مارنے آیا تھا۔ آپ اس بھوت کو کیوں مار ڈالا تھا؟“

اس کی مٹی نے ڈانٹ کر کہا۔ ”چپ رہو شیلہ! تم بڑوں کے بیچ میں کیوں ہلک پلک

دو اس میں تھا، ہلکی سی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

”ریتا..... تم ڈرائنگ روم میں کیا کر رہی ہو؟ یہاں آجاؤ۔ شراب کی گڑ نہیں ہے۔“

پھر خود ہی اٹھ کر جھوٹا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں پہنچتے ہی اچانک ایک بجلی کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے لہریا۔ وہ بڑی پھرتی سے اچھل کر پیچھے جا کر کی حاضر دہانی نے اسے بچا لیا تھا۔ نقاب پوش حملہ کرنے کی جھونک میں اس کو لڑکھڑایا۔ حسن نے اس کے ہاتھ پر ایک ٹھوکر ماری۔ منجبر اس کے ہاتھ سے نکل جا کر۔ پھر دونوں ہی متحکم گتھا ہو گئے۔ دونوں ہی قد آور اور قوی پیکل تھے اور ہاتھوں کی طرح آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ لڑنے کے دوران حسن نے اس کے چہرہ نقاب کھینچ لیا۔

وہ پرکاش تھا۔ اس نے بے نقاب ہوتے ہی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کھڑکی سے باہر آکر وہ پھر لڑنے لگا۔ کبھی پرکاش اس پر پڑتا تھا اور کبھی وہ پرکاش کے چھکے چھڑا دیتا تھا۔ وہ اندھیرے میں لڑنے لڑنے کا پیچھے پلے گئے مکان کے پیچھے ایک گہری کھائی تھی جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس بات کو سمجھتا تھا کہ اس طرف جانے سے جان کو خطرہ ہے لیکن وہ لڑنے کے سنبھل نہ سکا۔ اس طرف بڑھنے سے خود کو روک نہ سکا۔ جب اس کے اندازہ مطابق وہ گہری کھائی ایک قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو وہ اچانک ہی گر پڑا۔ پرکاش نے اچھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ و ریانے میں گونجتی چلی گئی۔ حسن نے پاؤں پر رکھ کر پیچھے کی طرف اچھال دیا تھا۔ پرکاش اندھیرے میں برف کی دیوار نہ ہو چکا تھا۔ اسی وقت ریتا نے مکان کی پچھلی کھڑکی کھول کر بڑی پریشانی سے پوچھا۔

”حسن! تم اندھیرے میں کس سے جھگڑا کر رہے ہو؟ کون ہے وہ دشمن؟“

حسن نے برف سے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”اپنے عاشق فرحت سے تیسرے کا نام کٹ دو۔ اب وہ صرف بھوت بن کر رہی واپس آسکا ہے۔“

☆=====☆

دوسرے دن وہ دونوں فیض آباد سے واپس آگئے۔ ریتا پچھلی ساری رات سو رہی تھی کیونکہ اس نے اپنے تیسرے عاشق کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

نہی کہ اب محسن اس پر ظلم کی انتہا کروے گا۔ اسے دوسروں سے عشق کرنے کا مزہ
 ہے گا لیکن خلاف توقع اس نے کچھ نہیں کہا۔ اسے مارنے کے لئے ہاتھ بھی نہیں
 صرف بیڈ روم سے باہر نکال دیا تاکہ وہ کھڑکی کھلی رکھے اور اپنے عاشق کا انتظار
 رہے۔ ڈرائنگ روم میں آتش دان نہیں تھا۔ باہر ایسی برہنہ کاری ہو رہی تھی کہ وہاں
 نازات اس کی قلفی جمتی رہی۔

وہ بچن میں جا کر آگ تاپتی رہی اور دل سی دل میں محسن کو گالیاں دے کر سوچتی
 کہ کس طرح اس سے پیچھا چھڑائے۔ اونچی سوسائٹی میں اس کی بڑی مرزت تھی۔ وہ
 مالے کر بدنام ہونا نہیں چاہتی تھی۔ محسن میں یہ خوبی تھی کہ وہ دوسروں کے حاسنے
 بولی کی بہت تعریفیں کرتا تھا۔ اس کی عاشق مزاجی پر پروہ ڈال دیتا تھا۔ مگر چپکے ہی چپکے
 کے عاشقوں کو ٹھکانے لگا دیتا تھا۔

وہ محسن کے سائے میں ہر طرح سے محفوظ تھی مگر آزاد نہیں تھی۔ جوانی میں پر نکل
 تے ہیں۔ ایسے میں اڑنے کی آزادی نہ ملے تو ریتا جیسی عورتیں پنجرہ توڑنے کی کوشش
 لے لیں۔ وہ پھر ایسے ساتھی کی تلاش کرنے لگی جو اسے محسن کے پنجرے سے آزاد کرا
 ۔ محسن بظاہر اس سے لاپرواہی برحقا تھا۔ ریتا کو کلیوں اور تفریح گاہوں میں جانے کی
 ادی دے رکھی تھی۔ ساتھ یہ بھی جتا دیتا تھا۔

”ڈرائنگ! میری معلومات کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ تم میری دی ہوئی آزادی سے
 نوافلہ اٹھاؤ گی تو ہمارا تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا“ وہ تیسرا آدمی جان سے جائے گا جو
 لے درمیان آئے گا۔“

وہ بہت اسارت اور بہت دلیر تھا مگر ریتا کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ایسے مرد
 نہیں تھے جو بالکل ہی حاکم بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ محسن کی دنیا سے باہر کتنے ہی دوست
 ، جو پردانوں کی طرح اس کا طواف کرتے رہتے تھے۔ ریتا کو کسی من پسند ساتھی کی
 شائش بیگناہ نہیں پڑا۔ جگدو نامی ایک نوجوان اس کے سمن کے دربار میں خود ہی ہاتھ
 رکھ کر چلا آیا۔ جگدو بھی ایک دیو کی طرح قوی وکیل تھا لیکن ریتا نے اپنے جنات قسم
 سب عاشقوں کو محسن کے ہاتھوں مار کھاتے دیکھا تھا۔ لہذا جب پہلی بار جگدو نے
 میں کھا کر اسے یقین دلایا کہ وہ محسن سے اس کا پیچھا چھڑائے گا تو ریتا نے صاف طور
 سے انکار کر دیا۔

”نہیں، تم محسن کو مجھ سے زیادہ نہیں جاننے۔ وہ طاقت کے فوٹیلے کی میں نہیں آئے گا۔ تم کوئی اچھی سی تدبیر سوچ کر بتاؤ پھر میں تمہاری طرف جرات کروں گی۔“

جلد یو کو یہ بات بہت بری لگی کہ ریتا اس کی جسمانی قوت پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ ریتا کا مشورہ نہ مان کر اسے مارا مض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ حسین عورت کے بے شمار شیدائی تھے، اب اس کی آغوش میں آنا چاہتی تھی لیکن محسن نے اس طرح دہشت زدہ کر دیا تھا، اس نے کہا۔

”میں اسے چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہوں۔ مگر تم میری طاقت پر بھروسہ نہ ہو۔ جب طاقت استعمال نہیں کی جائے گی تو پھر ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے، دبا کالے جادو سے نارا جائے۔“

ریتا نے کہا۔ ”میں لے کالے جادو کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، آکھوں سے اس جادو کا اثر ہوتے نہیں دیکھا۔ تم کچھ بھی کرو، مگر اس بات کا خیال کہ محسن کو ہم پر شبہ نہ ہونے پائے۔“

”اسے شبہ نہیں ہوگا، جب تک کالا جادو اپنا کام نہ دکھائے تم مجھ سے دور رہنا۔“

”کیا تم جادو جانتے ہو؟“

”میں نہیں جانتا لیکن ایک بہت ہی مشہور جادوگر کو جانتا ہوں۔ اس کا نام ہے مگر وہ پروفیسر سامری کے نام سے مشہور ہے۔“

”ہاں، میں لے سامری جادوگر کی کمائیاں پڑھی ہیں۔“

”یہ کمائیوں والا سامری جادوگر نہیں ہے۔ بہت پہلے یہ ہمارے دیس کا ایک سائنسدان تھا۔ پھر اس کا دماغ چل گیا۔ اس کی لیبارٹری جاہ ہو گئی۔ لوگ کہنے لگے کالے جادو اور سائنس کو گڈنڈ کر کے کالے جادو کو سائنسی علم بنانا چاہتا تھا۔ مگر راجہ سے اس کا دماغ خراب ہو گیا۔“

”تم اس پاگل آدمی سے کیا کام لے سکو گے؟“

”اب وہ پاگل نہیں ہے۔ کتنے ہی لوگ اس کے پاس جاتے ہیں اور اپنی پوری کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری مراد بھی پوری ہو جائے۔“

”میں پروفیسر سامری سے ملاقات کروں گی پہلے اس کی دماغی حالت سے مطمئن ہوں گی پھر ہم اس سے کوئی کام لیں گے۔“
 ”مجھی بات ہے، ابھی چلو۔“
 ”میں ابھی نہیں جاسکتی پہ نہیں محسن کس طرح میری نگرانی کر رہا ہوگا۔ کل صبح وہ سے باہر ہوا ہے۔ کل ہم اطمینان سے پروفیسر سامری کے پاس جا کر اس سے اپنے پیار کی باتیں کریں گے۔“

دونوں نے دوسرے دن ملنے کا وقت مقرر کر لیا۔ پھر وہ جگدیو سے رخصت ہو کر اپنی کونٹھی میں واپس آگئی۔ محسن ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پہ نہیں وہ کس چکر میں تھا۔ ریتا اس کی جتنی بننے کے باوجود اس کی مصروفیات کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ کو دیر سے آیا تو اچھے موڈ میں تھا۔ دوسرے دن بھی وہ اس سے اچھے ہی سوڈ میں ت ہوا۔ رہتا ہے اس کے گلے میں بانٹیں ڈال کر اسے جلدی واپس آنے کی قسمیں مکر دل ہی دل میں کہا۔

”جاؤ رخصت ہو جاؤ۔ میں تو ہمیشہ کے لئے تمہیں رخصت کرنے والی ہوں۔“
 جب وہ چلا گیا تو اس کے ایک گھنٹے کے بعد ریتا کا د میں بیٹھ کر جگدیو کی کونٹھی میں ل۔ وہ انتظار کر رہا تھا۔ ریتا کو ساتھ لے کر سیدھا سامری کی کونٹھی پر پہنچ گیا۔ پروفیسر ل کی کونٹھی کسی عجیب گھر کا نمونہ پیش کرتی تھی۔ ایک بڑے سے ڈرائنگ روم میں ل کے طور پر بڑے سلیقے سے مرودہ کھوپڑیاں اور ڈی کے طور پر خونخوار درندے ہوئے تھے۔ وہاں قدم رکھتے ہی لوگ دہشت زدہ ہو کر پروفیسر سے مرعوب ہو جاتے۔ پروفیسر سیاہ چنچہ پہنے ہوئے ڈرائنگ روم کے ایک چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پرینڈو سے ایک سو گیارہ کا عدد بننا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے بوڑھے رخساروں کی بڑیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ بھی کوئی ڈھانچہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اعلانیے سے سرخ آنکھوں لے جھاکتے ہوئے پوچھا۔

”کیا چاہتی ہے؟ تیری منو کا منا پوری ہوگی۔“

جگدیو نے ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! اس کا پتی بہت ظالم ہے۔ بچے گھر کو سو گ رہتا چاہتی ہے، وہ ترک بنا رہا ہے۔ یہ ایسے ظالم پتی ہے، اپنا بچھا اپنا پتی ہے۔“

پروفیسر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا وہ تیرا بھی پتی ہے؟ اگر نہیں۔
مردہ خط میں نہ بول۔“

جگدیو جھینپ کر چپے ہٹ گیا۔ ریتا آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

”مہاراج! میں بہت پریشان ہوں۔ اپنی ناولی سے ایک مسلمان کے
ہوں۔ دھرم سے بے رحم ہو کر آپ کے پاس سہاگہ کے لئے آئی ہوں۔“

”تو سہاگہ کے لئے آئی ہے، مگر یہ کون ہے؟“

”یہ جگدیو ہے۔ میرا سب سے بڑا ہمدرد ہے۔“

”اپنے ہمدرد سے بول، باہر چلا جائے تیرا کام ہے اس لئے تو یہاں رہے کہ۔
ریتا نے جگدیو کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کہ وہ چلا جائے
خاموشی سے سر جھکا کر چلا گیا۔ اس کے جلنے کے بعد پروفیسر سامری نے اپنے ہاتھ
کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں آکر بیٹھ جا اور مجھے بتا کہ تیرا پتی کون ہے اور کیا ہے؟“

ریتا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ پروفیسر نے کہا۔

”اری ڈرتی کیوں ہے، کیا میں تجھے کھا جاؤں گا؟ ذرا اور قریب آ جا۔“

ریتا کھسک کر ذرا اور قریب آگئی اور محسن کے ہارے میں اسے تانے لگا۔

اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے پتی کے علاوہ وہ سردوں سے بھی عشق کرتی تھی۔
پروفیسر نے کہا۔

”تو کہتی ہے کہ وہ خطرناک ہے۔ مگر تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ خطرناک ہے۔“

ہمدرد جگدیو نے انظر آتا ہے، کیا یہ تیرے پتی کو ٹھکانے نہیں لگا سکتا؟“

”میرا پتی اس سے زیادہ بلوان ہے۔“

”تجھے کیسے معلوم ہوا..... کیا تیرے پتی نے جگدیو کی پٹلی کی ہے؟“

کچھ چھپائے گی تو میں تیرے کام نہیں آسکوں گا۔“

یہاں کو جو ہو کر تمام باتیں بتائی پڑیں کہ کس طرح اس کے پہلے ماش

ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ اب وہ نہیں چاہتی کہ جگدیو بھی مارا جائے۔ اسی لئے

استعمال کرنے کے بجائے پروفیسر کے کانے علم سے فائدہ اٹھانے آئی ہے۔ پروفیسر

”جہاں آدمی کے شریر کی طاقت کام نہیں آتی، وہاں میرا دماغ کام کرتا ہے۔“

ہاں چاہئے کہ میں حیرے جگہ پر اور محسن سے زیادہ بلوان ہوں، اس لئے کہ میں ہی
 رہا آسکتا ہوں۔“

ہم اسکا ہوں۔
 پھر پہلے پہلے دانت نکال کر ہنسنے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر
 پورے کھینچ لیا۔ ریتا کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ بوڑھا بھی اس پر مرے گا۔
 اپنی طرف کھینچ لیا۔ ریتا کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ بوڑھا بھی اس پر مرے گا۔
 مانا کہ اس کی پتی ہی کمر پر بوڑھی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ بڑی مشکل سے خود
 اکر اس سے دور ہو گئی۔ پھر غصے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

یہ کہا حرکت ہے۔ کیا تم نے مجھے کوئی بازاری عورت سمجھا ہے؟“
 روپفر نے دانت نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو بازاری نہیں ہے مگر اونچے
 کی عاشق مزاج ہے۔ جگدو چو تھا ہے پانچویں نمبر پر میرا نام لکھ لے اور یہاں سے
 ڈے دماغ سے سوچ کہ کون تیرے کام آسکتا ہے۔ تو مجھے بوڑھا نہ سمجھ۔ میرا دل
 ہے میں ایک پھوک میں محسن کو اڑا دوں گا۔ بسب بھی اس سے پیچھا چھڑانا ہو
 پاس چلی آئے اب بھاگ سہا یہاں سے تیرے جیسی یہاں کتنی ہی آتی رہتی
 بھاگ یہاں سے۔“

دھم سے پاؤں پھینتی ہوئی باہر آگئی۔ جبکہ یو کار میں بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔
 نے رتا کو دیکھتے ہی پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“ تم غصے میں نظر آ رہی ہو؟“
 وہ کار میں بیٹھ کر ایک جھٹکے سے وردازے کو بند کرتی ہوئی بولی۔
 ”تم کس کہہ کے پاس مجھے نے آئے ہو۔ وہ بوڑھا ہڈی کا ڈھانچہ مجھے اپنی گود
 رہا تھا“ کمینہ۔ بد معاش۔“

جلدوں نے غصے کا پتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس نے ایسی ذلیل حرکت کی ہے تو میں اس کا گلا دباتا ہوں۔“

”محمود۔ ہاگن نہ بنو۔ وہ بوڑھا بہت خطرناک ہے۔ اگر اس نے جادو کے ذریعے نقصان پہنچایا تو پھر مجھے تمہارا سہارا بھی نہیں ملے گا۔“

بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میں اس بوڑھے سے سمجھ لیں گا۔ اس کی یہ مجال کہ تمہیں ہاتھ لگائے
میں یہ بھی برواشت نہیں کر سکتا کہ محسن تمہارے قریب آئے۔ میں ایک ہی گھر
اے ناک آؤٹ کر سکتا ہوں مگر تم مجھے ردک دیتی ہو۔“

”مرود غصے میں پاگل ہو جاتے ہیں۔ میں نے پرکاش دغیرہ کا انجام دیکھ لیا ہے۔
تمہیں محسن کے پاس جانے کی کبھی اجازت نہیں دوں گی۔ غصہ تھوک دو، آج ہی
ہوں۔ ہمارے درمیان کوئی دیوار نہیں ہے۔ یہ سنہری موقع غصے میں ضائع نہ کرو۔
جگدو خوش ہو کر مسکرانے لگا۔ وہ ریتا کو لے کر سیدھا اپنی کونٹھی پر آیا۔
میں پہنچ کر ریتا تھکے ہوئے انداز میں ہائے کھتی ہوئی بستر پر مگر پڑی۔ بستر سے اٹھ کر
”ہائے“ ایک ہلاوہ تھا۔ جگدو نے مسکراتے ہوئے مینٹل ٹیبل پر سے دھکی کر
اٹھالی۔ پھر ایک پیگ بنا کر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

”یہ جام تمہاری جوانی کے نام ہے..... میسر.....“

یہ کہنے ہی اس نے شراب حلق سے اتار لی۔ پھر آگے بڑھا مگر گلاس اس کے
سے چھوٹ گیا۔ وہ خود بھی گلاس کی طرح فرش پر آگیا اور تڑپتے ہوئے اپنے بچے
حلق کو سہلانے لگا۔ ریتا گھبرا کر بستر سے اٹھ گئی۔ اس کے پاس فرش پر آگے چل کر
وقت تک وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

وہ اس صورت حال سے بالکل ہی بوکھلا گئی۔ جگدو کے جسم کی رنگت بد
تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شراب میں زہر ملا ہوا تھا۔ وہ فوراً ہی
اٹھ کر بھاگتی ہوئی اپنی کار میں آکر بیٹھ گئی۔ کسی نے اسے جگدو کے ہمارا دہاں اٹنے
دیکھا تھا۔ مگر دیکھ لی جاتی تو وہ زہر دینے کے الزام میں پکڑی جاتی۔ اس سے پہلے
اسٹارٹ کر کے تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی اپنی کونٹھی میں آگئی۔

اپنی چھت کے نیچے پہنچ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ ایک بہت بڑی
میں پھنسنے سے بچ گئی تھی۔ اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا کہ
میں زہر کس نے ملایا ہو گا؟ بیڈ روم میں پہنچتے ہی جواب مل گیا۔ محسن بستر پر پانا
رکھے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بڑے اطمینان سے

”کیا جگدو کا کریا کرم ہو چکا ہے؟“

ریت کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ ایک پل میں ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں۔ اس کا راتے لگا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفے پر آکر بیٹھ

اس کے کانوں میں محسن کی آواز گونجنے لگی۔
 ”تم مجھ سے کتنی دور بھاگو گی؟ تم جہاں جاؤ گی میرے ہاتھ تمہارے چاہنے والے کی
 ل تک پہنچ جائیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو مگر میں تمہیں
 رہا رکھا دوں گا یا پھر تم اسی طرح بھاگتی بھاگتی مر جاؤ گی۔ نفرت کے باوجود ایک بات
 دونوں میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ تم اذیت پسند ہو اور مجھے ایسی ہی عورتیں پسند
 تم نے آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا دھن دیا ہے اور تم یہ دھن نبھاؤ گی۔ اب
 بن نہ ہو تو کسی پانچویں عاشق کو تلاش کرو۔“

دو جواب میں کیا کہہ سکتی تھی۔ اس کے پاس عام عورتوں کی طرح آنسو بہانے کا
 ہی ہتھیار رہ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی، دونوں
 پھیلا کر اس پر گر پڑی۔ پھر اس کے سینے پر مر رہ کر رونے لگی۔

☆-----☆-----☆

محسن اس کے لئے ایسا نوالہ بن گیا تھا جسے وہ نگل سکتی تھی نہ اگل سکتی تھی۔ عاشقوں سے مدد حاصل کرنے کے دوران وہ محسن کو برابر اگلنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب اس کے دل میں دہشت بیٹھ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ محسن کی آغوش میں جا کر سوچتا کہ مرد ہو تو ایسا ہو۔ عورت کو مدہوش بھی کر لے اور مرعوب بھی۔ وہ مرعوب ہو کر سوچتی تھی۔ مگر جب پردانے اس کے چاروں طرف منڈانا شروع کر دیتے تو وہ ہلکا ہو کر سوچنے لگتی کہ ایک ہی پنجرے میں قید ہو کر زندگی گزارنا حماقت ہے۔ محسن نے جہل اور بھی ہیں۔

اس کی تھکن مزاجی پھر اسے بھڑکالے لگی۔ بس ایک کوشش اور کرنی چاہئے ہے کہ اس بار محسن سے پیچھا چھوٹ جائے۔ اس مرتبہ انسانی طاقت سے نہیں بلکہ قوت سے کام لینا ہو گا۔ مگر اس مقصد کے لئے اس بوڑھے خبیث جادوگر کے پاس ہو گا۔ بوڑھے سامری کے تصور سے ہی اسے کراہت سی ہوتی تھی۔ مگر آخری بار اس کی امید صرف اسی کی ذات سے تھی۔

وہ دودن تک شدید الجھنوں کا شکار رہی۔ دل کسی طرح بوڑھے کی طرف نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس کا فردر اسے سمجھا رہا تھا کہ بوڑھے سامری کی مدد حاصل کرنا محسن ہمیشہ اس کے سر پر سوار رہے گا۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ بوڑھا اس کے کاندھے پر سوار ہو گیا ہے۔ وہ اسے اپنے کاندھے سے اتارنا چاہتی تھی۔ بوڑھا اپنی دونوں ٹانگیں اس کی گردن میں قینچی کی طرح پھنسا دیتا ہے اور وہ کھنکھاتے ہوئے کہتا ہے۔

شاید ریتالے کبھی سندباد جہازی کی کہانی پڑھی ہوگی۔ سندباد کے کاندھے پر بوڑھا اسی طرح سوار ہو گیا تھا۔ وہی بوڑھا جادوگر سامری کے روپ میں اب اس کے کاندھے پر سوار ہو گیا تھا۔ ریتالے اس کے بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی اور وہ

نکال کر کہہ رہا تھا۔
 ”جوان عورت کبھی خالی نہیں رہتی۔ اسے ایک کے بعد دوسرے کا بوجھ اٹھانا پڑتا
 اگر تو ایک سے نجات حاصل کر لے گی تو دوسرا کسی بہانے چلا آئے گا۔ میں نے تجھے
 سے نجات دلائی ہے، اس کا معاوضہ تو وصول کرنے دے۔“

دنات سے کاندھے پر اٹھائے ایک پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ صبح سے شام
 شام کے بعد رات آگئی۔ رات کے وقت اس بوڑھے پر غنودگی طاری ہوئی تو ریتا
 اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اسے ایک گہری کھائی میں پھینک دیا۔ اسے یوں لگا جیسے
 اس بوڑھے کے ساتھ خود بھی گہری پستی میں لڑھکتی جا رہی ہو۔ اسی گھبراہٹ میں اس
 کچھ کھل گئی۔

وہ بڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھی صبح ہونے والی تھی۔ اس کے پاس ہی بستر پر محسن گہری
 دوہا تھا۔ اس نے خواب میں اس دیو سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ مگر آنکھ کھلتے ہی وہ سامنے
 د تھا لیکن وہ خواب میں بھی اس سے پیچھا چھڑا کر مطمئن نہیں تھی۔ کیونکہ بوڑھے
 سے قید کر لیا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کس کی قید میں رہنا بہتر ہے۔ جوان کی قید
 ابوڑھے کی؟

وہ جوان بے حد خطرناک تھا۔ کتنے ہی کزیل جوان عاشق اس کے ہاتھوں مارے گئے
 ریتا کی کوئی چالاکی بھی کام نہ آتی تھی۔ اسی لئے اب وہ بوڑھے کو ترجیح دے رہی
 اس خواب نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ ذرا چالاکی سے کام لے تو اس بوڑھے سے
 پیچھا چھڑا لے گی۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کا سر پھیل دے گی یا کھانے میں
 اسے کراسے ہلاک کر دے گی۔ بوڑھا کتنا ہی شاطر ہو، جوان عورت کے چھل فریب
 اچلے گا۔

صبح دس بجے جب محسن حسب معمول گھر سے چلا گیا تو وہ گھنٹہ بھر تک سنگھار کرتی
 اس نے بہترین لباس پہنا، بہترین خوشبو لگائی۔ پھر بوڑھے جادوگر پر اپنی جوانی کا جادو
 پہنچا گئی۔ اسے دیکھتے ہی بوڑھے کا منہ خوشی سے کھل گیا۔

”میں جانتا تھا کہ تو ضرور آئے گی۔ کیونکہ تیرے جیسی عورت جب اپنے پتی سے
 کٹتی ہے تو اس بے چارے کو ترک میں پہنچانے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا
 کرتی ہے۔“

بوڑھے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسے چومتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ ہاتھ میرا اب تیرا پتی اسے کبھی نہیں پکڑ سکے گا۔“

ریتا نے بڑی کراہت سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا کیونکہ بوسہ لینے وقت اس کی رال ٹپک گئی تھی۔ مگر اس نے ٹھیک کہا تھا، ایسی عورتیں بڑی سے بڑی قیمت پر ہیں۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لیبارٹری کی طرف لے جانے لگا۔ ریتا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”نزدان کے راستے پر..... چپ چاپ چلی آ۔“

”تم..... تم محسن کو کس طرح راستے سے ہٹاؤ گے؟“

”تو نے اپنی جو پتا سنا لی ہے اور تیرے پچھلے عاشقوں کا جو حال ہوا ہے اس سے نے سمجھ لیا ہے کہ تیرا پتی کچھ خطرناک ہے۔ میں اس کا سامنا نہیں کروں گا، میرے اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔“

اس نے لیبارٹری کا دروازہ کھول دیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے بو منظر دکلا۔ اسے دیکھتے ہی ریتا غوف سے چیخ پڑی اور بوڑھے سے بچنے لگی۔ لیبارٹری کے ایک کمرے میں مرہ انسانوں کے ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔ بوڑھا اس کے لپٹنے سے تھوڑی دیر تک محفوظ ہوتا رہا پھر اس نے تسلی دینے کے انداز میں اسے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اری ڈرتی کیوں ہے۔ ان ڈھانچوں میں جان نہیں ہے۔ ان میں صرف الی جان پڑتی ہے جب میں چاہتا ہوں۔ یہ میری مرضی کے بغیر تیرے قریب نہیں آسکتے گے۔“

وہ سہم کر بولی۔ ”میں اندر نہیں جاؤں گی۔“

”اندر نہیں جائے گی۔ ان ڈھانچوں کو نہیں سمجھے گی تو محسن کا زہر ڈھانچے نہیں چھوڑے گا۔“

اسے مجبوراً لیبارٹری کے اندر جانا پڑا۔ اندر پہنچ کر بھی وہ بوڑھے سے ٹپک لگی۔ اس لیبارٹری میں کبھی بہترین سائنسی آلات تھے۔ اب بھی وہ چار مشینیں تھیں۔ مگر ان کے ساتھ استخوانی ڈھانچوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سامری جاوگر نے ڈھانچے کے پاس لے کیا اور اسے چھوتے ہوئے ریتا سے بولا۔

”نہیں ہاتھ لگا کر دیکھ میری موجودگی میں یہ تجھے کبھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“
 ریتا نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ لگایا۔ ان ڈھانچوں پر پتلی سی کھال منڈھی ہوئی تھی۔
 ہوئی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ مگر ہڈیوں کے درمیان کا خلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بوڑھے

”اس ڈھانچے کے سینے میں اور کھوپڑی میں سائنسی آلات نصب کئے گئے ہیں کالے
 اور دیر پا نہیں ہوتا۔ سائنسی آلات کے ذریعے میں جو کام ان ڈھانچوں سے لے
 ان کوئی جادوگر نہیں لے سکتا۔ رادھر آ۔ میں تجھے بتاتا ہوں کہ یہ میرے تمام چیلے
 راج میرے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔“

وہ ایک چھوٹی سی مشین کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس مشین میں بے شمار چھوٹے
 بیٹن لگے ہوئے تھے ریتا توجہ سے اسے دیکھنے لگی۔ ہر بیٹن کے ساتھ ہدایات کے
 ایک لفظ لکھا ہوا تھا۔ جس بیٹن پر آن لکھا ہوا تھا ’بوڑھے نے اسے ایک انگلی سے

آن ہوتے ہی سامنے کھڑا ہوا ڈھانچہ ہولے ہولے لرزے لگا۔ ریتا نے سم کر
 کے بازو کو تھام لیا۔ بوڑھے نے کہا۔

”ڈرتی کیوں ہے۔ وہ ڈھانچہ اتنا خطرناک نہیں ہے، یہ مشین خطرناک ہے۔ تو اس
 کے چھوٹے سے ٹی وی اسکرین کو دیکھتی رہ جب کبھی یہ ڈھانچہ ہماری نظروں سے
 کن کے پاس جائے گا تو ریڈیائی لہروں کے ذریعے یہ ہمیں اسکرین پر نظر آتا رہے گا۔
 حاشیے کے سامنے جو لوگ ہوں گے، وہ بھی اسکرین پر نظر آئیں گے۔ اب دیکھ، اس
 کے سامنے ”فادرورڈ“ لکھا ہے، میں اسے دباؤں گا تو یہ ڈھانچہ آگے کی طرف بوڑھے
 کہ بیٹن کر دباؤں گا تو یہ دائیں طرف بوڑھے گا اور اسے دباؤں گا تو یہ بائیں طرف
 لگا۔“

دائیں کے بعد دیگرے بیٹن دبا گیا۔ ان کے مطابق وہ ڈھانچہ آگے پیچھے دائیں بائیں
 نہ کرنے لگا۔ بوڑھے نے ریتا سے کہا۔

”یہ تو شرفانہ حرکت ہے۔ اب دیکھ، یہ لڑتا کس طرح ہے۔“
 یہ کہہ کر وہ مختلف بیٹنوں کو دبائے لگا۔ ریتا حیرانی سے ڈھانچے کو دیکھنے لگی۔ وہ
 پہلے ایک بہترین فائزر کی طرح پیترے بدل رہا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑی پھرتی سے

کرائے کے انداز میں چلا رہا تھا۔ ایک میز پر ایک استخوانی کھوپڑی رکھی ہوئی
بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

”اب دیکھو، یہ اپنے دشمن کا گلا کس طرح گھونٹ سکتا ہے۔“

بوڑھا پھر مشین آپریٹ کرنے لگا۔ ڈھانچہ آگے بڑھتا ہوا اس کھوپڑی کے
اور اسے دونوں ہاتھوں کے استخوانی بیجوں میں دبوچ دیا۔ پھر اسے اتنی قوت سے
شروع کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے شکم میں چور چور ہو گئی۔ ریتانے بوڑھے
سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”دشمن فل..... اس سے تو محسن کا باپ بھی نہیں بچ سکے گا تم اسے کس
کیسے پہنچاؤ گے؟“

”اے محسن کے پاس پہنچانا میرا کام ہے، ابھی تم میرے پاس پہنچ جاؤ۔“
یہ کہہ کر بوڑھے نے اسے ایک جھکے سے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔

☆=====☆

اپنی کونھی میں پہنچ کر اسے بوڑھا یاد آتا رہا۔ ساتھ ہی ایکائیاں بھی آتی رہیں۔
جتنی گالیاں یاد تھیں، اسے دل ہی دل میں دیتی رہی۔ بے چاری مجبور تھی ابھی
میں آزاد تلی کی طرح اڑنے کے لئے بوڑھے طوفان کی زد میں آگئی تھی۔ مگر ہزار
وینے کے باوجود وہ اس کی احسان مند تھی۔ جب تک وہ بوڑھے کے پاس رہی تو
کام کی باتیں بتاتا رہا اور منصوبے بتاتا رہا کہ کس طرح محسن کو گھیرا جائے گا۔

ریتانے بوڑھے کو بتایا تھا کہ آج رات وہ محسن کے ساتھ پہاڑ تلی جائے گا۔
کے ریسٹورنٹ میں وہ لوگ کھانا کھائیں گے، وہاں کی میر کریں گے پھر آدھی رات
واپس ہوگی۔ واپسی میں کسی ویران راستے پر وہ ڈھانچہ اس کا راستہ روک سکا
بوڑھے نے اس سے سوال کیا۔

”کیا محسن بھوتوں کے وجود پر یقین رکھتا ہے؟“

”نہیں۔ وہ ان باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔“

”میں بڑے بڑے مذاق اڑانے والوں کو قائل کر چکا ہوں کہ مرود ڈھانچے
انسانوں کی طرح چلتے پھرتے اور بولتے ہیں۔ اب سے پہلے کئی بار میں نے ایسے لوگوں
دروازوں پر اس ڈھانچے کو بھیجا ہے۔ جب وہ آدھی رات کو اسے دروازے پر لے

ساری آنکھوں بھول جاتے ہیں۔“

رہتا کو اچانک کچھ یاد آیا اس نے پوچھا۔

”کیا تم نے چند رپور کی بستی میں بھی کبھی ڈھانچے کو بھیجا تھا؟“

”ہاں۔ ایسے وقت جب وہاں برفباری ہو رہی تھی تو اس ڈھانچے کو میں اپنے ساتھ لیا تھا مگر ان غیر ضروری باتوں سے کیا حاصل ہو گا۔ تجھے کام کی باتیں پوچھنی

پوچھنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ محسن کو ہلاک کرنے کا پروگرام پہلے ہی بن چکا تھا۔ وہ مطمئن ہو چکی تھی اسی لئے اس کا ذہن منہی شیلہ کی طرف بھٹک رہا تھا جس نے جانچنے کی کہانی سنائی تھی۔ اب رہتا سوچ رہی تھی کہ واقعی بھوتوں کا کوئی وجود نہیں ہوڑھے سامری جیسے شعبہ کے باز اچھے خاصے ذہین لوگوں کو بھی خوفزدہ کر دیتے

اس رات وہ پروگرام کے مطابق محسن کے ساتھ پہاڑ تلی گئی۔ وہ بہت خوش نظر آتی تھی اور اپنی آوازوں سے یہ ثابت کر رہی تھی کہ اب وہ محسن کی خاطر ساری دنیا کو بچا رہی ہے۔ محسن نے بھی یہی سمجھا کہ وہ اب راہِ راست پر آگئی ہے۔ اس خوشی میں اسکی کے چھ بیک حلق سے اتار گیا۔ جب وہ بارہ بجے رات کو وہاں سے واپس چلے تو اس کی وجہ سے اس کے قدم بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ کار کی اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے ایک بیک اور چڑھایا۔ پھر ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کرتا ہوا شر کی طرف چل

رہتا اس کے پاس بیٹھی ہوئی کار کی تیز رفتاری سے گھبرا رہی تھی اور اسے سمجھا رہی کہ ذرا آہستہ ڈرائیو کرے۔ مگر وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اس کا دماغ اور اس کے پاؤں کے قابو میں نہیں تھے بس وہ اتنا سمجھ رہا تھا کہ سامنے در تک ایک راستہ چلا گیا ہے اپنے اسے تیز رفتاری سے چلتے رہتا ہے۔ مگر آگے جا کر اس کے سامنے رکاوٹ پیدا ہوئی۔ ایک کار سڑک پر تر چھی کھڑی ہوئی تھی۔ آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ ہیڈ کی روشنی میں محسن دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے متواتر بارن دینے لگا مگر اس کار نے راستہ نہیں چھوڑا۔ مجبوراً اسے اپنی کار روکنی پڑی۔ وہ نشے کی حالت میں اٹھتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا کار کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ اسی وقت سامنے کھڑی

ہوئی کار کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک ڈھانچہ باہر اٹکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
محسن بو کھلا کر بار بار اپنی آنکھیں ملتے ہوئے اے دیکھنے لگا۔ اس کی کمر بھر
آ رہا تھا کہ بھوت کار سے نکل کر کس طرح آسکتا ہے۔ ریتانے خوفزدہ ہوئے
کی اور اس سے کہل۔

”محسن! معلوم ہوتا ہے یہ دی بھوت ہے جو شیلہ کے یہاں تمہیں تلاش کر
تھا۔ یہاں سے بھاگ چلو۔“

محسن نے نشے کی ترنگ میں ایک بڑھک مارنے ہوئے کہل ”میں بزدل نہیں
میں اس بھوت کی ہڈی پٹلی ایک کر دوں گا اور اس کے پاس تو صرف ہڈی اور ہڈی
ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ کر کار کی شیئرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا پرفیسر سامی
آپریت کر رہا تھا۔ اس کے مطابق ڈھانچہ بھی آگے بڑھ کر محسن نے سوچا تھا کہ پڑا
پھانکا سا ڈھانچہ ہے ایک ٹھوکر میں اڑ جائے گا۔ مگر اس سے پہلے ہی ڈھانچے نے
اس کے سینے پر ایک لات ماری۔ ڈھانچے کا نشانہ اس لئے خطا نہیں ہو سکتا تھا کہ
سامی مشین کے چھوٹے سے ٹی دی سکریں پر محسن کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کس پہاڑ
ہے اور اس پر کس طرح حملہ ہوتا چاہئے۔

لات کھا کر گرتے ہی محسن کا آدھا نشہ ہرن ہو گیا۔ اب کی بار وہ جم کر زمین پر
اور آگے بڑھتے ہی متواتر دو ہاتھ مارے ایک ہاتھ ڈھانچے نے روک لیا اور وہ
گیا اور تنکے کی طرح اچھل کر دور جا پڑا۔ وہ جتنی دور جا کر گر اٹھا اتنی ہی بھرتی
کر پھر قریب آگیا۔ محسن نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں مشین
تیزی سے چل رہے تھے۔ مشین کو حرف آپریٹ کرنے والی کلوں سے وہ آہستہ
انسانی ہاتھ اس کی زد میں آکر زخمی ہو جاتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں۔ محسن نے
زخمی ہو کر گرتے گرتے ڈھانچے کے بازو پر کھڑی ہتھیلی کی ایک ایسی ضرب
ڈھانچے کا ایک بازو ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ محسن بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہا
زمین پر گر پڑا۔ اس کی ناک سے اور باپچوں سے لہو رس رہا تھا۔ ڈھانچے نے
لگائی تھیں کہ اس کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔

دوسری طرف ڈھانچے کا ایک بازو ٹوٹ کر گرتے ہو رہا تھا اور حامی پر ٹوٹ

سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ محسن مشینی ڈھانچے پر بھی سبقت لے جائے گا۔ سامری کا ہونے لگا تھا کہ ڈھانچہ اپنے دونوں ہاتھوں سے محسن کا گلا دوپے گا مگر اب اس کا ایک ہاتھ مٹا تھا۔ اس کے باوجود پردیفیئر پھر مشین آپریٹ کر لے لگا۔ اسے امید تھی کہ اب اسی دیر میں محسن اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا کیونکہ وہ بری طرح مار کھانے کے بعد بے گرا تھا کہ دوبارہ نہیں اٹھ سکتا تھا۔

ڈھانچہ اچھل کر اس کے قریب آیا تاکہ اسے ٹھوکریں مار مار کر بائکل ہی زمین کا نہ بنا دے۔ محسن کے چہرے پر اور سینے پر دو زبردست ٹھوکریں پڑیں۔ وہ چیخا ہوا بن کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ ڈھانچہ بھی اس کے پیچھے دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ سطح زمین پر پہنچ کر محسن کا زخم خوردہ جسم ٹھہر گیا۔ ڈھانچے نے پھر ایک لات چلائی محسن نے اپنی آخری م قوتوں کو مجتمع کر کے ڈھانچے کی ٹانگ پکڑ لی۔ پھر اسے پوری قوت سے دوسری طرف بٹک دیا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا پتھر تھا۔ اس پتھر سے ٹکراتے ہی ڈھانچے کی کھوپڑی بے کچھ ٹوٹنے پھوٹنے کی آواز آئی۔ اس کھوپڑی کے اندر جو آلات تھے انہیں کہیں سے سامان پہنچا تھا۔ اب اس ڈھانچے کی آنکھیں اپنے سامنے کا منظر ٹیلی کاسٹ نہیں کر رہی ہیں۔ مشین کے ٹی دی اسکرین پر اندھیرا چھا گیا تھا۔

پردیفیئر حامری خوفزدہ ہو کر کار سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ڈھانچے کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ محسن زندہ ہے یا سر گیا۔ اس کی خبر نہیں تھی۔ کار سے اتر کر دھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ ڈھانچے کی طرح اس کے بھی ٹکڑے نہ لڑے۔ اس نے آزمائش کے طور پر مشین کو پھر آپریٹ کیا۔ چند لمحوں بعد ڈھانچہ نشیبی لمبے سے ابھر کر سڑک کے کنارے آ گیا۔ مگر اس کی حالت عجیب تھی۔ ایک بازو پہلے ہی ہٹ چکا تھا۔ کھوپڑی ترخ کر دو حصوں میں تقسیم ہونے والی تھی اور سامنے کی طرف ہٹ کر سینے پر ٹھہر گئی تھی۔ سینے میں جو آلات نصب تھے وہی اسے کشاں کشاں پردیفیئر کے قریب لے گئے۔ پردیفیئر نے کار سے نکل کر ڈھانچے کو پچھل سیٹ میں ٹھونس دیا۔ رہتا دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ پھر خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولی۔

”مم..... محسن کیسے زندہ تو نہیں ہے؟“

پردیفیئر کی آواز بھی سہمی ہوئی تھی۔ ”حت.....“ تو جا کے دیکھ میرا خیال ہے کہ وہ کھٹکا ہے۔“

”تم کیسے مرد ہو‘ خود نہیں جانتے۔ مجھے آگے بڑھا رہے ہو۔“

”اس میں مرداگی کی کیا بات ہے۔ تو اس کی چٹی ہے‘ تجھے اس کے پاس پہنچنے نہیں کس شیطان سے تو نے شادی کی ہے۔ وہ تو ایسا خطرناک ہے کہ مرے لکھن نہیں آتا کہ مرد نکالے۔ میرا یہ ڈھانچہ بہت قیمتی ہے میں اسے لے کر جا رہا ہوں وہ زندہ بچ گیا تو پھر میرے پاس آئے۔ کوئی دوسری تدبیر کی جائے گی۔“

اس نے ریتا کا جواب نہیں سنا۔ کار انٹارٹ کرنے کے بعد ”خوش ہو گئی۔ اسے قہقہے پھوڑ کر چلا گیا۔ ریتا تھوڑی دیر تک سسے ہوئے انداز میں کھڑی رہی۔ پھر ڈرتے قدم بڑھاتی ہوئی سڑک کے کنارے آئی۔ اس کے دماغ نے سمجھنا ڈرتے بات ہے۔ محسن اس بار اس پر شبہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس بار اس کے کسی عاشق پر حملہ نہیں کیا تھا اور حملہ کرنے والا ڈھانچہ اس کا عاشق نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے اطمینان ہوا تو اس نے نشیب کی طرف دیکھا۔ محسن بڑا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ وہ پریشان تھا اور کراہتا ہوا سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ ریتا نے اچانک آنسوؤں کا چہرہ دکھایا۔ وہ روتی ہوئی اور چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

”ہائے ہائے محسن! یہ تمہیں کیا ہو گیا میری جان..... نہ جانے اس بھوت سے کیا دشمنی ہو گئی تھی۔ دیکھو تو اس نے تمہاری کیا حالت کی ہے۔“ وہ دوڑتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ محسن نے اس کا سہارا لے کر لٹھے ہوئے نقاہت سے کانپتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

”کہاں ہے وہ بھوت..... میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔“

”وہ بھاگ گیا ہے۔ تم بہت دیر ہو محسن! مجھے تم پر ناز ہے۔“

وہ اس کے سہارے لٹکھڑاتا ہوا کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اپنے زلمے بھولنے کے لئے دہسکی یا برائڈی کی ضرورت تھی ریتا نے اسٹیئرنگ سیٹ پر ہاتھ رکھ کر بورڈ سے دہسکی کی چھوٹی سی بوتل نکالی۔ پھر اسے محسن کی طرف بڑھا دیا۔ محسن نے اٹھا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

”تم جانتی ہو کہ میں وہی بوتل استعمال کرتا ہوں جو میرے پاس لاکھڑ ہوتی ہے۔ دیر میں اس ڈھانچے سے لڑتا رہا اتنی دیر یہ بوتل تمہارے قریب تھی۔ مجھے یاد آئے۔ نے اپنے پہلے عاشق کو شراب میں زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ میں تمہارے ساتھ تھا۔“

ار سکتا ہوں مگر تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ اس بوتل کو باہر پھینک دو اور کار ڈرائیو کرو
مزم پٹی کے لئے فوراً ہی گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”تم خواہ خواہ مجھ پر شبہ کرتے ہو۔ تھوڑی دیر بعد یہ بھی کہو گے کہ وہ ہڈیوں کا
انچ میرا عاشق تھا۔“

”میں یہ نہیں کہوں گا۔ دیے تمہارے جیسی ناکام عورتیں مجبور ہو کر بھوتوں سے
عشق کر لیتی ہیں۔ چلو وقت ضائع نہ کرو گاڑی آگے بڑھاؤ۔“

ریتا نے ڈیر لب پر بڑاتے ہوئے دہسکی کی بوتل کو گاڑی کی کھڑکی سے باہر پھینک
پھر کار اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔ ایک ڈھانچے کا سہارا لے کر وہ مصیبت میں پڑ
پڑی۔ گھر پہنچ کر اسے ساری رات محسن کی تیمارداری کے لئے جاگنا پڑا۔ دوسرے دن
پہلی رات کی نیند پوری کرتی رہی۔ تیسرے دن محسن زخموں کے باوجود چلنے پھرنے کے
ل ہو گیا۔ وہ گھر سے باہر گیا تو یہ بھی پردیفسر کے پاس پہنچ گئی۔ پردیفسر نے اسے دیکھتے ہی

”تیرا کوئی عاشق مرنے کے بعد واپس نہیں آیا۔ مگر میرے ڈھانچے کی مشین نوٹے
لے بعد پھرین گئی ہے۔ اس بار محسن اس سے نہیں بچ سکے گا۔“

”اور اگر بچ گیا تو تم مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔“ ریتا نے طنزیہ انداز میں کہا۔
”بیکار بانیں نہ کر میں نے تجھے جیون بھر ساتھ دینے کا وچن نہیں دیا ہے۔ میرا کام
رف محسن کو مارنا ہے۔ میں اس لئے بھاگتا ہوں کہ مجھے اپنی جان پیاری ہے۔ مگر اب
اگے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میرے ساتھ آ‘ میں تجھے جاتا ہوں۔“

وہ پھر اسے لیبارٹری میں لے آیا۔ اس بار جو ڈھانچہ مستعد کھڑا تھا اس کے ہاتھ
ل ایک سائیکسٹر لگا ہوا ریوالتور تھا۔ پردیفسر نے مشین کے پاس پہنچ کر کہا۔

”پہلے دالا ڈھانچہ نہ تھا۔ پچھلے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان ہو یا شیطان
محسن سے نہتا ہو کر مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب ذرا قریب آکر اس اسکرین پر دیکھ۔ اس
ڈھانچے کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرے گا۔“

ریتا قریب آئی تو پردیفسر نے مشین کو آن کیا۔ اسکرین پر سامنے کی دیوار پر ایک
نئی لگی ہوئی تھی۔ اس سختی پر ایک چھوٹا سا نقطہ بنا ہوا تھا۔ پردیفسر مختلف بنوں کو دباتا
جاتا تھا۔ ڈھانچے کا ریوالتور دالا ہاتھ اٹھ رہا تھا۔ اسکرین پر صحیح ٹارگٹ کا ایک دائرہ نظر

آ رہا تھا۔ اس دائرے کی سیدھ پر جب ریو الوور لی ٹال پچھی تو پرو فیسر نے ہاتھ دیا۔ نشانہ بالکل صحیح تھا۔ ایک کھٹ کی آواز سنائی دی اور تختی پر جو نقطہ بیٹھا ہوا ایک سوراخ نظر آ رہا تھا۔ ریتا نے اس نشانے سے مطمئن ہو کر اطمینان کی ایک سانس لی۔ اب یقین ہو گیا تھا کہ حسن ریو الوور کی زد میں آکر نہیں بچ سکے گا۔

”آج آدمی رات کے بعد میں اس ڈھانچے کو لے کر تیری کوٹھی میں آئی ہے۔ باہر کار میں بیٹھ کر مشین آپریٹ کرتا رہوں گا۔ ڈھانچہ تیری کوٹھی کے اندر جانے حسن ریو الوور کی موجودگی میں اس کے قریب آکر اپنے دائرے سے اسے توڑنے کی جرات نہیں کرے گا۔ یہ کھیل زیادہ لمبا نہیں ہو گا۔ ڈھانچہ اس پر فائر کرنے ریو الوور میں چھ گولیاں ہوں گی۔ حسن اس کی سچی نشانہ بازی سے بچ نہیں سکے گا۔ ہلاک کرنے کے بعد یہ داپٹی آجائے گا۔ اس کے بعد تم اپنے ہاں کھول کر اس کی روتی رہنا۔ فرمانبردار بیویاں یہی کرتی ہیں۔“

وہ بہت دیر تک حسن کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بناتے رہے۔ پھر ریتا مطمئن داپٹی آگئی۔ اس رات حسن کے باہر جانے کی توقع نہیں تھی کیونکہ پچھلی رات آئی تو دس بجے حسن ڈنر کے وقت پینے کے لئے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اس رات سیاہ بادل اٹھ اٹھ کر آ رہے تھے۔ وہ گرج رہے تھے اور برس رہے تھے۔ بجلیاں وہ رہ کر کوند رہی تھیں اور بھیانک اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ ہوائیں زور زور سے سیٹیاں بجا رہی تھیں اور فضا بہت ہی دہشت ناک تھی۔

ایسے میں پرو فیسر سامری کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ شدید بارش کی وجہ سے دھندلاہٹ کے پار کا منظر دھندلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود بوڑھے کی آنکھیں تیز تھیں اور احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا۔ ڈھانچے کے ایک پہیہ سی مشین رکھی ہوئی تھی۔ پرو فیسر نے سوچ رکھا تھا کہ ریتا کی کوٹھی کے پہنچ کر وہ پچھلی سیٹ پر آجائے گا۔ اس کے بعد مشین آپریٹ کرے گا لیکن اس مشین کے پاس ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا۔

سڑک بہت ہی خستہ حالت میں تھی۔ جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ اس

دھرے ادھر ڈنگا جاتی تھی۔ کار کے ساتھ ڈھانچہ بھی ادھر سے ادھر ڈنگا رہا تھا۔ ایسے وقت اس کا ہاتھ مشین کے آن والے بٹن پر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈھانچہ بھی آن رکھ بارش اور طوفان کے شور میں مشین کی دھیمی دھیمی سی آواز دب گئی تھی۔ جانچ کے ڈنگا نے کام عمل جاری تھا۔ کار کے بار بار اچھلنے کے باعث ڈھانچے کا ہاتھ بھی پھل اچھل کر مختلف بٹنوں پر پڑ رہا تھا۔ ریو الوور والا ہاتھ اوپر اٹھ رہا تھا۔ پردیسر کی لمبڑی کے پیچھے ریو الوور شلنے پر پہنچ کر رک گیا۔ سڑک تھوڑی دور تک ذرا اچھی بات میں تھی۔ تھوڑی دور تک پردیسر کے نصیب بھی اچھے رہے آگے جا کر کار پھر لگنے لگی۔ بار بار اچھلنے لگی۔ بارش اور طوفان کے شور میں سائیکس لگے ریو الوور نے دور نہیں چلایا لیکن کار بے قابو ہو گئی اور ایک درعت سے ٹکرا کر رک گئی۔ پردیسر کی لمبڑی میں سورخ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھی کھٹا کھٹ فارنگ ہو رہی تھی۔ کیونکہ قاتر الا بٹن بدستور دبا ہوا تھا۔ ریو الوور سالی ہو چکا تھا مگر ڈھانچے کی انگلی نرا ٹکڑ پر چلتی جاری تھی۔ اب تو وہاں مشین کو آف کرنے والا کوئی تھا اور نہ ہی اسے آپریٹ کر کے ڈھانچے کو کوئی باہر نکال سکتا تھا۔ وہ چابی دیے ہوئے کھلونے کی طرح پچھل سیٹ پر بیٹھا ٹرانسنگر بنا رہا۔

ریتا اپنے بید روم میں بے چینی سے ٹل رہی تھی۔ محسن ذرا رنگ روم میں داسکی سے شغل کر رہا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی اور ڈھانچہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ریتا کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی وقت زور کی بجلی کندی۔ ایسی دل ہلا دینے والی آواز تھی کہ ریتا جھج کر بستر پر گر پڑی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ محسن نے شراب کا جام میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون ہے؟“

”درد..... زارا..... زارا..... کھول..... ہو..... درد.....“

سرد ہوائیں دروازے کے باہر تھر تھرا رہی تھیں۔ محسن نے آگر بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پھر ٹیک بیک اچھل کر پیچھے چلا گیا۔ باہر وہی ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی محسن کے زخم پھر تازہ ہو گئے۔ وہ اپنی کمزوری کو سمجھ رہا تھا کہ اس پڑے متاثرہ ہو گا تو ڈھانچے کے ہاتھوں نہیں بچ سکے گا۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔

”کونسا ہو تم؟ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟“

ڈھانچہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کی آواز مرد ہواؤں کی سرسراہٹ تھی۔

”محسن! میرے قاتل..... میں نے تجھے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ آخر یہاں ہی گیا۔“

”میں تمہارا قاتل نہیں ہوں..... تم کون ہو؟“

”میرا نام راجندر ہمتہ ہے۔ میں ریتا کا منگیتر تھا۔ میں نے شادی سے پہلے چند مکان ریتا کے نام لکھ دیا تھا۔ ایسے ہی وقت تم نے میری منگیتر کو اپنی محبت کے جل پھنسا لیا۔ میں تمہاری سازش سے بے خبر تھا لیکن فیض آباد سے میرے ایک دو کاردار نے مجھے ایک خط لکھا کہ تم ریتا کے ساتھ چند رپور آرہے ہو تاکہ مجھے زہر دے کر ہلا کر سکو۔ میرے ملازم نے چند رپور کے اسی مکان کے پتے پر مجھے خط لکھا تھا جسے میں ریتا کے نام کر دیا تھا۔ مگر ان دنوں برفباری ہو رہی تھی اس لئے وہ مکان منقل میرے ملازم کا وہ خط اس دروازے سے داپس ہو کر مردہ خطوط کے ذخیرے میں چلا۔ اس طرح مجھے تمہاری سازش کا علم نہیں ہو سکا۔ ایک ہفتے بعد میں برفباری کے منظر لطف اندوز ہونے کے لئے اس مکان میں آیا۔ اس مکان کی ایک چابی میرے پاس تھی۔ اس کے دوسرے ہی دن تم ریتا کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور میری غفلت سے اٹھا کر میری دہسکی کی بوتل میں زہر ملا دیا۔ وہاں میرا جو چوکیدار تھا وہ تم سے ملا ہوا تھا اس نے میری لاش کو چھپانے کے لئے مسلمانوں کے ایک قبرستان میں نے جا کو دفن دیا۔“

اتنا کہہ کر وہ چند لمحات تک ہانپتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

”وہاں مسلمانوں کی لاشیں نہلا دھلا کر دفنائی جاتی ہیں۔ وہ پاک صاف ہوتے ہیں ان کے قبرستان میں بھی پاکیزگی ہوتی ہے۔ مگر میں ناپاک تھا۔ مرنے کے بعد بھی ناپاک حالت میں قبر کا عذاب سہتا رہا۔ پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ کتنے مہینے اور کتنے سال گئے۔ ایک رات اس غلاف نے میری ہتھیلی پر آکر مجھے وہاں سے دوبارہ اٹھنے پر بل کر دیا۔ اب میں اپنے قاتل کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ میں ابھی تمہیں ہلاک کر دے گا اس کے بعد شمشان گھاٹ پہنچ کر اپنے کسی دھرم والے کی جلتی ہوئی چتا پر لٹ کر جہنم ہو جاؤں گا۔“

حسن نے ذرا پیچھے ہٹے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”فہرہ..... آگے نہ بڑھو میں تمہارا قاتل نہیں ہوں۔ تم مجھے مارنے کے بعد تم مجھے تم بھلی باتیں ذرا اچھی طرح یاد کرو۔ جب میں ریتا کے ساتھ تمہاری کوٹھی میں آساں بن کر آیا تھا تو تم نے داسکی کی بوتل کھول کر دو جام بنائے تھے۔ ایک جام مجھے خا اور ایک خود اپنے لئے اٹھایا تھا۔ پینے کے دوران ریتا نے بتایا تھا کہ تم بہت بڑے شٹ ہو۔ تم اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئے۔ مجھے اپنے فن پارے دکھانے کے لئے تم ساتھ اپنے اسٹوڈیو میں لے گئے۔ اس وقت بھی ہم دونوں کے ہاتھوں میں اپنے شراب کے جام تھے۔ اسٹوڈیو سے واپسی پر پھر میں نے دوسرا جام نہیں لیا اور وہاں در کے لئے بھی نہیں فہرا۔ ریتا کو اپنا مکان دکھانے کے لئے تمہاری کوٹھی سے باہر گیا۔ میرا مکان وہاں سے قریب ہی تھا۔ مگر جب میں ریتا کے ساتھ دوبارہ واپس آیا تو تمہاری لاش پڑی ہوئی تھی۔ تم خود ہی سوچو کہ جب ہم دونوں اسٹوڈیو میں تھے تو تنگ دوم میں کھلی ہوئی بوتل کے پاس ریتا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ اس میں زہر کس نے ملایا ہو گا۔ میں نے یا ریتا نے؟“

”ہاںچہ چند لمحوں کے لئے بالکل ساکت ہو گیا۔ اس پر تمام حقیقتیں روشن ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ریتا معصوم اور نادان ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس نے زہر ملایا تھا۔ میں اس کو پوچھوں گا..... وہ کہاں ہے؟“

”حسن نے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہاںچہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنی ہڈیاں رگڑاتا ہوا بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ ریتا اسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر بستر سے مٹی۔

”نت..... تم یہاں کیوں آئے ہو؟ پر دفسر کہاں ہے؟ اس نے کہا تھا کہ تم حسن ہلاک کرو گے۔ کیا وہ ذرا تنگ دوم میں نہیں ہے؟“

”ہاںچہ نے غت لہجے میں پوچھا۔ ”تم حسن کو کیوں ہلاک کرنا چاہتی ہو؟“

”تم یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟ پرسوں تو تم باتیں نہیں کر رہے تھے۔ پرسوں تم رگنے کی طرح حسن پر حملہ کیا تھا۔“

”اچھا تو تم حسن پر پہلے بھی حملہ کرا چکی ہو؟“

”تم فضول باتیں نہ کرو۔ پروفیسر کہاں ہے؟ دو کس طرح مشین آپریٹ کر رہا ہے۔ تم حسن کو ہلاک کرنے کیوں نہیں جانتے؟“

ڈھانچے نے پھر مرد لہجے میں پوچھا۔ ”پہلے تم میری ایک بات کا جواب دو۔ باز نے راجندر مہتہ کو بھی اسی طرح راستے سے ہٹایا تھا؟“

”ہاں۔ اس وقت میں حسن کو پسند کرتی تھی۔ میں نے راجندر مہتہ کی شراب پر زہر ملا دیا تھا تاکہ وہ منگنی ٹوٹنے سے پہلے ہی زندگی سے ٹوٹ جائے۔ مگر تمہاری بات کا جواب دے دیا، اب حسن کے پاس جاؤ ورنہ وہ بھاگ جائے گا۔“

ڈھانچے نے آگے بڑھ کر اپنے استخوانی پنجوں سے ریتا کی گردن دبوچ لی۔ ”میرا شکار مجھ سے نہیں بھاگ سکتا اور اس وقت وہ میرے شکنجے میں ہے۔“

ڈرائنگ روم میں حسن بیٹھا ہوا ایک نیا جام یا رہا تھا۔ بیڈ روم سے ”آؤنگ آؤ“ کی گھٹی گھٹی سی آواز آرہی تھی۔ وہ مردہ خط ہوا کی زد میں آکر لڑھکتا اور لڑکھڑاتا ہو روم سے باہر آ رہا تھا۔ حسن نے اس مردہ خط کی طرف دہسکی کا جام اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”جیئر..... گڈ لک فاری۔“

دل کے لئے

دس لاکھ مالیت کے نایاب ہیروں کی چوری کا انوکھا واقعہ۔ ایک ڈاکٹر
نے ان ہیروں کو ایسی جگہ چھپا دیا تھا جہاں قانون بے بس تھا۔
ایک ایسی دل کی مریضہ کی کہانی جسے زندہ رکھنے کے لئے دو پانچ ہیرو
لازمی تھے۔

سالگرہ پارٹی ہزاروں کینڈل پادری کی روشنیوں سے جس طرح جگمگا رہی تھی طرح اچانک ہی گہری تاریکی میں ڈوب گئی۔ شاید مین سوچ آف کر دیا گیا تھا۔ بالکل باہر بھی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سڑک کے دوسری جانب سے نیون سائن کی دھند ہوئی روشنی بالکونی کے راستے اندر آ رہی تھی جس میں تمام مہمانوں کے تاریک م یوں نظر آ رہے تھے جیسے بہت سارے بھوت اور بھتیاں آپس میں ٹکرا کر ادھر سے ا گزر رہے ہوں۔

اس اندھیرے میں شہزادی شاہینہ گم ہو گئی تھی۔ سرف اس کی صراچی دار گردن نو لکھا ہار جگمگا رہا تھا۔ گہری تاریکی میں اس کے پانچ عدد ہیرے اپنے چمکتے دیکتے دور کسی دل والے کو لپکار رہے تھے کہ آؤ اور ہمیں اس صبح گردن کی نزاکت سے اندر کر جاؤ۔

اچانک تاریکی چھا جانے کے باعث وہ ماحول کچھ رومانٹک اور کچھ پراسرار سا ہو تھا۔ چند حسیناؤں کے منہ سے سہمی سہمی ہی ہائے نکل رہی تھی۔ پھر یہ ہائے کسی نہ کے بازوؤں میں سمٹ کر گنگناتی ہوئی سسکیوں میں بدل رہی تھی لیکن شہزادی شاہینہ ملے وہ اندھیرا عذاب جاں بین گیا تھا۔ اسے کتنے ہی سائے اپنی طرف بڑھتے نظر آ رہے تھے۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ ان میں سے کون نو لکھا ہار کا لالچی ہے اور ک اس کے جسم کے تکیے کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

شہزادی کے مسلح بازی گارڈز ہال کے اندر آ گئے تھے اور نو لکھا ہار کی چمک دیکھ شہزادی کی سمت بڑھتے ہوئے اور مہمانوں سے ٹکراتے ہوئے، معذرت چاہتے ہوئے تھے۔ ان سے پہلے ہی کسی نے شہزادی کے تکیے جیسے جسم کو اپنی آغوش میں سیٹ لیا۔ سم کر چیخا چاہتی تھی لیکن اس قد آور بھوت نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ چیخنے سے پہ ہی اس کے رس بھرے لبوں کو اپنے سفاک ہونٹوں کے درمیان قید کر لیا۔

اس نے تھلا کر اپنی گرفت سے لٹکنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحہ سمجھ میں آ گیا کہ وہ راکرم آغوش سے نہیں نکل سکے گی۔ اندھیرے میں وہ بھوت ایک آئینہ کی طرح چمکلا رہا تھا۔ گلابی گلابی کھڑے پر اس کی سامنوں کے بھپکے آرہے تھے۔ وہ مدہوش جاری تھی۔ جی چاہتا تھا کہ وہ لمحات طویل ہو جائیں لیکن وہ رنگین سپنا جلد ہی نوٹس طرح بوتل سے گاک اڑنے کی آواز آتی ہے، ویسی ہی آواز سے بوسہ چٹکراڑ گیا۔

مراجی دار گردن سے ایک بوجھ ہلکا ہو گیا۔ شہزادی جیسے ہی اس بھوت کی مسلح محافظ ہال کے وسط میں ہی رگ گئے تھے۔ شہزادی جیسے ہی اس بھوت کی ن میں مٹی تھی، دیے ہی اس نوکھا ہار کے پانچ عدد ہیروں کی چمک بھی اس آغوش لم ہو گئی تھی۔ اس لئے محافظ ٹھٹھک کر یہ سوچنے لگے کہ شہزادی شاید پلٹ کر جاری۔ دوسری طرف گھوڑے کے باعث ہیروں کی چمک دمک چھپ گئی ہے۔ وہ اندھیرے آنکھیں چاڑ چھاڑ کر دیکھنے لگے۔ یہ انتظار کرنے لگے کہ شہزادی کہیں رک کر پلٹے اور

لا کی چمک سمت کا تعین کرے تو وہ اس کی جانب بڑھیں۔

لیکن وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی ہوئی تھی۔ بھوت نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کر لیا۔ اب اس بھوت کا دور دور رک پتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی گرفت اور بوسے لذت میں کھوئی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں کسی کو صورت شکل سے پہچانا نہیں جاتا بلکہ دوسرے کے ہاتھوں اور جسموں کے لمس سے پہچانا جاتا ہے۔ اس نے سامنوں سے اٹھ لگایا تھا کہ اس بھوت کے سینے میں کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا بوسہ اب بھی رے کی طرح اس کے رے بھرے لبوں سے چپکا ہوا تھا۔ اب وہ اس آغوش اور اس سے کو دن کے اجالے میں بھی پہچان سکتی تھی (اگر وہ دوبارہ نصیب ہو جاتا)۔

اندھیرے میں کوئی اس سے ٹکرایا تو وہ رنگین خیالات سے چوک گئی۔ چونکتے ہی سے پہلے اپنے نیکس کا خیال آیا پھر وہ گردن اور سینے پر ہاتھ پھیر کر چیختے لگی۔ ”سیرا کوئی میرے گلے سے ہار نکال کر لے گیا ہے۔“

اس کی چیخ و پکار سے اندھیرے میں کھلبلی مچ گئی۔ مسلح محافظ تیزی سے بھیڑ کو چیرتے لے آواز کی سمت جانے لگے۔ اتنی ہی دیر میں کتنے ہی لوگوں نے اپنے اپنے لائسنس اور اس کی تیلیں روشن کرنی تھیں۔ لائسنس اور دیا سلامتی کی سنسنی روشنیاں پہلے بھی ہو سکتی ہیں لیکن لوجوانوں نے اندھیرے سے فائدہ اٹھالے کے لئے یہ زحمت نہیں اٹھائی تھی

لیکن اب بات دوسری تھی۔ ایک بیرونی ملک کی شہزادی چیخ رہی تھی اور یہ خبر سنا رہی تھی کہ کوئی اس کا نو لکھا ہار چا کر لے گیا ہے۔

اس بیش قیمت ہار کو دو لہند عورتوں نے رشک سے دیکھا تھا۔ ہر عورت کی ہمت تھی کہ دو ہار اس کے گلے کی زینت بن جائے۔ اب وہ خوش ہو گئیں کہ ہمیں نہ سہی 'چلو شہزادی بھی محروم ہو گئی۔ اس ہار کو تمام سردوں نے بھی تعریفی نظروں سے دیکھا تھا۔ یہ سن کر کہ اس حسینہ کے گلے سے ہار خائب ہو گیا ہے، اب ہر مرد کی یہی تمنائیں وہ آگے بڑھ کر اسے تسلی دے اور تسلی دینے کے بہانے ایک شہزادی کے گلے کا ہار بن گئے۔

اس طرح تمام لوگ شہزادی کی طرف بڑھنے لگے اور بڑھنے سے زیادہ ایک دوسرے کو دھکے دینے لگے۔ وہ آپس میں ٹکرا رہے تھے، گر رہے تھے، سنبھل رہے تھے۔ جب بھی شور مچاتی ہوئی گر رہی تھیں۔ ایک عجب قیامت کا شور برپا ہو گیا تھا۔ اسی وقت ام چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔

ایک قیمتی ہار کی چوری سے صاف ظاہر تھا کہ کسی نے مین سوچ آف کر دیا۔ سوچ آن ہوتے ہی عمارت کے باہر بھی روشنی پھیل گئی۔ اتنی دیر میں ایک خوش فہم نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا عمارت کے مین گیٹ سے باہر آچکا تھا اور اب فٹ پاتھ جیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔ دہلی سے پچاس گز آگے ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر شیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور گارلی سٹارٹ کرنے لگا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ حائے سے گزرتے دہلی گاڑیوں کی روشنیاں اس کے چہرے پر سے پھسلتی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے پانچ عدد وہیروں کے متعلق سوچنا چاہئے تھا جو نو گھنٹہ میں جڑے ہوئے تھے اور جو اس وقت اس کی جیب میں رکھے ہوئے تھے لیکن عجب بات یہ تھی کہ وہ خلاف عادت اس حسین اور نازک سے بدن کے متعلق سوچ رہا تھا جو آپا تنگینے کی طرح یوں اس کی آغوش میں سما گیا تھا جیسے نو لکھا ہار اس کی جیب میں سما ہوا تھا۔ اب تو وہ ماحول نہیں تھا اور وہ اندھیرا بھی نہیں تھا۔ وہ حسینہ بھی آغوش میں نہیں تھی لیکن وہ بار بار خیالوں میں آ رہی تھی اور اس لٹیرے کے دل و دماغ کو لوٹ کر لے جا رہی تھی۔

ایک بدنام چور تھا۔ معمولی ذہنیت میں اس کا نام نہیں لیا جاتا تھا لیکن جہاں ہیرے ہرات کے چرائے جانے کی بات آتی تو سب سے پہلے اسی کا نام آتا۔ پولیس والے اس کا بھڑی شروع کر دیتے اور انٹیلی جنس کے بڑے بڑے افسران اس کے پیچھے ہاتھ کر پڑ جاتے تھے۔ ان حقائق کے پیش نظر اسے پہلے اپنے بچاؤ کے متعلق سوچنا چاہئے لیکن افسوس کہ دل و دماغ اپنے اختیار میں نہیں تھے۔ وہ رہ کر اسی نازک اندام ٹھکنے طرف بھٹک رہے تھے۔ اب داستانِ حیات اس رخ پر چل رہی تھی کہ ایک نے اس مرانی دار گردن سے نو لکھا ہار چرایا تھا، دوسری اس چور کے سینے سے دل چرا کر لے لی تھی۔

اس نے کئی بار شہزادی شاہینہ کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن وہ دل کے چور اسے دماغ میں آتی رہی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے پوری طرح دل کے دروازے لے لیے۔ پہلی بار کسی لڑکی نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس لئے اس نے کھلی آزادی دے کر اُڑ اور مجھے لوٹ لو۔ خیالوں میں لٹ کر کوئی کنگالہ نہیں ہو جاتا۔

اس کی یہی سوچ غلط تھی کہ خیال ہی خیال میں کوئی کنگالہ نہیں ہوتا حالانکہ وہ غمی میں آہستہ آہستہ ذہنی طور پر کنگال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ حسینہ بڑی خاموشی سے اس سوچ کے خزانے لوٹ رہی تھی۔ مرد اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ عورت اس میں آکر کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ بگاڑتی اور بناتی رہتی ہے۔ خیالوں سے حقیقی دنیا اگر شادی کے بعد۔

اس نے اپنی کار ایک پولیس اسٹیشن کے قریب روک دی۔ کار کے رکتے ہی ایک سوت میں اویٹر عمر کا شخص تیزی سے آیا اور دروازہ کھول کر پاس والی سیٹ پر بیٹھنے لگے بولا۔ ”کام ہو گیا؟“

”ہاں“ اس نے کوٹ اتارتے ہوئے جواب دیا۔ ”بل کوٹ کی اندرونی میب میں تم بتاؤ تمہارا کام ہو گیا؟“

”ہاں“ اس نے بھی جواب دیا۔ ”میں نے تمہانیدار کو دو ہزار روپے دے دیئے ہیں۔ پیرا نے یہ رپورٹ لکھ لی ہے کہ تم یعنی شاکر جمالی کے مکان پر اس شب کی بناء پر چھاپہ لگایا تھا کہ اس کے ہاں سے کافی مقدار میں چرس برآمد ہو سکے گی لیکن جمال نے شاید یہی چرس کا اشتاک کیس دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا۔ اس کے ہاں صرف ایکش ٹرے

میں پڑے ہوئے ایک ٹوٹے میں چرس کے اجزاء پائے گئے ہیں۔ شام کے چھ بجے جلی کو حراست میں لے کر مالی پور کے تھلے میں لایا گیا اور اسے حوالات میں رکھا گیا۔ تحقیقات مکمل ہونے کے بعد اگر جرم ثابت نہ ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ فی الحال حوالات میں رکھنے کے لئے یہی جرم کافی ہے کہ وہ چرس کا سگریٹ استعمال ہے اور اس سگریٹ کا ٹوٹا اس کی ایٹش ٹرے میں پایا گیا ہے۔"

شاہر جمالی نے تھلے کی جانب دیکھا پھر مطمئن ہو کر پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں شام کے چھ بجے سے اس تھانے کی حوالات میں بند ہوں۔ قصر سلیمان میں ساگرہ پارٹی ہو رہی ہے، وہاں پونے نو بجے جو ہار چرایا گیا ہے، اس چوری سے میرا دل تعلق بھی نہیں ہے۔ مالی پور کے تھانے کی رپورٹ کے مطابق میں شام چھ بجے سے قیدی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ مجھے حوالات سے رہائی کب نصیب ہوگی؟"

"کل صبح چھ یا سات بجے تک تمہیں رہا کر دیا جائے گا؟"

"ٹھیک ہے۔" جمالی نے اپنا کوٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہار ہری کے پاس لے جاؤ اس سے کہو کہ ہار میں سے پانچ عدد ہیرے علیحدہ کر کے ان پلاسٹک کے ڈیڑھ انچ کے کیپسول میں رکھ دے۔ اس کے بعد تم وہ کیپسول لے کر بڑے کے پاس جانا۔ وہ نیازی ہسپتال کے اسپیشل وارڈ کے دو نمبر کمرے میں ہے۔ نین دن بعد اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔ یہ ہیرے تین دن تک اس کے پاس محفوظ رہیں گے پولیس والے ہم سب سے پوچھ گچھ کرتے رہیں گے لیکن ان کا دھیان ہسپتال کی طرف نہیں جائے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے جمالی! مگر ٹینے آج کل ڈاکٹر خادر سے عشق کر رہی ہے۔ ڈاکٹر ہزار ہا بلن سے اس پر فریفتہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ٹینے جذبات کی رو میں بہہ کر ان کے سامنے ہیروں کا ذکر کر دے۔ ایسی صورت میں اس کا عشق ہمارے لئے مصیبت بن جائے گا۔"

شاہر جمالی آنکھیں میکیٹر کر مچنے لگا۔ وہ ٹینے کے متعلق غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "وہ ڈاکٹر خادر سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی انحصار ڈاکٹر کی مسلسل توجہ پر ہے۔ وہ ڈاکٹر کی احسان مند ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے بوجھ تلے دب کر اسے سب کچھ بتا دے۔ بہر حال ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔"

بغداد کہ وہ تین دن تک اپنی زبان بند رکھے۔ اگر ڈاکٹر خادر کو ہیروں کا علم ہوا تو جمالی
وں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ کہہ کر وہ اپنی پتلون بھی اتار لے گا۔ اس نے پتلون کے نیچے پاجامہ پہنا ہوا تھا۔
بہار سے باہر آیا تو اس کے جسم پر قبض اور پاجامہ تھا اور پاؤں میں چپلیں تھیں۔
ما کا ساتھی کار لے کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ پیدل چلا ہوا تھا لے میں آیا۔
نہ ارنے اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر مصافحہ کیا پھر اسے پانچ سو پچپن کا سگریٹ
نہ کرتے ہوئے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ شاکر جمالی کے لئے حوالات کا دروازہ کھول

جمالی نے سگریٹ کا ایک گھبرا کش لیا پھر دھواں چھوڑنا ہوا حوالات کے اندر چلا گیا۔
ایسی حوالات کے آہنی دروازے کو بند کر کے کالا لگا لے گا۔

☆-----☆-----☆

سائیکل پارٹی میں آنے والے تمام مہمانوں کو عمارت سے باہر جانے سے روک دیا گیا
نہ تصر سلیمان کے چاروں طرف پولیس کے جوان سختی برت رہے تھے اور ملازموں کی
ہی تلاشی لئے بغیر انہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ بڑے ہال میں بھی
تلاشی کا سلسلہ جاری تھا۔ مہمانوں میں ملک کے بڑے بڑے رئیس اور حکومت کے اعلیٰ
افسران تھے۔ ان کی جیبوں کی بھی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ سب اپنی توہین محسوس
کر رہے تھے لیکن ایک پرانے دیس کی شہزادی کو لونا گیا تھا۔ اس طرح اپنے دیس کی
لڑنے پر حرف آ رہا تھا۔ لہذا بڑے بڑے لوگوں کو بھی مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی عزت یا
اپنی اوہمی پوزیشن کا خیال نہ کریں اور تلاشی دینے کے لئے چپ چاپ اپنے کپڑے اتار
دیں۔

ایک علیحدہ کمرے میں لیڈی پولیس انسپکٹر اور دو لیڈی کانشیل عورتوں کی باری
باری تلاشی لے رہی تھیں لیکن ایک گھنٹے بعد پولیس والوں کو مایوسی ہوئی۔ وہ نو لکھا ہار
برآمد نہ ہو سکتا۔ خفیہ پولیس کا ایک افسر صدر علی وہاں سادے لباس میں موجود تھا اور ہر
فحص کو گہری نظروں سے دیکھتا اور سوچتا پھر رہا تھا۔ شہزادی ایک بیڈ روم میں آکر ایزی
چیر پر گھٹکے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ملک کے سفارت خانے کے دو افسر اس
کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور اسے یقین دلا رہے تھے کہ وہ قیمتی ہار جلد ہی برآمد کر لیا

جائے گا۔

شہزادی شاہینہ چپ چاپ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب اسے ہار کی ضرورت ہے۔ چرانے والے کی آرزو ہے۔ ہار بلاشبہ قیمتی تھا اور اس میں جڑے ہوئے انجلی حویلیہ لایا ہوا تھا۔ اس ہار کو اپنے گلے کی زینت بنا کر وہ ساری دنیا کو یوں غر سے دیکھتی تھی کہ وہ تمام انسانوں سے برتری کا تمغہ حاصل کر چکی ہو۔ شہزادی کو اس نو لکھا ہار سے اتنی محبت تھی کہ اتنی محبت اسے اپنے ماں باپ سے بھی نہیں تھی لیکن اس وقت وہ بڑی محبت سے سوچ رہی تھی کہ اسے کس کی ضرورت ہے۔ ہار کی یا اندھیرے میں آنے کی بھوت کی؟

صنوبر علی نے بیڈروم میں آکر اسے خیالات سے چونکا دیا۔ اس نے کلمہ ہو شہزادی صاحبہ! آپ اطمینان رکھیں۔ چور کتنا ہی چالاک ہو پھر بھی وہ ہم سے غائب نہ جائے گا۔ ہم بہت جلد اسے ہار سمیت گرفتار کر لیں گے۔

”سچ؟“ شہزادی اسے پرامید نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ صنوبر علی نے سمجھا کہ وہ کے لئے بے چین ہے لیکن وہ چور کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ ”کیا وہ گرفتار ہو جائے گا؟“ ”جی ہاں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ضرور گرفتار کر لیا جائے گا۔“

”سلسلے میں ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“ ”فرمائیے میں آپ کی کس طرح مدد کر سکتی ہوں؟“ ”میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے خاطر خواہ جواب دیا میں ان جوابات کی روشنی میں اس چور تک پہنچ جاؤں گا۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ چور ابھی اسی عمارت میں موجود ہے؟“ ”جی ہاں۔ یہاں پہنچ کر میں نے سب سے پہلے ٹائٹ چوکیدار، دربان اور دیگر ملازموں سے یہی پوچھا ہے کہ انہوں نے کسی کو عمارت سے باہر جاتے دیکھا ہے یا نہیں؟“ ”جب کا بیان یہی ہے کہ مہمانوں میں سے ایک بھی شخص باہر نہیں گیا ہے۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے کہ آپ کے قریب آنے والا کوئی مہمان تھا یا ملازم تھا؟ اور یہ بات آپ بتا سکتی ہیں۔“

”میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ اندھیرے میں وہ نظر نہیں آیا تھا۔“ ”اس کا نظر آنا ضروری نہیں ہے۔ ہم اندھیرے میں کسی کو چھو کر اس کے ہاتھ

معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ مسمانوں کی طرح ڈنر سوٹ میں تھا یا ملازموں کے لباس میں۔ وہ بھی اندھیرے میں آپ سے ٹکرایا ہو گا۔ کیا آپ کو اتنا موقع ملا تھا کہ آپ اسے چھو کر محسوس کر سکیں؟

”ہاں۔ آپ بہت ذہین آفیسر ہیں۔ واقعی میں نے اسے چھو لیا تھا اور یہ یقین سے کہتی ہوں کہ وہ ڈنر سوٹ میں تھا۔ اگر کوئی مسمان باہر نہیں گیا ہے تو ابھی وہ ہال میں موجود ہو گا لیکن آپ محض ڈنر سوٹ کے ذریعہ اس کے گریبان تک کیسے پہنچیں گے؟“
صنذر علی نے کہا۔ ”ڈنر سوٹ سے اتنا تو ثابت ہو گیا ہے کہ وہ کوئی معزز مسمان ہے۔ اب میں آپ سے دوسرا سوال کرتا ہوں۔ نیکلس اتار تے وقت اس کی انگلیاں آپ کی گردن یا جسم کے کسی دوسرے حصے سے ضرور مس ہوئی ہوں گی۔ آپ ذرا اچھی طرح سوچ کر بتائیں کہ وہ انگلیاں موٹی تھیں یا پتلی، سخت تھیں یا ملائم۔ دیکھئے، اندھیرے میں وہ گھبراہٹ میں اکثر عورتیں ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتی ہیں لیکن آپ جیسی کنواری بیویزائیں اس عمر میں بڑی حساس ہوتی ہیں اور کسی بھی مرد کے ہاتھوں کے لمس کو بڑی تنیدگی سے محسوس کرتی ہیں۔ میرے اس سوال میں ذرا بے تکلفی ہے لیکن میں مجبور ہو کر پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ ان اجنبی انگلیوں کو اب بھی محسوس کر سکتی ہیں؟“

شنزادی شایبہ فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ واقعی طور پر زبان چپ ہو گئی اور تصور کے درپے کھل گئے۔ وہ سخت فولادی انگلیاں اس کی گردن پر صرصرانے لگیں۔ بوسے کے دوران ان انگلیوں نے گردن پر پھیلے ہوئے بالوں کو سختی سے جکڑ لیا تھا۔ اسے تکلیف اور ہی تھی لیکن ایسی راحت بھی مل رہی تھی کہ اس راحت کے لئے وہ بار بار ان ظالم انگلیوں کی تمنا کر سکتی تھی۔

صنذر علی ٹوٹتی ہوئی نگاہوں سے شنزادی کے شگفتہ چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک چور کی انگلیوں کے ذکر سے اس حسینہ کا چہرہ کیوں تھمتا رہا ہے اور غزالی آنکھیں یوں لگ رہی ہیں جیسے خواب میں کھو گئی ہوں۔

آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نو لکھا ہار سینے کے ابھاردن تک پھیلا ہوا تھا۔ چور کی انگلیاں یقیناً خلیب و غراز میں بھٹک گئی ہوں گی اور شنزادی جذباتی انداز میں ابھی تک ان انگلیوں کو محسوس کر رہی ہے۔ صنذر نے کسی حد تک اس کی کمزوریوں کو بھانپتے ہوئے دوبارہ وہی سوال کیا۔ ”کیا آپ میرے سوال کا جواب دینا پسند کریں گی وہ انگلیاں کیسی

تھیں؟

”وہ ایک مرد کی انگلیاں تھیں۔ سخت کھردری۔ ایک چور کی بے رحم انگلی۔ ایک محبوب کی طرح مہربان انگلیاں۔۔۔۔۔۔“ وہ خیالوں میں کھوئی ہوئی بیڑائی رہی۔ ایک ایک اس نے چوک کر پوچھا۔ ”آں۔۔۔۔۔۔ میں نے ابھی کیا کہا ہے؟“

صنوبر نے مسکرا کر کہا: ”جس انداز میں آپ نے انگلیوں کی خوبیاں بیان کی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے انہیں بہت دیر تک پوری توجہ اور دلچسپی سے ملاحظہ کیا ہے۔ اب دیکھئے کہ مجھے آپ سے کتنا تعاون حاصل ہو رہا ہے۔ میں یہاں سے ہل جا کر اب صرف ان مہمانوں کو شناختی پریڈ میں رکھوں گا جن کی انگلیاں مضبوط، تختہ کھردری ہوں گی اور جتنے مہمان مردود کے ہاتھ تلامع ہوں گے، میں انہیں ہل رخصت کر دوں گا۔ اس طرح مہمانوں کی بھیڑ چھٹ جائے گی اور میں رفتہ رفتہ اس مہمان یا چور تک پہنچ جاؤں گا لیکن ابھی چند موالات اور ہیں۔“

”فرمائیے۔ میں بخوشی جواب دوں گی۔“

صفر علی نے سوال کیا۔ ”کیا آپ نے تاریکی میں اس کی جسامت کا اندازہ کیا؟“
 وہ پھر خیالوں میں کھو گئی۔ خیالوں میں وہی اندھیرا تھا اور وہی بھاری بھر کم انہی
 وہ اس کی آغوش میں یوں سمائی ہوئی تھی جیسے ہیرے کی کئی انگوٹھی میں سمائی ہو۔
 تاریکی میں اس نے احساس کی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اجنبی کا سینہ چٹان کی طرح
 تھا، بازو فولادی تھے اور قد اتنا اونچا تھا کہ وہ بوسے کی تکمیل کے لئے آپ ہی آپ
 کے بل اٹھ گئی تھی۔ پھر بھی اس کے قد کو نہیں پہنچ سکی تھی۔ آخر میں انہی نے
 اسے بازوؤں میں اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا تھا۔

صنوبر علی دوسری بار شہزادی کے پیرے کے تاثرات دیکھ کر تازہ گیا کہ شہزادہ
بار چوری ہو جانے کے باعث گم صم نہیں ہے بلکہ چور کے رنگین و سگین تصور میں
ہوئی ہے۔

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اگر وہ چور گرفتار ہو جائے تو آپ اسے معاف کر دیا کریں؟“

شہزادی نے جواب دیا۔ ”اس نے میرا ہار چرایا ہے۔ وہ میرا مجرم ہے۔ لہذا
 طور پر اسے سزا دوں گی۔“

صفر علی نے کہا۔ ”لیکن وہ ہمارے ملک کا مجرم ہے۔ ہمارے ملک میں اس نے جرم کیا ہے۔ اسے سزا بھی یہاں کی عدالت سے ملے گی۔ چونکہ اس کے اس جرم سے اسے ملک کی بدنامی ہوگی اور خارجہ پالیسی پر حرف آئے گا، اس لئے اسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اسے سات سال قید با مشقت ہوگی۔ اس کے لادہ بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا ہوگا۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا اس کی زندگی کے سات سال یونہی ضائع ہو جائیں گے؟“ پھر وہ خود ہی جواب سوچنے لگی کہ نہیں۔ اس نوجوان کی زندگی کے سات سال، سات موسماں اور سات ہزار سال میری ذلّتوں کے سائے میں گزرنے چاہئیں۔ اسے قید با مشقت نہیں ہونی چاہئے۔ میں اس کی آغوش میں قید با محبت کی سزا پاؤں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ اسے سزا دی جائے۔ یہ معاملہ ہمیں ختم کر دیجئے۔“

صفر علی نے جواب دیا۔ ”معاملہ ختم کرنا یا کسی کے جرم کو چھپانا بھی ایک جرم ہے۔“

شہزادی نے کہا۔ ”اگر ایک جرم کو چھپا کر آپ اپنے ملک کو بدنامی سے بچا سکتے ہیں تو اسے ضرور چھپانا چاہئے“ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ہمارے سفارت خانے میں یہ معاملہ ختم کر دیا جائے گا، بات آگے نہیں بڑھے گی۔ ہمارے اخبارات نیکلس کی چوری کی خبریں شائع نہیں کریں گے۔“

صفر علی موج میں گم ہو گیا۔ اب مصلحت یہی تھی کہ وہ اپنے ملک کو بدنامی سے بچا لیتے۔ شہزادی جذبات کی رد میں نو لکھا ہار کی چوری کو نظر انداز کر رہی تھی۔ صفر نے اس کے مشورے کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے ملک کی خاطر آپ کے اس مشورے کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اس سلسلے میں کچھ ذاتی قسم کی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس گفتگو کا تعلق اس چور سے بھی ہے۔“

شہزادی نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے سفارت خانے کے دونوں افسروں سے کہا کہ وہ بڑھوس سے جائیں اور اپنے سفارت خانے سے نیکلس چوری کی خبر شائع نہ کریں اور اس کے آئندہ احکامات کا انتظار کریں۔

دونوں آفیسر اس کے حکم کے مطابق وہاں سے چلے گئے۔ شہزادی نے صفر سے

پوچھا۔ ”ہاں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس چور کو سزا سے کیوں بچا رہی ہیں۔ درست ہے کہ آپ کی نظروں میں نو دس لاکھ روپے کے ہار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ نو لکھا ہار کو یوں بھول گئی ہیں جیسے دو چار پیسے گم ہو گئے ہوں لیکن اس چور کو سزا کر کے آپ کو کیا حاصل ہو گا جبکہ آپ نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ ایک اندازہ یہ پچان ہے جو اجالے میں گم ہو جاتی ہے۔ آپ اس پر مہمان ہونے کے بارہودار ہیں۔ میں نہیں پچان سکتیں کیا آپ پچان سکتی ہیں؟“

”نہیں۔ آپ درست کہتے ہیں۔ میں اسے ردِ شنی میں نہیں پچان سکتی۔“

”کیا آپ نہیں جانتیں کہ وہ ردِ شنی میں آپ کے سامنے آ جائے؟“

”ہاں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے سامنے آ جائے لیکن قانون کے ماتھے آئے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ وہ دونوں کے سامنے آئے مگر آپ کی خاطر اسے سزا ملے۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ شہزادی نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”اگر آپ نے اسے ہار بچا لیا اور میرے سامنے لے آئے تو میں آپ کو منہ مانگا انعام دے سکتی ہوں۔“

”میں انعام نہیں چاہتا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ ہار ایک مجرم کے پاس نہ رہے۔ آپ کو واپس مل جائے اور آپ اسے پس کر اپنے ملک واپس چلی جائیں۔ ہم انکار والے ہر حال میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔“

”آپ ایک فرض شناس آفیسر ہیں لیکن اس چور کا کیا بنے گا؟“

”صفر نے جواب دیا۔ ”سیدھی سی بات ہے۔ ہم اس کے پاس سے ہار برآمد کر کے، لیکن ہار کی چوری کا ذکر کسی کی زبان پر نہیں آئے گا۔ اس چور پر کوئی دوسرا عائد کر کے اسے ملک بدر کرایا جاسکتا ہے۔ آپ چاہیں گی تو اسے آپ کے ملک کی سزا حاصل ہو جائے گی۔“

”یہ اچھا آئیڈیا ہے، اگر وہ اس ملک سے نکالا گیا تو میں اسے اپنے ہاں بٹاؤں گی۔“

”اچھا تو پھر اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کیجئے۔ یہ نتائج؟“

”اندھیرے میں کتنی دیر تک آپ کے قریب رہا تھا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”اس وقت مجھے دقت کا احساس نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑے رہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ازل سے اس کی آغوش میں تھی اور اب تک رہوں گی، لیکن جب وہ چلا گیا تو یوں لگا جیسے وہ ایک چٹکی دقت لے کر آیا تھا اور اب چھٹکے ہی واپس چلا گیا لیکن میں یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ کتنی دیر تک میرے قریب رہا۔“

”ہاں یہ بتا سکتی ہوں کہ وہ آپ جیسا قد آور تھا، لیکن آپ جیسا دبلا پتلا نہیں تھا۔ اس کا سینہ پتلان کی طرح چوڑا تھا اور بازو فولاد کی طرح سخت تھے۔ اگر ایک بار اندھیرا ہو جائے، اگر ایک بار وہ اندھیرے میں آجائے تو میں اسے پہچان لوں گی۔“

”آپ کیسے پہچان لیں گی؟“

وہ اس سوال کا جواب کسی سرو کو نہیں دے سکتی تھی، یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ عورت اندھیرے میں سرو کو اس کے چہرے سے نہیں بلکہ اس کے جذبات سے اسے پہچانتی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ”اندھیرے میں آنکھیں میں دیکھتیں مگر دماغ دیکھتا اور سمجھتا رہتا ہے اور تاریکی میں عورتوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی، بس میں اسے پہچان لوں گی۔“

”اچھی بات ہے۔ اگر آپ اسے پہچان لیں گی تو پھر میں ایک کام کرتا ہوں۔ میں سال ہال میں جا کر صرف ان مہمانوں کو شناختی پریڈ کے لئے روکتا ہوں جو قد آور ہیں، سینہ پتلان کی طرح چوڑا ہے، بازو فولاد ہیں اور انگلیاں موٹی، مضبوط اور کھردری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے مہمان تعداد میں دو چار ہی ہوں گے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک وقت میں ایک مہمان کو اس بیڈروم میں بھیجوں گا۔ آپ یہاں کی تمام لائٹس بجھا دیں، تاریکی میں خوف محسوس ہو تو ایک زیر و پاؤر کا بلب روشن کر لیں پھر اس نیم تاریکی میں اس آنے والے شخص کو پہچاننے کی کوشش کریں، کیا آپ اس طرح اسے شناخت کر لیں گی؟“

”بالہ۔ یہ اچھی تدبیر ہے۔“ وہ راضی ہو گئی۔ صفدر علی بیڈروم سے باہر چلا گیا۔ شادی شامینہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تمام بتیاں بجھا دیں اور ایک زیر و پاؤر کا بلب روشن کر کے اپنی جگہ آکر بیٹھ گئی۔ نیم تاریکی میں پھر دبی اجنبی اس کے حواس پر چھا رہا تھا۔ وہ غمگین بیٹھی ہوئی ایک بو سے کی سفائی کو اور حانسون کی آنچ کو اپنے لبوں اور چہرے پر محسوس کرتی رہی۔ آدھ گھنٹے کے بعد صفدر نے آکر کہا۔ ”صرف تین ہی مہمان ایسے ہیں

جو آپ کے بیان کے مطابق قد آور ہیں، سینہ چٹان ہے، ہانڈ فولاد کے ہیں اور موٹی، مضبوط، سخت کھردری ہیں۔ اگر اجازت ہو تو پہلے ایک مسمان کو یہاں بھیج دیں۔ شہزادی نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ صفدر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آئے۔ صحت مند نوجوان دستک دے کر بیڈ روم میں آیا۔ شہزادی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی گئی۔ نوجوان نے کہا۔ ”مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ کی خواب گاہ میں حاضر ہوں۔ آپ مجرم کو پچھانا چاہتی ہیں۔ یہ بڑی بد نصیبی ہے کہ مجھ جیسا رئیس اعظم بھی ایک طرح طرح حاضر ہو رہا ہے۔ نوکھا ہار کی اہمیت ہی کیا ہے، میں ابھی کھڑے کھڑے اس روپے کا چیک لکھ سکتا ہوں۔“

شہزادی نے کہا۔ ”آپ بیس لاکھ بھی ادا کر سکتے ہیں لیکن اس ہار کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ہیرے ٹایاب ہیں۔ آپ لاکھوں ڈالر دے کر بھی وہ ہیرے کہیں سے نہیں سکتے، ہر حال میں نے یہاں آپ کو صرف پچھاننے کے لئے طلب کیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اس کے بالکل قریب آگئی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے شالے پر رکھ دیئے جیسے اس کے گلے میں بانئیں ڈالنا چاہتی ہو۔ نوجوان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ شہزادی اس طرح اچانک بے تکلفی سے اس کے گلے کا ہار بن جائے گی۔ وہ چند تک حیرت زدہ رہا پھر مامے خوشی کے اس کی بیٹی لکل آئی۔ یہ بڑے فخر کی بات تھی، ایک شہزادی اس پر مر مٹی تھی، اس نے فوراً ہی اسے اپنے فولادی بازوؤں کے حصار لے لیا اور اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے لگا۔

شہزادی اچانک ہی رپ کر اس کی آغوش سے لکل گئی۔ پھر ڈانٹ کر بولی۔ ”بیہودگی ہے، چلے جاؤ یہاں سے، گیٹ آؤٹ.....“

نوجوان بوھلا کر اس کا منہ تکتے لگا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ شہزادی صاحبہ پہل آپ کی تھی، لیکن دوسری بار اس کے منہ سے ”گیٹ آؤٹ“ کے الفاظ سنے تو وہاں فحش جرات نہ ہو سکی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا بیڈ روم سے باہر چلا گیا۔

اے کے بعد دو اور مسمان یکے بعد دیگرے آئے۔ شہزادی نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ کسی کے بھی پیار میں اسے اجنبی کے پیار کی جھلک نظر نہیں آئی اور اجنبی کے درمیان یہ فرق تھا کہ ان تینوں نے شہزادی کو بڑے احترام سے آغوش سمیٹ کر پیار کیا تھا لیکن اجنبی نے اسے ایک عام سی لڑکی سمجھ کر بھیج لیا تھا۔

شزاوی سمجھ کر تو سب ہی پیار کی بھیک مانگتے تھے، مگر پیار چھین لینے والا وہی ایک چور تھا۔
 مندر علی کو شزاوی کی مایوسی کا علم ہوا تو اس کی سمجھ میں آگیا کہ ان مہمانوں میں
 وہی چور نہیں ہے۔ چور باہر سے آیا تھا، اندھیرے میں آیا تھا اور اندھیرے میں کام بنا کر
 ناکبہ

ایسے وقت صفدر کے ذہن میں سب سے پہلے شاکر جمالی کا نام آیا کیونکہ وہ بھی
 راور تھا۔ شزاوی نے اس اجنبی کی جتنی خصوصیات بیان کی تھیں، وہ سب جمالی میں
 روجہ اتم موجود تھیں۔ پھر یہ کہ ہیرے جو اہرات کی چوریوں میں خاصا بدنام تھا۔
 مندر نے فوراً ہی فون کا ریسیور اٹھا کر مالی پور کے تھانے سے رابطہ قائم کیا۔ شاکر
 مالی مالی پور کے علاقہ میں رہتا تھا، اس لئے وہاں کے تھانے والے فوراً اس کی ناکہ بندی
 کر سکتے تھے۔ تھانیدار سے رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے کہا: ”میں صفدر علی بول رہا
 دل۔ آپ فوراً شاکر جمالی کو تلاش کریں، وہ جہاں بھی ہو اسے حراست میں لے کر مجھے
 حاضر دیں۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

دوسری طرف سے تھانیدار نے کہا: ”آپ یہاں تھانے تشریف لے آئیں۔ شاکر
 نال شام چھ بجے سے حوالات میں بند ہے۔“

صفدر یہ سن کر مایوس ہو گیا کہ جمالی شام چھ بجے سے حوالات میں ہے۔ اس سے
 مالک باہر تھا کہ اس نے نیکلس نہیں چرایا ہے۔ تھانیدار بتا رہا تھا کہ اسے کس سلسلے میں
 گرفتار کیا گیا ہے، صفدر بے دلی سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے چور تک پہنچنے کے
 لئے کس طرف قدم اٹھانا چاہئے۔

پھر اسے دانیال جوہری کا خیال آیا۔ وہ چوری کا مال خریدنے کے سلسلے میں بدنام تھا۔
 اس نے تھانیدار سے رابطہ قائم کر کے اس علاقہ کے تھانے سے رابطہ قائم کیا، جہاں
 دانیال جوہری رہتا تھا۔ اس نے تھانے کے اچارج سے کہا: ”میں صفدر علی بول رہا
 ہوں۔ آپ فوراً دانیال جوہری کو چیک کریں۔ یہ معلوم کریں کہ آج رات ساڑھے آٹھ
 بجے سے اب تک کون کون اس سے ملنے آیا تھا۔ میں بھی کچھ دیر بعد وہاں پہنچ رہا ہوں۔“
 یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور پلٹ کر شزاوی شاہینہ کو دیکھنے لگا۔ وہ ایزی
 جھڑکی ٹیٹھی مائوسی کو ایک تک دیکھے جا رہی تھی۔ صفدر نے سمجھ لیا کہ وہ خیالوں کے

اندھیرے میں اس چور کے۔ لڑ لگ رہی ہے جو اس کے گلے کا ہار لے گیا۔

☆-----☆-----☆

شبنم اسپیشل وارڈ کے۔ کمرے میں آرام دہ بستر پر دائیں کروٹ لیٹی ہوئی تھی وہ ہائیں کرٹ اس لئے نہ بیٹ سکتی تھی کہ وہ دل کی مریضہ تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ڈاکٹر خاور کے اعتقاد میں تھیں کیونکہ اس کے سینے میں جو بیمار دل غاروں کا رفتار بھول گیا تھا۔ ڈاکٹر بیٹری کے ذریعے اس کے دل کی دھڑکنوں کو برقرار رکھا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی ٹائم پیم کی جانب دیکھ رہی تھی۔ رات کے دو بجے ٹائم پیم سے ابھرنے والی ٹک ٹک کی آواز سن کر وہ سوچ رہی تھی کہ ایک گھڑی کی طرف اس کے دل کی دھڑکنیں بھی انسانی دماغ اور ہاتھوں کی محتاج ہیں، جب تک چلتی رہے گھڑی نہیں چلتی، جب تک بیٹری نہ لگاؤ، اس مریضہ کا دل حرکت نہیں کرے گا۔ اگر کم ایک بیٹری کی قوت کمزور پڑنے لگتی تو ڈاکٹر اس کی جگہ دوسری نئی بیٹری لگا دیتا تھا۔

وہ جت ہی محتاط زندگی گزار رہی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق وہ تیزی سے نہیں چلتی تھی، تیزی سے نہیں بولتی تھی۔ اچھلتا کودتا تو برسوں سے بھول چکی تھی۔ غرضیکہ کوئی ایسا کام نہیں کرتی تھی جس سے بیٹری کو جھٹکا پہنچے، اگر بیٹری لڑ جائے تو دل کی دھڑکنوں کا تسلسل اڑ جائے گا اور پٹ سے اس کا دم نکل جائے گا اس مصنوعی دل ہر مصنوعی چیز کی طرح کمزور تھا۔

اس وقت پانچ عدد ہیرے اس کے تکتے کے لیے چھپے ہوئے تھے۔ وہ بار بار تکتے کے لیے ہاتھ ڈال کر پلاسٹک کے اس کیپول کو چھو رہی تھی جس میں وہ ٹایاب ہیرے رکھے ہوئے تھے۔ انہیں پاکر اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا اور وہ دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ حد سے زیادہ خوشی ملے تب بھی بے فائدہ دھڑکنے کے باعث دل کی حالت بگڑ جائے گی اور بیٹری کی کارکردگی میں بھی فرق آجائے گا۔

لیکن وہ خوش ہونے پر مجبور تھی۔ سوٹا چاندی، ہیرے، جواہرات ہر عورت کی کمزوری ہوتے ہیں۔ شبنم کچھ زیادہ ہی ہیروئن کی خواہش مند تھی۔ ایسے ہی چمکتے ہوئے پتھروں کے لالچ میں اس نے شاکر جمالی سے دوستی کی تھی پھر چوری کا مال چھپانے کے سلسلے میں اس کی قابل اعتماد دوست، بن گئی تھی لیکن ایسے ہیرے موتی اس کے پاس

نہیں رہتے تھے۔ چوری کا کیس ٹھنڈا پڑتے ہی جمالی تمام چوری کا مال اس سے واپس لے کر چلا جاتا تھا اور اس خدمت کے عوض اسے دو چار ہزار روپے دے دیا کرتا تھا۔ لیکن آج شینہ کی نیت بدل گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پانچ عدد ہیرے اگر جمالی واپس نہ کئے جائیں تو وہ کیا گاڑ لے گا۔ ڈاکٹر خاور اگلے ہفتے اسے سوسٹر لینڈ لے کر جا رہا تھا۔ یہ ملک چھوڑتے ہی شاکر جمالی سے بھی پیچھا چھوٹ جاتا اور شاہان ہیروں کی آمد بن جاتی۔ وہ ہیرے ملک سے باہر لے جانے کے لئے اس نے ڈاکٹر خاور کو اپنا رازدار بنایا تھا۔

پہلے تو ڈاکٹر نے سمجھایا تھا کہ اسے اپنے پاس چوری کا مال نہیں رکھنا چاہئے، لیکن اس کے انکار پر وہ رونے لگی۔ اسے روتے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا کیونکہ حد سے زیادہ رونا ہو تو دل ڈوبنے لگتا ہے اور اس طرح بھی بیٹری کی کار کروگی میں فرق آ جاتا ہے۔ اس نے جلدی سے اس کے آنسو پونچھے، اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے کہ وہ کھل ایک ڈاکٹر نہیں تھا۔ اس کا حاشق بھی تھا اس نے ایک حاشق کی طرح قسم کھائی اور بعد کیا کہ وہ ہر حال میں ان ہیروں کی حفاظت کرے گا اور انہیں چھپا کر اس ملک سے اترے جائے گا۔

ٹہنہ کی زندگی چند روزہ تھی۔ اگر ایک پل کی بھی زندگی ہوتی تو وہ ان ہیروں کو کلیجے سے لگال اور عرجاتی۔ ڈاکٹر اس کی زندگی کو طویل تر کرنے میں مصروف تھا، وہ اس لئے ان ہیروں کا لالچ کر رہی تھی کہ ڈاکٹر اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور اسے زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ہیروں کی خواہش اس کی آخری خواہش ہو، اسی لئے ڈاکٹر نے اسے خوش رکھنے کے لئے یہ بات بھی مان لی تھی جو سراسر خلاف قانون تھی۔

وہ کھلے کے نیچے سے کیپول نکال کر دیکھنے لگی۔ وہ ایک بار کیپول کھول کر پانچ عدد ہیرے اپنی مٹھی میں لے کر دیکھ چکی تھی۔ وہ ہیرے سائز میں چنے کے دانے کے برابر تھے۔ ان میں ایسی ہلکی ہلکی سی میٹھی میٹھی سی پسک تھی کہ بار بار انہیں دیکھنے کو دل چاہتا تھا لیکن ہسپتال میں انہیں بار بار کھولنا حرام نہ تھا۔ ہیرے کیپول کے باہر ہوں یا اندر ہوں، فی الحال اس کی ملکیت تھی۔ اس لئے وہ کیپول کو مٹھی میں لے لے کر خود کو تکیہ پہنچا رہی تھی۔

درد اذے پر آہٹ سن کر اس نے جلدی سے کیپول کو نکلنے کے لئے دیکھا۔ ایک نرس درد اذہ کھول کر اندر آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹیلی فون اور دوسرے ہاتھ میں ریسیور تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ڈاکٹر خادر آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون سرہانے کی میز پر رکھ دیا اور ریسیور ٹینے کے بازو دے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ٹینے نے ماکتھ ٹیس پر بڑی محبت سے پکارا۔ ”ہیلو آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔“

”ہاں باگ رہا ہوں اور تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ میں نے نرس سے کہہ دیا تھا۔ تمہیں نیند سے بیدار نہ کرے، کیا تم سو رہی تھیں؟“

”نہیں۔ میں بھی جاگ رہی تھی اور آپ کو یاد کر رہی تھی۔“

”پھر تو میں خوش نصیب ہوں۔ اچھا یہ تو بتاؤ، وہ ہیرے مل گئے؟“

”ہاں۔ ابھی جمالی کا ایک آدمی یہاں پہنچا کر گیا ہے۔ میں نے کہا تھا ماکہ بتلاؤ دھن کا پکا ہے۔ وہ شراہی کے بار سے ان ہیروں کو اڑا لائے۔ گل۔ اس وقت وہ سرہانے رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ اتنے خوبصورت ہیں کہ ان پر آنکھیں نہیں ٹھہرتی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کشم دالوں سے انہیں چھپا کر ملک سے باہر لے جائیں۔ آپ اچھا وعدہ پورا کریں گے نا؟“

”ہاں، میں تمہاری خاطر یہ وعدہ مندر پورا کروں گا۔ ہم اگلے ہفتے سوئٹزرا جائیں گے۔ میں نے ابھی فیصلہ کیا ہے کہ کل صبح تمہاری بیٹری چھین کر دی جائے گا۔ طویل سفر کے لئے مکمل طور سے صحت یاب رہو۔ ابھی میرا مشورہ ہے کہ تم اطمینان سو جاؤ۔ میں نے نرس سے کہہ دیا ہے کہ وہ انجکشن لگائے گی تو تمہیں نیند آ جائے گی۔“

”خادر! مجھے نیند تو آ جائے گی مگر ڈرتی ہوں کہ یہ ہیرے کہاں چھپاؤں۔ کوئی نہ لے گیا تو میرا دم نکل جائے گا۔“

”مرنے کی باتیں نہ کرو، ہمیشہ زندہ رہنے کی گمن میں رہو۔ کیا وہ ہیرے کچھ میں ہیں؟“

”نہیں۔ ایک پلاسٹک کے کیپول میں ہیں۔“

”کیپول کا سائز کیا ہو گا؟“

”یہ لمبائی تقریباً سوا یا ڈیڑھ انچ ہے۔“

”ٹھیک ہے، بت ہی نہا سا کیپول ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی چیریں تو عورتیں اپنی دلی میں چھپاتی ہیں۔“

”آپ ایسی باتیں نہ کریں، مجھے شرم آتی ہے۔ دیے میں چولی کے ٹینے ہنسنے لگی۔ اگر نرس ددا پلانے آئے گی تو اسے وہ کیپول نظر آ جائے گا۔ اچھا، آپ شوروہ نہ دیں، میں اسے ایک جگہ پھپھالوں گی۔“

”ایسی اور کون سی جگہ ہے جہاں ڈیڑھ انچ کا کیپول پھپھایا جاسکتا ہے؟“

”ایسی ایک جگہ ہے، آپ نہ پوچھیں۔“

”بھئی بتا دما، در نہ مجھے خیند نہیں آئے گی۔“

”تو ہے، آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔ بھئی اور کہاں پھپھاؤں گی، شلوار کے نیچے رکھوں گی۔ صبح آکر آپ لے لیجئے گا۔“

”ہائے۔ جانے صبح کب ہوگی، اب میں ای انتظار میں سو رہا ہوں۔ تم بھی سو باؤ،“

”ما حافظ!“

فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شینہ نے ریسیور رکھ کر تکتے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور مٹھی نہا کیپول کو لے کر شلوار کا ازار بند کھولنے لگی۔

صبح ہوتے ہی صفدر علی کو جمابھیاں آئے لگیں۔ وہ اپنے دفتر میں تمام رات بیدار تھا اور فون پر اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیتا رہا تھا کہ انہیں شہر کے کتنے چوروں کا مقابلہ چاہئے۔ اس کے ایک ماتحت نے رات کے گیارہ بجے دانیال جوہری کا فاسبہ کیا تھا۔ اس کی کوشش کے احاطے میں اس نے وہ کار بھی دیکھی جس میں شاکر جمالی بیٹھ کر سلیمان سے مالی پور تھانے تک گیا تھا۔ پھر اس کا ایک ماتحتی راجر اس کار کو قتل کرنے دانیال جوہری کی رہائش گاہ تک لے آیا تھا۔

صفدر کا ماتحت یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کار کہاں کہاں استعمال کی گئی ہے لیکن اس دانیال کے ڈرائنگ روم میں راجر کو دیکھ کر پہچان لیا کہ وہ شاکر جمالی کا دوست رہا ہے۔ بڑی بڑی چوریوں کے کیسز میں جمالی کے ساتھ جو لوگ ملوث ہوئے تھے ان راجر اور جولی ناص طور پر قابل ذکر تھے۔ کئی بار ضمنی طور پر شیشہ کا نام بھی آیا تھا۔ ثابت نہ ہو سکا کہ ایک دل کی مریضہ جمالی کا ساتھ دیا کرتی ہے۔ پھر وہ بہت بڑے بہرمن ڈاکٹر خاؤر کے زیر علاج آگئی اور رفتہ رفتہ اس کی محبوبہ بن گئی۔ اس کے بعد کی گفتگو بہت جلد تو سوسائٹی میں اس کی عزت ہونے لگی اور قانون کے محافظ بھی اس مطمئن ہو گئے۔

بہر حال رات کے سوا گیارہ بجے صفدر نے اپنے ماتحت کا فون ریسیو کیا اور اس بھید کھلا کہ شاکر جمالی تو حوالات میں ہے لیکن اس کا ساتھ دانیال کے پاس گیا ہوا ہے تو صفدر نے جمالی کے تمام ساتھیوں کے پیچھے خفیہ پولیس کے آدمی لگا دیے۔ اس کا دانیال کی کوشش سے واپس چلا گیا تھا۔ راجر نے سمجھا کہ اس پر شبہ نہیں کیا گیا ہے لہٰذا وہ پانچ عدد بہیرے کیپول میں رکھ کر ہسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے اس سے وہ ہار بھی لے لیا تھا جن سے وہ بہیرے نکال کر کیپول میں رکھے گئے تھے۔ اس سے خالی ہونے کے باوجود اب بھی اس ہار کی قیمت تقریباً تیس ہزار سے زیادہ ہو سکتی

بریک سونے کے اس بار میں جگہ جگہ سچے موتی جڑے ہوئے تھے۔ راجر نے سوچا کہ برسہا برس کے حوالے کرنے کے بعد وہ اپنے کالج میں جائے گا اور اپنی بیوی جولی کو وہ اپنی بار خفے کے طور پر پیش کرے گا۔

”اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا“ اسے شبہ تک نہ ہو سکا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ ہسپتال پہنچ کر اس نے ٹینے سے ملاقات کی، جمالی کا پیغام پہنچایا اور کیدپول اس کے والے کر کے ہسپتال سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے ہولے ہولے سیٹی بجاتے ہوئے باروں طرف دیکھا۔ ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں ایک ایسپولینس اور ایک جیب کھڑی ہوئی تھی۔ ”دونوں گاڑیاں خالی تھیں۔ لہذا وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ پولیس والوں کی جیب ہے۔ وہ طہیان سے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا ہسپتال کے کمپاؤنڈ سے باہر آیا اور اپنے کالج کی طرف جانے لگا۔“

کالج شہر کے آخری سرے پر تھا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اسے ہوش آیا کہ ایک جیب مسلسل اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ فوراً ہی کار کی رفتار بڑھا کر راستے بدلنے لگا۔ اگر تعاقب کرنے والوں کو ڈانچ دے سکے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پہلی رات تھی، تمام راستے روشن تھے۔ بار بار فریب کھانے کے بعد بھی جیب اسی راستے پر چلی آتی تھی جس راستے سے گزر کر اسے کالج تک پہنچنا تھا۔ اس تعاقب سے راجر سمجھ گیا کہ وہ پولیس والے ہیں اور شاگرد جمالی کے تمام ساتھیوں کے نام پتے اور مکانے جانتے ہیں۔

اب ان سے نپٹنے کی یہی صورت نظر آئی کہ کار میں رکھا ہوا ہار چلتی کار سے کہیں بھٹک دے تاکہ اس پر اتنی بڑی چوری کا الزام حائد نہ ہو لیکن وہ ہار ہیروں سے خالی ہونے کے باوجود بہت قیمتی تھا۔ اسے پھینکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہ جانے پولیس والے کب سے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسے ہسپتال کے اندر بھی جاسے دیکھا ہوگا تب اسے ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں کھڑی ہوئی جیب یاد آ گئی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ پولیس والوں نے دور تک بال پھیلنا رکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ جولی تک بھی پہنچ گئے ہوں یا پہنچنے والے ہوں۔ اس خیال کے آنے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ جیب بھی جیڑی سے آ رہی تھی لیکن کار کی رفتار کا پیچھا نہیں کر سکتی تھی، اس لئے پیچھے رہ جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ کالج

قریب آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے کار کا ہارن بجایا تاکہ جولی سو رہی ہو تو اٹھ کر دروازہ کھول دے۔

اکثر عورتیں گہری نیند میں بھی اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ سن لیتی ہیں۔ طرح جولی نے بھی راجر کی گاڑی کے ہارن کو سن لیا۔ اس نے فوراً ہی اٹھ کر کھڑکی پر وہ راستہ سیدھا کھڑکی کی طرف آتا تھا، پھر دروازے کی طرف مڑ جاتا تھا۔ اس نے پڑ میں راجر کی گاڑی پہچان لی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

راجر کی کار دروازے کے سامنے آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس نے باہر اترتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ”جولی! مگن نکالو۔ پولیس والوں سے مقابلہ ہے۔“

جولی دروازے سے بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ راجر کار سے اتر کر دوڑتا ہوا باہر آیا اور دروازے کو اندر سے بند کرنے لگا۔ لکڑیوں سے بنا ہوا وہ پرانا کالچ تھا۔ زور سے بند کرنے یا کھولنے سے کمڑی کی دیواریں لرزنے لگتی تھیں۔ جولی فوراً در اسٹین مگن لے آئی۔ راجر نے ایک مگن اپنے ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں پر جا رہا ہوں۔ تم یہاں کھڑکی پر مورچہ سنبھالو۔“

”آخر ہم پولیس کی نظروں میں کیسے آ گئے؟“

راجر نے پچھلے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بعد میں جاننا فی الحال اتنا سمجھ لو کہ شہزادی شاہینہ کا نو لکھا ہوا اس وقت میری جیب میں ہے۔“ مارے خوشی کے جولی کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ راجر کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ ”جولی! ہماری سلامتی ہی میں ہے کہ یہ پولیس کے دو چار آدمی سچ کر نہ جانے بائیں یہ سچ گئے تو اپنے افسروں کے پاس پہنچ کر ہماری نشاندہی کریں گے۔“

یہ کہنے کے دوران وہ چھت پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے جنت دیواریں یوں کراہتی ہوئی ہل رہی تھیں جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ جولی مورچہ سنبھال کر کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت دور سے کسی گاڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ نظرس دور راستے کے موڑ پر جم گئیں۔ جیب اپنی رفتار سے چلی آ رہی تھی۔ پولیس راجر کے ٹھکانے سے واقف تھے، اس لئے اطمینان سے پہلے آ رہے تھے۔

پھر وہ جیب عین کھڑکی کے سامنے پچاس گز کی دوری پر نظر آ گئی۔ اسے پہچان جولی نے فائرنگ شروع کر دی۔ جیب والے بھی محتاط تھے۔ وہ جب جیب کے دائیں

جھانک لگا کر راستے کے کنارے جھاڑیوں کے پیچھے چلے گئے۔ ایسی صورت میں گاڑی کو رک جانا چاہئے تھا لیکن وہ آپ ہی آپ کالچ کی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ جولی نے بوکھلا کر فائرنگ کی تاکہ گاڑی رک جائے۔ مگر کالچ نشیب میں تھا اور گاڑی راستے کی اونچائی سے نشیب کی طرف تیزی سے آ رہی تھی اور اسے روکنے کے لئے آگے بڑھنے کی ضرورت تھی لیکن وہ اور راجر آگے بڑھ کر پولیس والوں کی فائرنگ کی زد میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ راجر نے چھت پر سے چیخ کر کہا۔ ”جولی! بچھلے دروازے سے فوراً نکل جاؤ۔ گاڑی کالچ سے نکلنے والی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ خود وہاں سے پلٹ کر بھاگنے لگا۔ اسی وقت ایک گولی اس کی پشت پر آ کر لگی اور وہ لڑکھڑا کر چھت پر گر پڑا۔ جولی کھڑکی سے پلٹ کر بھاگ رہی تھی۔ راجر کی چیخ سن کر ٹھک گئی اور سر اٹھا کر چھت کی جانب دیکھنے لگی۔ اوپر سے اس کے گرنے کی آواز بھی آئی تھی۔ وہ راجر کا نام لے کر چیختی ہوئی آگے بڑھی تو بدحواسی میں ایک کرسی سے گرا کر گر پڑی۔ پھر اسے اٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی وقت جیب ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دیوار سے لکڑا گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے زلزلہ سا آگیا۔ جس دیوار سے جیب لکڑائی تھی وہ دیوار جولی کی طرف تیزی سے جھکتی چلی گئی۔ چھت چڑچڑاہٹ کی آواز کے ساتھ بیٹھنے لگی۔ باہر جھاڑیوں کے پیچھے سے فائرنگ کرنے والوں کو جولی کی دلخراش چیخ سنائی دیا۔ وہ سب دوڑتے ہوئے کالچ کی طرف جانے لگے۔ اس وقت تک چھت اور دیواریں نشیب میں ہو گئی تھیں۔ دیمک خوردہ لکڑیوں کا وہ کالچ جولی کا تابوت بن گیا تھا۔ اب اس کے اندر سے اس کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ پولیس کے دو جوان راجر کو چھت پر سے کھینچ کر سڑک پر لے آئے۔ وہ پہلے ہی دم اڑ چکا تھا۔ انہوں نے تلاشی لینے کے بعد اس کی جیب سے وہ نو لکھا ہار نکال لیا جو اب پانچ عورتوں سے محروم ہو چکا تھا۔

مفتوح علی کو ساڑھے تین بجے اس واقعے کی اطلاع ملی۔ اس نے موقع پر پہنچ کر اس بار کو دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ راجر نے اس کے پانچ عدد ہیرے شاید جولی کو رکھنے کے لئے دیئے ہیں۔ اگر وہ جولی کے پاس نہ پائے گئے تو صبح ہونے سے پہلے وہ نیازی ہسپتال کے اسمبل وارڈ کے کمرہ نمبر دو میں جائے گا اور ثمنہ کا حسابہ کرے گا۔

تباہ شدہ کالچ کی چھت اور دیواریں بنا کر جولی کی لاش نکالنے میں کافی وقت صرف

ہو گیا۔ پھر جولی اور اس کے دوسرے سالان کی تلاش لی گئی لیکن وہ ہیرے دستیار کے صفحہ وہاں سے مایوس ہو کر پانچ بجے ہسپتال پہنچا۔ ٹیمینہ کو انجکشن دے کر علاج تھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس لئے صفحہ کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس نے ڈاکٹر خادر کو فون کیا اور اس سے درخواست کی کہ اسے ٹیمینہ سے ملنے کی ضرورت اجازت دی جائے لیکن ڈاکٹر نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

”مسٹر صفحہ مجھے افسوس ہے کہ میں اس مریضہ کی نیند خراب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر وہ بیدار ہو جائے تو تب بھی آپ اس سے ملاقات نہ کریں۔ صبح اٹھ کر اس کے سیل بدلے جائیں گے۔ اس کے دل کی حالت بہت نازک ہے۔ اسے چاہتا کہ سیل بدلنے سے پہلے اسے ذہنی طور پر پریشان کیا جائے یا معمولی سی سختی کے لئے اسے ڈسٹرب کیا جائے۔“

”یہ معمولی سی تحقیقات نہیں ہے۔ شہزادی شامینہ کا ایک غمایت ہی قیمتی بارہا ہے۔ اس سلسلے میں جولی اور راجر نامی دو افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ راجر کی جب سے ہار دستیاب ہوا ہے لیکن اس کے ہیرے کمرہ نمبر دو کی مریضہ ٹیمینہ کے پاس ہو سکے۔ کیونکہ راجر رات کے دو بجے اس سے ملنے آیا تھا۔“

”اگر وہ ہیرے کمرہ نمبر دو میں ہیں تو آپ اطمینان رکھیں۔ وہ آپ کو مل جائے گی۔ دیکھئے آپ کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں دو افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے بازی سے کام لیا تو تیسری ہلاک ہونے والی ٹیمینہ ہوگی۔ میں بیٹری کے ذریعے انسان کو رکھنے کے تجرباتی دور سے گزر رہا ہوں۔ لہذا میں آپ کی اجازت نہیں دوں گا کہ آ میرے تجربے کو ناکام بنائیں۔ اگر شام تک ٹیمینہ مارل حالت میں رہی تو میں س پہلے آپ کو اس سے ملنے کی اجازت دوں گا۔ وٹس آل۔“

اتنا کہہ کر دوسری طرف سے ڈاکٹر نے ریسیور رکھ دیا۔ صفحہ سر ہٹام کر سوچے کہ اب کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر طبی نقطہ نظر سے درست کہہ رہا تھا۔ وہ ٹیمینہ سے اس رات تک نہیں مل سکتا تھا سب تک کہ ڈاکٹر اس سے ملاقات کو ضروری نہ سمجھتا۔ تاہم نظر میں ایک شہزادی کے ہیرے اہم تھے لیکن ڈاکٹر کے لئے ایک عام سی عورت کی اہم اہم تھی۔ ڈاکٹر کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ پہلے وہ مریض کی زندگی بچائیں۔ وہاں سے مایوس ہو کر اپنے دفتر واپس آ گیا لیکن ہسپتال میں اپنے خاص آدمیوں کو ڈاکٹر

ڈا اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ کمرہ نمبر دو سے آپریشن تھینر تک ہر شخص پر کڑی رکنیں۔ ڈاکٹر اور نرس کے سوا کوئی رشتہ دار، دوست یا اجنبی ٹیمینہ سے ملاقات نہ کرے۔ کمرہ نمبر دو سے کوئی بھی چیز باہر لے جانی جائے تو اسے اچھی طرح چیک کریں۔ مرنے والے ڈاکٹر خاور کی خواہش کے مطابق ٹیمینہ کو ڈسٹرب کئے بغیر ایسی پابندیاں عائد کر دیں کہ وہ پانچ عدد میرے کہیں ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتے تھے۔

مندر نے اس پہلو سے بھی غور کیا تھا کہ ڈاکٹر خاور ٹیمینہ کا صرف معالج نہیں ہے۔ عاشق بھی ہے۔ وہ ٹیمینہ کی دلجوئی کے لئے ان ہیروئن کو چھپا کر لے جاسکتا تھا یا کسی بی کو یا کسی دارو بوائے کو اس کام کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر خاور غیر معمولی رت کا حامل تھا۔ اعلیٰ حکام تک اس کی رسائی تھی۔ صفدر علی کو اتنے اختیارات حاصل ہیں تھے کہ وہ ڈاکٹر خاور کی تلاش لے سکتا لہذا وہ اس کارروائی کے لئے ریپور اٹھا کر اپنے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کرنے لگا۔

☆-----☆-----☆

شاہر جمالی حوالات میں تمام رات خرا لے لیتا رہا۔ صبح سات بجے آہنی دروازہ کھلنے لگا اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ تھانیدار نے اسے کچھ سوچیں کا سگریٹ پیش کیا اور اس سے کہا۔ ”میں نے رپورٹ مکمل کر لی ہے۔ پوت کے مطابق تمہارے مکان سے چرس برآمد نہ ہو سکی۔ تم صرف چرس کا ایک ٹریٹ پیسے کے مجرم ہو لہذا تم سے پچاس روپے جرمانہ لے کر اور تمہیں دارنگ دے کر صبح سات بجے حوالات سے رخصت کر دیا گیا ہے۔ اس وقت سات بجے ہیں۔ اب تم باکچے ہو۔“

دو سگریٹ کے کش لیتا ہوا حوالات سے باہر آیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حوالات کے باہر اس کے دو ساتھی مارے گئے ہیں اور ٹیمینہ پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔ اس وقت لا سوچ رہا تھا کہ اسے سب سے پہلے کس ساتھی سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ اس وقت صفدر علی ناگہانی مصیبت کی طرح وہاں آگیا اور اس نے شاہر جمالی کو بلکے ہی کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے تمہیں رہائی نصیب ہو گئی ہے۔ میں عین وقت پر آگیا ورنہ اسے ملاقات نہ ہوتی۔“

تھانیدار اسے چرس کے متعلق رپورٹ سنانے لگا۔ صفدر علی نے ہاتھ اٹھا کر قطع

کلامی کرتے ہوئے کہہ۔ ”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ جمالی کو کس لئے کر دیا گیا تھا اور اب کس لئے رہا کیا جا رہا ہے۔ میں جمالی سے اپنے طور پر کچھ باتیں کر رہی ہوں۔ کیوں جمالی، میرے ساتھ چلو گے؟“

جمالی نے دونوں شانوں کو اچکا کر کہا۔ ”میں آپ کے ساتھ نہ جانا چاہوں گا۔“
آپ مجھے لے جائیں گے کیونکہ قانون آپ کے ساتھ ہے۔ چلئے آپ کہاں سے جا رہے ہیں۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے تھلے سے باہر آ گئے۔ باہر صفدر حلی کی کار کھڑی تھی۔ پچھلی سیٹ پر اس کے دو ماتحت بیٹھے ہوئے تھے۔ صفدر نے جمالی کو انگلی سیٹ بیٹھنے کے لئے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے دروازے کو بند کر دیا اور جمالی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔ ”جمالی کو تحفہ دکھا دو۔“

پچھلی سیٹ سے ایک ماتحت ہار نکال کر جمالی کی نگاہوں کے سامنے لے آیا۔ وہ دیکھتے ہی جمالی کا رنگ زرد پڑ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر بولا۔ ”یہ کس کا ہے؟ مجھے کیوں دکھایا جا رہا ہے؟“

صفدر اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو تاڑ گیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”ہاں تمہارے ایک ساتھی راجر کے پاس تھا۔ اب ہم اس کے پانچ عدد ہیرے شینے سے حامل کرنے جا رہے ہیں۔“

صفدر کی ان معلومات پر وہ حیران رہ گیا۔ ہار کو دیکھ کر اتنا یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہیرے سے ہیرے بھی حاصل کر لے گا۔ جمالی کو اس بات کا صدمہ تھا کہ تقریباً دس لاکھ روپے مال اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے لیکن وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ قانون کے تحت اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں ڈال سکیں گے کیونکہ جس وقت ہار چرایا گیا اس وقت وہ تھانے والوں کی گواہی کے مطابق حوالات میں بند تھا۔ لہذا کوئی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ ہار کی چوری میں شاکر جمالی کا بھی ہاتھ تھا۔

اس نے مطمئن ہو کر کہا۔ ”راجر اور شینہ کا شمار میرے ساتھیوں میں ہوتا ہے اس لئے آپ مجھ سے یہ باتیں کہہ رہے ہیں لیکن ان باتوں کا کوئی مقصد ہونا چاہئے۔“
اس ہار کی چوری میں شریک نہیں تھا پھر آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

صنوبر نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اس کیس کو بنا دو یعنی چوری کا اعتراف کر لو۔“

اس نے مقدمہ لگا کر کہا۔ ”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کل تمام رات حوالات رہا اور آپ کہتے ہیں کہ میں خواہ مخواہ اس چوری کا اعتراف کر لوں۔“

”جی! تم بڑے شاطر ہو۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھی پکڑے جاتے ہیں تم صاف بچ کر نکل جاتے ہو۔ اس بار بھی تم نے اچھی چال چلی ہے۔ تمہیں حوالات بند نہیں کیا گیا بلکہ تم نے خود کو بند کروایا ہے۔ مالی پور کا تھانے دار لالچی ہے۔ قانون وفاق بن کر وہ تمہارے جیسے چور بد معاشوں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ کل رات تم سب جلی کر کیا ڈرامہ کھیلا ہے اس کا ایک ہلکا سا خاکہ میرے دماغ میں ہے۔ محض اس کے لئے تم پر جس پینے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔“

صنوبر صاحب! آپ اپنے طور پر جو چاہے سمجھ لیں۔ میں نے تمام رات قانون دانوں کی گرمائی میں گزار دی ہے۔ تھانے کا ریکارڈ میری بے گناہی ثابت کرتا ہے اس لئے آپ مجھے مجرم ثابت کرنے کی فضول سی کوشش نہ کریں۔“

صنوبر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ لڑجالی بھی موج میں گم ہو گیا۔ اس کے ساتھی پولیس والوں کی نظروں میں آچکے تھے۔ مالے وہ اندر ہی اندر مضطرب اور پریشان تھا۔ پچھلی رات وہ ہر فکر سے آزاد تھا۔ اس نے حوالات کی سخت کھردری زمین پر لیٹ کر شنراوی شامینہ کے خواب دیکھے تھے۔ تمام اس حسینہ کے بدن کی نرمی و گرمی کو اپنی خیالی آغوش میں محسوس کرتا رہا تھا۔ اس نے پھول جیسے ملائم ہونٹ بوسے کی حرارت سے کس طرح اس کے ہونٹوں کے درمیان مل رہے تھے اس کیفیت کو یاد کر کے وہ شنراوی کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

حوالات کی وہ رات کتنی رنگینیوں اور خوشبودوں سے بچی ہوئی تھی اور وہ دوسرا لڑاکا کے لئے عذاب بن گیا تھا۔ اسے اپنے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا اور انہیں بچانا اس کا فرض تھا اور اسے اس فرض کی ادائیگی کا کوئی راستہ نظر نہ آ رہا تھا۔

ہسپتال کے کیاؤنڈ میں پہنچ کر صنوبر نے گاڑی روک دی۔ اپنے ماتحتوں سے کہا کہ ہسپتال کے اندر جائیں۔ جب وہ چلے گئے تو اس نے کہا۔ ”جہلی میں تمہیں ایک مجرم

سمجھ کر یہاں نہیں لایا ہوں۔ آج تک یہی ہوتا آیا ہے کہ چوری کے بعد چور کو پکڑا ہے لیکن یقین کرو اس ہار کی چوری میں ہمیں چور کی تلاش نہیں ہے۔ ہمیں یہ ہار مل رہی ہے۔ صرف ہیروں کی تلاش ہے۔ وہ بھی مل جائیں گے تو ہم اس ہار کو مکمل کر سکتے ہیں۔ شہزادی کے حوالے کر دیں گے۔“

”اور چور کو معاف کر دیں گے؟“ جمالی ہنسنے لگا۔ ”صفر صاحب! آپ بچوں کی باتیں کرتے ہیں۔“

”تم کیس کی نوعیت نہیں سمجھ رہے ہو۔ اس لئے یہ ہچکناہ باتیں معلوم ہوتی ہیں دیکھو اگر ہار کی چوری کے متعلق اخبارات میں خبریں شائع ہو جائیں تو ملک کی کتنی ہرجا ہوگی۔ حاری دغا کے اخبارات اس خبر کو اچھالیں گے کہ شہزادی جیسی معزز شخص ہمارے ملک میں لوٹ لیا گیا۔“

”ہاں یہ بدنامی کی بات ہے۔“ جمالی نے قائل ہو کر کہا۔

”اسی لئے ہم نے چوری کی اس خبر کو پریس تک جانے سے روک دیا ہے۔ شہزاد شاہینہ بھی ہم سے تعاون کر رہی ہیں۔ ہمیں ان کا احسان ماننا چاہئے اور احسان مندی کا طور پر کم از کم یہ تو کوشش کرنی چاہئے کہ ان کا ہار انہیں واپس مل جائے۔ تم لاکھ سہی لیکن ملک کی عزت اور وقار کے لئے تمہیں بھی یہی کوشش کرنی چاہئے۔ کیا سلسلے میں تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟“

”مجھے اپنے ملک سے محبت ہے۔ چوری میرا پیشہ ہے اور حب الوطنی میرا فرض ہے۔ بتائیے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“

”تم چاہو تو خیمہ سے وہ ہیرے بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے ہو۔ وہ تمہاری آ کار ہے۔ تمہارے حکم سے انکار نہیں کرے گی۔“

”اچھی بات ہے۔ وہ ہیرے آپ کو مل جائیں گے لیکن یہ بات اچھی طرح نشین کر لیجئے کہ چوری کا مال برآمد کرنے کے بعد بھی آپ مجھے چور ثابت نہیں کر سکیں گے۔ اگر آپ نے مجھے دھوکہ دیا تو آئندہ کوئی چور یا بد معاش اپنے وطن کی خاطر مجھ سے کبھی تعاون نہیں کرے گا۔“

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔“

”چوری میں تمہارا نام تک نہیں آنے دوں گا۔“

”دو دنوں کار سے باہر آ گئے۔ جمالی نے ہسپتال کے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے
 ”اس سلیے میں ٹیمینہ اور راجو کا نام بھی نہیں آنا چاہئے۔“
 ”ٹیمینہ کا نام نہیں آئے گا۔ راجو کا نام آنے دو۔ اس لئے کہ کل رات وہ اور جولی
 پولس مقابلے میں مارے گئے ہیں۔ ان کے خلاف تو کوئی کیس بنانا ہی پڑے گا۔“
 جمالی نے اپنے حاتھیوں کی موت کی خبر سن کر سر جھکا لیا۔ صفدر اسے بتا رہا تھا کہ
 راجو نے خود کو قانون کے حوالے کرنے کی بجائے کس طرح پولیس سے مقابلہ کرنے کی
 بات کی تھی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے کمرڈ نمبرود کے دروازے پر آئے۔ وہاں اس کے
 نوٹ نے بتایا کہ کمرہ خالی ہے اور ٹیمینہ اس وقت آپریشن تھیٹر میں ہے۔
 صفدر اور جمالی کمرے کے اندر آ گئے۔ صفدر نے پوچھا۔ ”کیا وہ میرے کسی چیز میں
 بل کئے گئے ہیں؟“

”جی ہاں وہ پانچ عدد ہیرے ڈیڑھ انچ کے پلاسٹک کے ایک کیپول میں رکھے گئے
 ہیں۔“
 وہ دونوں کمرے کی ایک ایک چیز کو اٹھا اٹھا کر اس ڈیڑھ انچ کے کیپول کو تلاش
 کرنے لگے۔ آخر پانچ ہیرے ہو کر صفدر نے کہا۔ ”کیپول جہاں نہیں ہے۔ وہ ٹیمینہ کے پاس
 لگا ہوا ہے۔“

”ہوں۔“ جمالی نے تاکید کی۔ ”وہ اسے اپنے ساتھ آپریشن تھیٹر میں لے گئی ہے۔
 سے واپس آنے دیجئے۔ میں اس سے وصول کر لوں گا۔“
 ”کیسے وصول کرو گے؟ جب تک ڈاکٹر اجازت نہیں دے گا، ہم اس کے قریب بھی
 نہیں جا سکیں گے۔“

”آج یا کل ڈاکٹر ضرور اجازت دے دے گا۔ اگر اس کیپول کو ٹیمینہ نے چھپایا
 ہو گا تو میں اس سے حاصل کر لوں گا۔ اگر ڈاکٹر کی نیت خراب ہو گئی یا وہ کیپول کسی
 ”کمرے کے ہاتھ لگ گیا تو پھر میں مجبور ہو جاؤں گا۔ آپ خود ہی سوچئے کہ ڈاکٹر اس کے
 اسٹنڈ یا نرس وغیرہ اسے آپریشن تھیٹر میں بھی چھپا سکتے ہیں۔“

صفدر نے کہا۔ ”میں انہیں اس کا موقع نہیں دوں گا۔ جب ٹیمینہ باہر آئے گی تو
 تمہارا آپریشن تھیٹر کی بھی تلاشی لوں گا۔ میں نے خصوصی اجازت مارا حاصل کیا ہے جس کی
 اسے میں ڈاکٹر خاور جیسی معزز ہستی کو بھی جلاشی دینے پر مجبور کر سکا ہوں۔“

وہ دونوں کمرے سے نکل کر آپریشن تھیٹر کی جانب چلے گئے۔ وہاں انہیں ایک رات تک انتظار کرنا پڑا۔ جب ٹیم نے کو داپس دو نمبر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تو مصدقہ ماتحتوں نے آپریشن تھیٹر کی تلاشی شروع کر دی۔ اس نے خصوصی اجازت پر ڈاکٹر خادر کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تلاشی دینے سے انکار نہ کرے۔ کئی گھنٹے تک کے آدمیوں نے پوری توجہ اور تندی سے ہر اس جگہ کی تلاشی لی جہاں ایک کیسپول ہو جاسکتا تھا اور ہر اس شخص کو سر سے پاؤں تک ٹولا جو مشکوک نظر آیا۔ ہسپتال کے ڈسٹ بن میں ڈیڑھ انچ کا کیسپول پایا گیا لیکن وہ خالی تھا۔ اسے دیکھ کر یہ یقین سے بچ گیا کہ اس میں پانچ عدد ہیرے چھپا کر رکھے گئے تھے۔ شاکر جمال بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ راجر دی کیسپول دانیال جوہری سے لے کر آیا تھا۔ دانیال کو بلا کر پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے نہ تو نو لکھا ہار کو دیکھا ہے نہ اس میں سے ہیرے نکال کر کسی کیسپول میں رکھے ہیں۔ مصدقہ اور جمال نے اسے لاکھ یقین دلایا کہ اس خلاف کیس نہیں بنے گا لیکن وہ اپنے بیان پر قائم رہا۔ مختصر یہ کہ تمام ہسپتال کو کال ڈالنے کے باوجود وہ ہیرے نہیں ملے۔ ڈاکٹر خادر کی تلاشی لے کر بھی شرمندہ ہوا ہار اب صرف ٹیم ہی ایسی تھی جس کے پاس لازمی وہ ہیرے ہو سکتے تھے۔

ٹیم نے اپنے کمرے میں محو خواب تھی۔ وہ خواب میں پانچ عدد ہیرے دیکھ رہی تھی ان ہیروں کی چمک سے اس کا چہرہ بھی جگمگا رہا تھا۔ ڈاکٹر خادر بار بار اس کے کمرے آتا تھا اور گراف کی صورت دل کی حرکات کو نوٹ کرتا رہتا تھا۔ کئی بار ٹیم کی آنکھ تو اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک سے ڈاکٹر نے بھی یہی محسوس کیا کہ اس چہرے پر ہیرے کی سی آب و تاب ہے اور اس کا دل حیرت انگیز طور پر ایک صحت مند اور نارمل انداز کے دل کی طرح کام کر رہا ہے۔ ڈاکٹر کو اتنی جلدی اتنی زیادہ کامیابی توقع نہیں تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”ٹیم! تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ میں دنیا کی سب سے زیادہ حسین اور سب سے دولت مند عورت ہوں۔“

”پنے دل کے متعلق کچھ بتاؤ؟“

”میرا دل بالکل صحیح حالت میں دھڑک رہا ہے۔ مجھے کسی طرح کی گھبراہٹ ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ کوئی چور وہ ہیرے نہیں چاسا۔“

پولیس والے ہزار تلاشیوں کے باوجود اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے جہاں وہ ٹایاب بیرے محفوظ ہیں۔ اس اطمینان کے بعد نہ کسی طرح کی گھبراہٹ ہوتی ہے نہ پریشانی۔ دیکھئے نا، ہم اپنی پانچویں ڈیسے لاکر میں چھپا لیں جہاں تک کسی کا خیال بھی نہ جاسکے تو پھر ہماری طرح مطمئن اور آسودہ اور کون ہو گا۔ اسی لئے میں خود کو جب سے زیادہ دولت مند سمجھتی ہوں تو کچھ میرا وجود ان پانچ عدد ٹایاب بیروں کی تجوری ہے۔“

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ”واقعی دماغ پر سکون ہو، کسی قسم کی فکر اور پریشانی نہ ہو تو بال بال حالت میں کام کرتا ہے۔ تمہارا دل بھی میری توقع سے زیادہ اچھی حالت میں ہے۔“

”خاور۔ ابھی میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ہم سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں۔ ایئرپورٹ پر کسٹم والوں نے ہمیں روک لیا ہے۔ وہ ہمارے ایک ایک سامان کی تلاشی لے رہے ہیں۔ ایک لیڈی انسپکٹر مجھے علیحدہ کمرے میں لے گئی ہے اور میرا لباس اتار کر میرے تلاش کر رہی ہے لیکن وہ بیرے انہیں نہیں ملتے ہیں اور ہمیں سوئٹزر لینڈ جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ نادریہ کتنا سچا خواب تھا۔ کسٹم والے تو کیا آسمان کے فرشتے بھی ان ہیروں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

ڈاکٹر اس اعتماد سے اسے دیکھنے لگا کہ اس کا تجربہ اب بلاشبہ کامیاب ہو رہا تھا۔ انسان خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔ خیمہ بھی اپنی خواہش کے تابع فرمان تھی۔ دل اسی خواہش کے مطابق دھڑک رہا تھا۔ اب اس کی دھڑکنوں میں بے اعتدالی نہیں آسکتی تھی۔ بیڑی اپنا کام کر رہی تھی۔ خواہش اپنا رنگ دکھا رہی تھی اور اس کی دونوں آنکھیں بیرے کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

اس نے پوچھا۔ ”خاور! میں شاکر جہاںی اور پولیس والوں کی پروا نہیں کرتی۔ وہ کبھی ان ہیروں تک نہیں پہنچ سکیں گے لیکن میں ان سے ملنا نہیں چاہتی۔ وہ لوگ خواہ مخواہ اپنے سیدھے سوالات کریں گے۔ میری تلاشی کے لئے کسی عورت کو لے کر آئیں گے اور میں وہی طور پر پریشان ہوتی رہوں گی۔“

ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”تم ان کی فکر نہ کرو۔ میں انہیں اتنا موقع دے دوں گا کہ وہ تم سے ملاقات کریں اور تمہیں پریشان کریں۔ تم بھی کوئی ایسی بات نہ کہو جس کا غلط اثر تمہارے دماغ اور پھر دل پر پڑے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ وہ تمہاری

حلاشی نہ لیں تو پھر اطمینان رکھو۔ میں کسی کو تمہارے قریب نہیں آنے دوں گا۔ ابھر
میں چلتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر آؤں گا۔“

اس نے جھک کر شینہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کمرے سے باہر آگیا۔ باہر سے
آدمی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ شینہ کے کمرے میں ڈاکٹر کے
کسی کو نہ جانے دیں۔ ڈاکٹر بھی شینہ کی حفاظت کرنا خوب جانتا تھا۔ اس نے باہر
دردازے کو لاک کر دیا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی اس کی مریضہ کو پریشان نہ
جاسکے۔

اس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ رفتہ رفتہ رات کا اندھیرا مسلط ہو رہا
صفر علی کی کار قصر سلیمان کے احاطے میں داخل ہونے لگی تو شاکر جمالی نے پوچھا:
”آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟“

”یہ وہی جگہ ہے جہاں سے تم نے ہار اڑایا تھا۔ تمہیں تو اب کسی سے نہیں
چاہئے کیونکہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ
ادھورا نیکیلس شہزادی شاہینہ کو واپس کر دوں۔“

قصر سلیمان کے احاطے میں داخل ہوتے ہی جمالی کا دل دھڑکنے لگا تھا۔
شاہینہ کا نام من کر تو دل اور بے چین ہو گیا۔ اندھیرے کی آغوش میں سمٹ آئے۔
پھول بدن کی نزاکت یاد آنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کیا شہزادی اسے پہچان لے گی؟

وہ دونوں کار سے اتر کر قصر سلیمان کے برآمدے میں آئے۔ شہزادی کے سبز
نے صفر علی کو پہچان کر خوش آمدید کہا اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ تھوڑا
بعد شہزادی نے صفر علی کو طلب کیا۔ وہ جمالی کو ڈرائنگ روم میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا
تنہائی میں سوچنے لگا کہ صفر اسے یہاں کیوں لایا ہے؟ کوئی گہری جال تو نہیں ہے؟

”نہیں۔“ اس نے پھر سوچا۔ ”صفر وعدہ سے نہیں پھر سکتا۔ وہ دھوکہ نہیں
گا۔ شاید یہاں شہزادی سے سمجھوتے کے لئے آیا ہے کہ ہار کی چوری کو مسترد کیا جائے
صبح صفر نے بتایا تھا کہ شہزادی نے بھی مکمل تعاون کا وعدہ کیا ہے۔“

وہ زیادہ دیر تک نہ سوچ سکا۔ سیکرٹری نے آکر کہا کہ اسے صفر نے بلایا ہے۔
ابھی جگہ سے اٹھ کر سیکرٹری کے ساتھ چلتا ہوا اسی بل میں آگیا جہاں سالگرہ کے
مہمان جمع ہوئے تھے اور جہاں بالکونی کے قریب تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اس نے شہزادی

رہا تھا اور خود بھی لٹ گیا تھا۔ اس وقت بھی ہال میں نیم تاریکی تھی اور اس آدھی تاریکی اور آدھی میلی میلی روشنی میں بالکونی کے قریب وہ نظر آ رہی تھی۔ جمال کے دل کی دھک دھک اور تیز ہو گئی۔ اس نے اس پاس دیکھا۔ اس کے ساتھ آنے والا سیکرٹری نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سدر بھی نہیں تھا۔ سرف وہ تھا اور اندھیرے کی شہزادی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ بھی اس کی طرف آنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھینچے آ رہے تھے۔ بالکل قریب پہنچتے ہی ہال میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اگر روشنی ہوتی تو شاید ٹکلف ہوتا، اگر ایک دوسرے کی صورت نظر آتی تو جھجک ہی ہوتی لیکن وہاں چہرے مٹ گئے تھے۔ ماحول ڈوب گیا تھا، ہچکچاہٹ ختم ہو گئی تھی اور اندھیرے کا چور پھر نڈر اور بے باک ہو گیا تھا۔

شہزادی شاہینہ کی آنکھیں اس تاریکی میں نہیں دیکھ سکتی تھیں مگر احساسات بتا رہے تھے کہ وہ قد آور ہے۔ اس لئے وہ بچوں کے بل اٹھ گئی ہے۔ بازو فولا دیں اور سینہ چٹان ہے اور اس آغوش میں اس کی سانسیں رکی رکی جا رہی ہیں پھر ہونٹوں کے سنگم پر وہ جمل گئی۔ ایک بونے کی تکمیل پر اس نے کہا۔ ”تم وہی ہو۔“ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ میں نے حضور صائب سے کہا تھا کہ میں تمہیں اندھیرے میں پہچان سکتی ہوں۔ انہوں نے آزمائش کے طور پر تین اجنبیوں کو تاریکی میں میرے پاس بھیجا تھا۔ ان کے ہاتھوں کے لمس سے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ تینوں وہ نہیں ہیں جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہ صرف تم ہو، تمہاری آغوش میں آتے ہی میں یقین سے کہہ رہی ہوں کہ ایک بار چرانے کے بدلے میرے دل کو چرانے والے وہ اندھیرے کے چور تم ہی ہو۔“

”شہزادی صاحبہ آپ یہ کیا فرما رہی ہیں۔ ایک معمولی انسان ہوں اور آپ شہزادی ہو کر مجھ سے دل کی باتیں کرتی ہیں۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، شہزادی کے جیسے میں دل نہیں ہوتا۔ سب سے تم ہار لے کر گئے ہو، تمہاری وابستگی کا انتظار کر رہی ہوں۔ جس کا مال چوری ہوتا ہے اسے اپنے مال کی فکر ہوتی ہے لیکن اب تک میں ہار کے لئے نہیں، تمہارے پیار کے لئے سوچ رہی تھی۔“

بیات حضور صاحب سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ میں تمہیں اتنا چاہتی رہا اتنا چاہتی ہوں کہ تمہیں دیکھے بغیر تاریکی میں پہچان لیتی ہوں۔ ایسی پہچان اسی کو

ہوتی ہے جو دل سے کسی کو چاہتی ہو۔“

شاہر جمال نے اسے اپنے ہانڈوں میں بلند کر لیا اور اپنے چہرے کے قریب لایا۔
”آپ بھی نکل سے میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں لیکن آپ کے بلند مرتبہ کا
تھا اس لئے زبان چپ تھی۔ میں ایک چور ہو کر آپ کی تمنا نہیں کر سکتا تھا مگر آپ اور
بڑھارہی ہیں۔ اس لئے اب میں بھی آپ کی تمنا کرتا ہوں۔“

تاریکی میں کئی چراغ روشن ہو گئے۔ ان جذباتی چراغوں کی روشنی میں
دوسرے کو دیکھ سکتے تھے لیکن کوئی تیسرا انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ہسپتال سے صدر کے ماتحت کا فون آیا۔ اس نے صدر کو
ڈاکٹر خاور اس سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ڈراویر بعد فون کے دوسری طرف
ڈاکٹر خاور کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مسٹر صدر اگر آپ ٹیمپ سے ملاقات کرنا
چاہتے ہیں تو شاہر جمال کے ساتھ آجائیے۔“

”اچھی بات ہے۔ میں جمال کے ساتھ ابھی آتا ہوں۔“

”ایک منٹ۔“ ڈاکٹر خاور کی آواز آئی۔ ”کیا آپ شہزادی شاہینہ کو اپنے راز
سکتے ہیں؟“

”شہزادی صاحبہ کو ان ہیروں کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہسپتال تک
پسند نہیں کریں گی۔“

”کیا فون پر شہزادی سے گفتگو کروا سکتے ہیں؟“

”ہولڈ آن کیجئے میں کوشش کرتا ہوں۔“

صدر نے یہ بات سیکرٹری سے کہی۔ سیکرٹری نے شہزادی کے پاس جا کر کہا کہ
سرجری کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر خاور آپ سے فون پر بات کرنا چاہتے
ہیں۔ شہزادی اتنی بڑی ہستی سے گفتگو کرنے کے لئے بخوشی تیار ہو گئی۔ چند منٹ بعد دونوں
درمیان رابطہ قائم ہو گیا۔ ڈاکٹر خاور نے کہا۔ ”شہزادی شاہینہ صاحبہ! آپ ہمارے
میں تشریف لائی ہیں۔ آپ نے یہاں عجائب گھر اور تاریخی عمارتیں دیکھی ہوں گی۔
آپ نے اس ملک کی ایک ایسی عورت کو نہیں دیکھا جو بیٹری سسٹم کے ذریعے زندہ
یہ عورت صرے زیر علاج ہے اور ہسپتال کے اسٹیشنل وارڈ میں ہے۔ کیا آپ اسے
پسند کریں گی؟“

شزاوی نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”آہا! میں اسے ضرور دیکھوں گی۔ میں نے اخبارات میں دیکھا ہے کہ میڈیکل سائنس میں اس قسم کے تجربات کے جارہے ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے ایک ایسی عورت کو دیکھوں گی جس پر یہ تجربہ کیا جا رہا ہے۔ آپ بتائیں مجھے کس وقت ہسپتال آنا چاہئے اور وہ ہسپتال کہاں ہے؟“

”آپ ابھی آ سکتی ہیں۔ مسٹر صفدر اور شاکر جمالی ابھی یہاں آ رہے ہیں۔ کیا آپ وہاں کے ساتھ تشریف لائیں گی؟“

”جی ہاں۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔“

فون پر گفتگو ہونے کے ایک گھنٹہ بعد شزاوی ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر جمالی بیٹھا ہوا تھا۔ صفدر علی اپنی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب وہ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر خاور ان کا منتظر تھا۔ اس نے شزاوی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ فی الحال آپ اسے دور سے دیکھیں۔ پہلے میں آپ لوگوں سے ضروری باتیں کروں گا۔ اس کے بعد آپ مناسب سمجھیں تو اس سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ میں انکار نہیں کروں گا۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے کمرہ نمبر دو کے پاس آئے۔ ڈاکٹر نے ایک کھڑکی کے پاس انہیں کھڑا کر دیا۔ وہاں سے ٹینے کمرے کے اندر نظر آ رہی تھی۔ اس وقت وہ بستر پر لیٹی ہوئی دھچکے سے سوپ پی رہی تھی۔ شزاوی نے دیکھا اس مریضہ کی پشت ننھے سے کوہان کی طرح ابھری ہوئی ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”کیا یہ عورت کبڑی ہے؟“

”نہیں!“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”یہ جسمانی اعتبار سے بے عیب ہے۔ سر سے پاؤں تک اس کے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ یہ بظاہر کبڑی نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی پشت سے پلاسٹک کا ایک کیس منسلک ہے جس میں بیٹریاں نصب ہیں۔ ان بیٹریوں کے ذریعے اس کے دل تک قوت اور حرارت پہنچائی جاتی ہے۔ آئیے میں آپ کو اس کا ایکسرے دکھاتا ہوں۔“

وہ ان کے ساتھ اپنے دفتر والے کمرے کی طرف جانے لگا۔ شزاوی بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اس سے تمام باتیں تفصیل سے سمجھا رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے ایک ایکسرے اٹھا کر دکھائی۔ ”دیکھئے انسان کا دل بائیں طرف ہوتا ہے۔ یہ ہاتھیں طرف کی پشت کا ایکسرے

ہے۔ میں نے اس پر قلم سے یہ چوکور حاشیہ دیا ہے۔ یہ حاشیہ پلاسٹک کا کیس دیکھئے یہ وہ عدد ننھی سی بیٹریوں میں اتنی قوت ہے کہ یہ چھ ماہ تک دل کے تمام فنکشن اعتدال پر رکھ سکتی ہیں۔

”اتنی قوت کی بیٹریاں ہونے کے باوجود ان میں ایک چیز کی کمی تھی۔ میں نے ایک ماہ کے دوران ٹیمپ کے دل کی حرکتوں کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس مادی تجربے میں وہ حانیت کی اہم ضرورت ہے۔ ٹیمپ کو جب تک روحانی نوٹی وہ نہیں ہوگی اس وقت تک تنہا بیٹریاں اسے صحیح حالت میں زندہ نہیں رکھ سکیں گی۔“

”روحانی خوشی سے میری مراد یہ ہے کہ ایسی سرسبز جنہیں ہم دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں۔ جو اعلیٰ ظرف کے لوگ ہوتے ہیں وہ رب العزت کے سامنے یہ کر کے یا کسی کے ساتھ نیکی کر کے وہ حانی خوشی حاصل کرتے ہیں اور جو کم ظرف ہوتے ہیں وہ چورلی کا مال حاصل کر کے دل کی گہرائیوں سے خوشی محسوس کرتے ہیں۔“

”میں نے ٹیمپ کو خوشیاں دینے کے لئے اس سے محبت کی اور اس سے ملنا دعوہ کیا۔ حالانکہ میں بہت مصروف ڈاکٹر ہوں۔ گئے اتنی فرصت نہیں ہے کہ میں اس سے محبت کروں لیکن میں جس تجربے سے گزر رہا ہوں اس کے لئے ٹیمپ کی زندگی بہت اہم ہے۔ اس لئے میں اپنے تجربے کو کامیاب بنانے کے لئے اس سے محبت کا ناک بٹا لگا۔“

”کچھ عرصہ تک وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی سمجھتی رہی کہ دنیا جیسا شہرت یافتہ ڈاکٹر اس سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس میں زندہ رہنے کی لگن پیدا ہو گئی۔ لگن اور خوشی کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ٹیمپ کا دل ایک طرف دماغ سے ہم آہنگ ہو گیا اور دوسری طرف بیٹریوں کا زیر اثر نارمل حالت میں کام کرنے لگا۔“

”اس دوران ٹیمپ نے بتایا کہ اسے اپنے جسم پر بہرے جو اہرات سجانے کا پورا تجربہ ہے۔ اسی لالچ میں وہ شاکر جمالی کی آلہ کار بن گئی۔ ایک روز اس کی زبانی معلوم ہوا کہ جمالی پانچ عدد بہرے بطور امانت اس کے پاس پہنچانے والا ہے۔ میں اگلے ہفتے ٹیمپ کو تجربات کے لئے سوئٹزر لینڈ لے کر جا رہا ہوں۔ ٹیمپ بہرے پیچھے پڑ گئی کہ میں وہ سب کسی طرح چھپا کر ملک سے باہر لے جاؤں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ غیر قانونی ہے۔“

بہرے جیسا معزز ڈاکٹر ایسا کام نہیں کر سکتا۔ ہمیں اپنی عزت اور شہرت عزیز ہوتی ہے۔ بہرے بات سن کر وہ رد نے لگی۔ مر جانے کی دھمکیاں دینے لگی۔ میں یہ کیسے گوارا کر لیتا ہوں کہ مر جائے اور میرا تجربہ ادھورا رہ جائے۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں وہ بہرے چھپا کر ملک سے باہر لے جاؤں گا۔

”میرے سامنے بڑی الجھنیں تھیں۔ میں قانون کے خلاف کوئی کام بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور ٹینے کو اپنے تجربہ سے زندگی بھی دینا چاہتا تھا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں ٹینے کو ہر حال میں خوش رکھوں گا کیونکہ میرے تجربہ کی کامیابی سے اس دنیا کے لوگوں کو روڈوں انسانوں کو فائدہ پہنچنے والا ہے۔“

اس نے دوسرا ایکسپریس اٹھا کر کہا۔ ”یہ دیکھئے۔ آج دوپہر کو ٹینے کی بائیں پشت کا لائبرا ایکسپریس لیا گیا ہے۔ پلاسٹک کے کیس میں یہ وہ عدد بیڑیاں نظر آ رہی ہیں اور یہ جو پانچ عدد چھوٹے چھوٹے دھبے نظر آ رہے ہیں۔ یہ وہی پانچ عدد بہرے ہیں جو شہزادی صاحبہ کے ٹیکس سے نکالے گئے ہیں۔“

اس کی بات جتنے ہی سب چومک کر ایکسپریس فوٹو کو دیکھنے لگے۔ وہاں پانچ عدد ننھے ننھے دھبے ایک دوسرے میں کھڑے تھے۔

”کیا یہ واقعی میرے ٹیکس کے بہرے ہیں؟“ شہزادی نے حیرانی سے پوچھا۔
”جی ہاں!“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”یہ دی بہرے ہیں جن کے لئے کل سے مسٹر صفدر پریشان ہیں۔“

صفدر نے کہا۔ ”ڈاکٹر اگر یہ بہرے ہیں تو آپ نے انہیں ایک عورت کے اندر چھپا کر رکھ لیا ہے۔ آپ چوری کامال اسمگل کر کے سوئٹزر لینڈ لے جانا چاہتے ہیں۔“
ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر میں اسمگل کرنا چاہتا تو آپ کے فرشتے بھی کبھی ان بیڑیاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کیا آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بیڑیوں اور تاروں کے درمیان کس طرح پانچ عدد بہرے کے لئے محتاج کش نکالی گئی ہے۔ کسٹم کا کوئی بھی چیکر اتنی آسانی تک نہیں سوچ سکتا۔ اگر اسے شبہ ہو بھی جائے تو بھی وہ یہ احقافہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ بہرے ٹینے کے اندر سے نکال کر اسے سوت کے منہ میں پھنسیا جائے۔“

صفدر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”کچھ بھی ہو۔ یہ جرم ہے۔ آپ شہزادی صاحبہ کی بہنوں کے بغیر ان بہروں کو اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکتے۔“

”مجھے شہزادی صاحبہ سے اجازت لینے کا موقع نہیں ملا۔ ٹیمینہ نے مجھے یہ خبر دی کہ وہ ہیرے کہاں سے چرا کر لائے جائیں گے۔ اس نے صرف شاکر ہمالی کا نام لیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ہیرے کس کی ملکیت ہیں تو میں ان گے مالک سے ضرور اجازت لیتا۔“

”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اتنے نایاب ہیرے یونہی آپ کو دے دیئے جائے؟“
 ”ہاں، کوئی اپنی قیمتی چیز یونہی نہیں دے دیتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی جان بچانے کے لئے اس قیمتی شے کو عطیہ کے طور پر دے دیتے ہیں۔ شہزادی صاحبہ کو یہاں تک آنے کی زحمت اسی لئے دی ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے مرلیضہ کو اور میرے تجربے کو دیکھیں اور وہ پانچ عدد ہیرے اس وقت تک عطیہ کے طور پر دے دیں جب تک ٹیمینہ زندہ ہے۔ جب اس کی زندگی کے دن پورے ہو جائیں گے تو وہ ہیرے شہزادی صاحبہ کی خدمت میں لوٹا دیئے جائیں گے۔“

”میں بخوشی یہ پانچ ہیرے عطیہ کے طور پر دیتی ہوں۔ میرے لئے یہ فخر کا لمحہ ہوگی کہ آپ کے تجربے کو آگے بڑھانے میں میری دولت کا کچھ حصہ کام آ رہا ہے۔ ہیرے ہمارے زینت بن کر رہیں گے تو مھن چمکتے ہوئے پتھر کہلائیں گے۔ اگر ٹیمینہ دھڑکتے ہوئے دل کے قریب رہیں گے تو تمام انسانی برادری کے لئے روشنی کا چراغ بن جائیں گے۔“

”مجھے آپ جیسی رحم دل شہزادی سے ایسی ہی سخاوت کی توقع تھی۔“
 حضور نے پوچھا: ”ڈاکٹر، کیا یہ ضروری تھا کہ ٹیمینہ کو خوش رکھنے کی خاطر آپ کچھ وہ ہیرے بیٹریوں کے ساتھ رکھ دیتے۔ اس سے جھوٹ بھی کہا جاسکتا تھا کہ یہ اس کے اندر چھپا دیئے گئے ہیں۔“

ڈاکٹر نے کہا: ”میں جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ٹیمینہ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ موئٹر لینڈ پہنچنے کے بعد جب بھی بیٹری بدلنے کی ضرورت پیش آئے تو میں اسے نکال کر اس کے حوالے کر دوں۔“

”ٹیمینہ کے اس مطالبے کے پیش نظر میں یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وقت کسی بیٹری میں کوئی نقص پیدا ہو جائے گا اور اس کی جگہ دوسری بیٹری کی ضرورت پیش آئے گی۔ ایسی صورت میں آپ خود سوچئے کہ بیٹری بدلنے کے بعد

ہیروں کا مطالبہ کرے اور ہیرے موجود نہ ہوں تو اسے کتنا صدمہ پہنچے گا اور ساتھ ہی ہیرے تجربے کو بھی کتنا نقصان پہنچے گا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اسے خوش اور مطمئن رکھنے کے لئے ان ہیروں کی موجودگی ضروری ہے۔

”اس کی مثال یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ گھڑی کی ٹک ٹک جو ٹیکل گے بغیر قائم نہیں رہتی۔ جو ٹیکل ہیرے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ہیرے کے بغیر ٹیمینہ کے دل کی دھک دھک برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس وقت ٹیمینہ پانچ جو ٹیکل کی عورت ہے۔“

”عورت کو اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کے زیورات چھین لئے جائیں گے تو وہ انہیں لاکر ذمہ چھپا کر رکھ دیتی ہے۔ ٹیمینہ بھی عام عورتوں کی طرح ہے۔ وہ ہیرے اس کے بدن پر بچے رہیں یا نہ رہیں۔ اس کے بدن کے اندر تو محفوظ ہیں۔ اسی لئے وہ مطمئن ہے اور زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے کا حوصلہ کرتی رہتی ہے۔“

”سٹر صدر! آپ فرض شناس آفیسر ہیں۔ آپ قانون شکنی پسند نہیں کرتے ہیں لیکن افسوس کہ میں نے ایسا کام کیا ہے جو قانون کے خلاف ہوتے ہوئے بھی قانون میں لپ پڑا کرتا ہے کہ مجھے مجرم نہ سمجھا جائے کیونکہ میں تمام انسانوں کی بھلائی کے لئے ایک اہم تجربہ سے گزر رہا ہوں۔“

”دیکھئے۔ چوری کا مال جہاں بھی ہو، آپ وہاں سے نکال کر لے آتے ہیں۔ جو مال بڈ نے چھپا رکھا ہے، اسے آپ نکال کر نہیں لاسکتے۔ یہاں قانون آپ کو اجازت نہیں دے گا کہ آپ ایک مریضہ کی جان لے کر وہ ہیرے برآمد کریں۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے آپ کو اور آپ کے قانون کو ٹیمینہ کی طبعی موت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

صدر مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ گیا۔ شہزادی شاہینہ اور شاکر جمالی بھی کمرے سے باہر آ گئے۔ ڈاکٹر خاور ان کے پیچھے تھا۔ وہ سب پھر اسی کھڑکی کے پاس آ گئے جہاں سے ٹیڑھ نظر آ رہی تھی۔ وہ بستر پر سپ چاپ دائیں کروٹ لئے ہوئے آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔

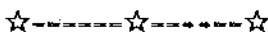
شہزادی شاہینہ نے اسے دیکھ کر منہ چا۔ ”یہ عورت ہیرے پانچ جو ٹیکل کی بددلت ہے۔ اس کے مرنے کے بعد وہ ہیرے مجھے داہیں مل جائیں گے اور میری شہرت بڑھ جائے گی کہ ڈاکٹر کے تجربے کو کامیاب بنانے میں میری سخاوت اور رحمہی نے زیادہ کام کیا ہے۔“

شاہر جمالی نے ٹینے کو حسرت سے دیکھ کر سوچا۔ ”میں نے اس کم بخت کو اللہ کے
طور پر رکھنے کو دیئے تھے۔ وہ پانچوں ہیرے نگل گئی۔ اب میں اس کے اندر سے لاپرواہ
کیسے نکالوں۔ اس کے اطراف میں سخت پہرہ ہے اور میرے پاس وقت بھی نہیں
شہزادی مجھے اپنے ملک لے جا رہی ہے۔ شاید وہاں ان سے بھی قیمتی ہیرے (تکڑے)
جائیں۔“

صفدر علی نے بے بسی سے سوچا۔ ”ڈاکٹر ایک مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے
اور ٹینے نے چوری کا مال اپنے بدن کے مکان میں چھپا رکھا ہے لیکن دنیا کا کوئی قانون
اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ میں اس مکان سے مال برآمد کروں۔ ڈاکٹر
جرم کیا ہے کہ قانون اس کے سامنے بے بس ہو گیا ہے۔“

اس وقت تک ڈاکٹر خاور کمرے کے اندر پہنچ گیا تھا اور اسٹیتھو سکوپ سے
دل کی دھڑکنوں کو سمجھ رہا تھا۔

دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں۔ ”دھک دھک۔ دھک دھک پانچ ہوٹا
عورت“ اور اس عورت کی آنکھیں مسرتوں کے جھوم میں ہیرے کی طرح ہلک
تھیں۔



بوڑھی جوانی

بڑھاپے کے ہاتھوں تک آئے ہوئے ایک بوڑھے کی دلچسپ کہانی۔
نذرت نے ایک ننھی لڑکی کے عوض اس کی جوانی واپس کر دی تھی۔
الٹانک انجام کی فکر انگیز کہانی۔

بڑھاپا ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک جگہ چوٹ لگے تو دوس جگہ سے ٹیسس اٹھتی ہیں۔ بڑھے نے پیچھے دھکا دیا تھا اور بیٹے نے آگے سے ایک طمانچہ جڑ دیا۔ طمانچہ گال پر لگاؤ نہ کر، بوڑھے باپ کو ایسا لگا تھا جیسے مرے پاؤں تک اس کے جسم پر ہتھوڑے برسائے گئے ہوں۔ وہ چکرا کر فرش پر گر پڑا۔

جس زمین پر وہ گرا، وہ زمین اس کی اپنی تھی۔ چاروں شانے چت ہو کر وحشیانہ کی چھت کو دیکھ رہا تھا دو کوٹھی بھی اس کی ملکیت تھی اور جس بیٹے نے اسے طمانچہ مارا تھا وہ بیٹا بھی اس کے اپنے خون کے ایک قطرے سے تخلیق ہوا تھا۔ اس نے بڑھاپے کے باعث دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھ کر کہا۔

”تو نے مجھے نہیں مارا، میرے بڑھاپے نے مجھے مارا ہے۔ اگر میں تیری طرح جوان ہوتا تو ایک ہی گھونٹے میں تجھے ٹھنڈا کر دیتا۔ کیا تو بھول گیا کہ میں اپنی جوانی میں اپنے وقت کا ایک ناقابل شکست باکسر تھا؟“

بیٹے نے شراب کے نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ ”تو جب تک زندہ رہے گا، جوانی کو یاد کر کے بوڑھا رہے گا۔ صبح سے رات گئے تک تیری بکواس سن سن کر ہمارا کان پک گئے ہیں۔ میرے بے وقوف ڈیڈی! تیری جوانی اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ تجھے تو اب مرجانا چاہئے۔ مگر تو ہے کہ مرنے کا نام تک نہیں لیتا ہے۔“

”ہر چیز اپنے مقررہ وقت پر فنا ہوتی ہے۔ مگر مجھے وقت سے پہلے مارنے کے لئے، نے آج میرے دودھ میں زہر طاردیا۔“ وہ کراہتے ہوئے فرش پر سے اٹھنے لگا۔ ”آداب بڑھاپا!..... بسو کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ ضرور دودھ کچھ کالا ہے۔ جو بسو سوکھی روٹی اور باسی سالن کھلاتی آئی ہے وہ آج دودھ سے بھرا ہوا گلاس نے کر آئی تھی۔ میں، میں بوڑھا ضرور ہوں، مگر میرا دماغ بوڑھا نہیں ہے۔ بسو کے ہاتھ میں جو انوں سے زیادہ سوچتا ہے اور سمجھتا ہے۔ بسو گلاس رکھ کر گئی تو میں نے وہ دودھ لیا تو

رہا۔ آہ! بے چاری کیسے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اری او خالم ہو! تیرے سینے میں دل نہیں بچ رہا۔ ارے او شرابی بیٹے! جو عورت دولت اور جائیداد کے لالچ میں تیرے باپ کو زہر دے سکتی ہے، وہ ایک دن اسی لالچ میں تجھے بھی زہر دے کر ہلاک کر دے گی۔“
وہ پلٹ کر باہر جاتے ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ انکار کی صورت میں ہلاتے ہوئے

بولے۔ ”نہیں نہیں۔ اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ اس گھر میں گزرنے والا ایک ایک لمحہ زہر پڑا ہے۔ کوئی بھی لمحہ میری لاعلمی میں مجھے ڈس نہ لے گا۔“
بیٹے کا ایک طمانچہ کھا کر اس کی کمر کچھ اور جھک گئی تھی۔ وہ جھکے جھکے ڈنگاتے ہوئے قدموں سے کوٹھی سے باہر آگیا۔ باہر بچ سڑک پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی عالی شان کوٹھی کو دیکھتے ہوئے حسرت سے کہا۔ ”میں نے بانسنگ میں بڑی بڑی رقبیں جیت کر یہ عالی شان کوٹھی بنائی تھی اور بڑھاپے میں آرام سے زندگی گزارنے کے لئے بہت سی دولت جمع کی تھی۔ مگر یہ بھول گیا تھا کہ بیٹا جوان ہو کر مجھے ایک ہی طمانچے میں ناک آڑے کر دے گا۔ اے دولت مند لوگو! میری نصیحت کو غور سے سنو۔ اپنی ساری دولت اپنی جوانی میں ہی خرچ کر ڈالو۔ ڈاکو تمہیں لوٹے آئیں تو قانون تمہاری حفاظت کرتا ہے لیکن اولاد بونٹنے پر آئے تو وہی قانون منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ میرے بیٹے اور ہونے بھی یہی کیا۔ پہلے بڑی محبت سے تمام دولت اور جائیداد اپنے نام لکھوائی۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے بوڑھا خبطی اور پاگل ثابت کرنے لگے۔ اب میں کسی سے کہوں گا کہ میری ہونے مجھے زہر دینے کی کوشش کی تھی تو لوگ مجھے بوڑھا خبطی کہیں گے۔ کوئی یقین نہیں کرے گا کہ اتنی خدمت گزار ہو کبھی ایسی خالماں حرکت کر سکتی ہے، اور میں کسی سے طمانچہ کھانے کا ذکر نہیں کر سکتا۔ اس میں میری ہی توہین ہے، میرا ہی قصور ہے۔ میں نے طمانچہ مارنے والا بیٹا کیوں پیدا کیا تھا؟“

یہ کہہ کر اس نے سرد آہ بھری اور بڑبڑاتے ہوئے بچ سڑک پر آہستہ آہستہ چلے لگا۔

”میرا جی چاہتا ہے کہ میں پھر سے جوان ہو جاؤں اور بیٹے کو طمانچے کا جواب ایک ٹکونی سے دوں۔ میری واپس آنے والی جوانی کا ایک گھونسا اس ستر رست اور توانا بیٹے کو چاروں تک ہسپتال میں سلا کر رکھے گا۔“

صد افسوس کہ انسان کے تمام اصول اور قانون بدل سکتے ہیں لیکن قدرت کا قانون نہیں بدل سکتا۔ میں بڑھاپے سے جوانی کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔“

وہ سوچتا ہوا اور زیر لب بڑبڑاتا ہوا اتنی دور تک چلا گیا کہ اس کا پرہیزاں تھک کر بائنے لگا۔ وہ ایک پارک کے بیچ پر اپنی سانس درست کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ پارک میں اچھی خاصی چمپل پھل تھی۔ حسین عورتیں اور خوبرو مرد ہر سو ہنستے بولتے نظر آرہے تھے۔ پارک کے مختلف گوشوں میں نوجوان جوڑے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے جوانی کی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ ماحول اتنا رنگین اور پُر کیف تھا کہ اسے پھر اپنی جوانی یاد آئے گی۔

جوانی نے جوان گلابو کی یاد دلائی۔ گلابو ایک گلابی رنگت کی تیز طرار حسین عورت تھی۔ پھلجھڑی جیسی چنگاریاں بکھیرتی جوانی کو جب وہ سجا بنا کر مجرا پیش کرتی تو تماشائی لوٹ پوٹ ہو کر نوٹوں کی بارش کرتے تھے۔ وہ بھی اپنے بڑھاپے کی کمزور لاش کو اٹھائے کوٹھے پر جاتا تھا مجرا ختم ہونے کے بعد وہ گلابو کے جوان گد رائے ہوئے زانو پر سر رکھ کر تمام رات سوتا تھا (صرف سوتا تھا) صبح اٹھ کر مومو کے پندرہ نوٹ اس کی گود میں رکھ کر چلا جاتا تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بوڑھا عیاش تھا۔ نہیں یہ دنیا والے غلط سوچتے ہیں۔ ان دولت مند بوڑھوں کے سلسلے میں سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ وہ صرف اپنے بڑھاپے کا دکھ بھلانے جاتے ہیں۔ جب ساری دنیا کے نوجوان انہیں بوڑھا بے کار اور ناکارہ سمجھنے لگتے ہیں تو زمین کے اس سرے سے اس سرے تک صرف طوائف ہی ایک ہستی ہوتی ہے جو چند نوٹوں کے عوض اپنی جوانی کا تھوڑا سا حصہ انہیں سر رکھ کر سونے کے لئے دیتی ہے۔

بوڑھے نے دور اٹھلا کر چلنے والی حسین عورتوں کو دیکھا۔ پھر بوڑھوں کی حالت کے مطابق بڑبڑانے لگا۔ ”اب مجھے اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ جب سے میں بوڑھا ہوا ہوں تب سے جوانی کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اور ہانپتی ہوئی آواز سے اپنی جوانی کو واپس بلا رہا ہوں۔ میں گلابو کے زانو پر سر رکھتا تھا کہ اس کے شبلی بدن کی حرارت مجھ تک پہنچتی تھی۔ اگرچہ میرا جسم بوڑھا ہی رہتا تھا مگر نیالات ہڑبڑا کر جوان ہو جاتے تھے۔ ارے دنیا والو! ہم بوڑھوں کو اتنا تو جینے کا حق دو کہ ہم خیالوں کی دنیا میں جوان ہو کر زندہ

راہ لیں۔
 کاش! اس وقت میری جیب میں سو سو روپے کے پندرہ نوٹ ہوتے، میں گلابو کے پاس چلا جاتا۔ وہ تمام نوجوانوں کے مقابلے میں مجھے زیادہ پسند کرتی۔ کیونکہ میں ایسا گاہک ہوں جو اس کی جوانی کو نہیں چھیڑتا۔ اس کے بدن کو میلا نہیں کرتا۔ میں صرف اس کے زانو پر سر رکھ کر سوتا ہوں اور اس کے عوض ایک بھاری رقم دیتا ہوں۔ دوسرے نوجوان جو گلابو تک نہیں پہنچ سکتے، وہ مجھے اپنا رقیب سمجھتے ہیں۔ اس طرح صبری انانیت کی تسکین ہوتی ہے کہ وہ مجھے بھی جوان سمجھتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے اپنا رقیب کیوں سمجھتے؟“
 اس کی بڑبڑاہٹ اچانک ہی ختم گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک قوی وکیل جوان کھڑا تھا۔ جوان نے بوڑھے سے کہا۔

”میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ کیا تم مشہور زمانہ باکسر نہیں ہو؟ تمہارا نام مراو علی ہے۔“
 سراو علی یہ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگا کہ اس کا کوئی قدر دان اس مصیبت کے وقت اس کی مدد کرنے آیا ہے۔ اس نے بوڑھی اور کمزور آواز میں کہا۔
 ”ہاں بیٹا! میں مراو علی ہوں اور کبھی ایک ناقابل شکست باکسر تھا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی نوجوان پینترا بدل کر اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھ کر بالنگ لڑنے کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ پھر اسے لگاتار تے ہوئے بولا۔
 ”میرے پرانے دشمن! بی ریڈی! آج میں تجھے ناک آؤٹ کروں گا۔“
 سراو علی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”ٹھہرو برک باؤ! تم میرے بچے کے برابر ہو۔ بھلا میری تمہاری کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“

نوجوان نے کہا۔ ”ہماری دشمنی براہ راست نہیں ہے۔ یاد کرو، تمہارے عروج کے نالے میں ایک اور رستم نامی بہت ہی ناسور باکسر تھا۔“
 ”ہاں، مجھے یاد آگیا۔ رستم واقعی ایک زبردست باکسر تھا لیکن میں نے تیسرے ہی رائڈ میں اسے زمین دکھا دی تھی۔“

”جو اس بہت کمزور۔“ نوجوان نے دھاڑ کر کہا۔ ”وہ میرا باپ تھا۔ اپنی شکست اور نوین برداشت نہ کر سکا، چند ہی دنوں بعد مر گیا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اس کی توہین اور اس کی موت کا بدلہ تجھ سے لوں گا، لیکن اس وقت میں بارہ تیرہ برس کا تھا، تیرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب میں بھی بیوی ویت باکسر ہوں۔“

”مگر اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ پہلے تو میرے مقابلے کے قابل نہیں تھا۔ اب میں تیرے مقابلے کے قابل نہیں ہوں۔ کیا تجھے دکھائی نہیں دیتا کہ میری کمر جھک گئی ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں بظاہر مضبوط نظر آتے ہیں، مگر یہ اندر سے کھوکھلے اور کمزور ہیں۔“

”یہ میری خوش نصیبی ہے کہ وقت نے تجھے کھوکھلا اور کمزور بنا دیا ہے اور مجھ میرے نام لکھ دی ہے۔ بی ریڑی۔“

مراد نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ جوڑ توڑ کا مقابلہ نہیں ہے۔ میں تجھ سے مقابلہ نہیں کروں گا۔ میں تجھ سے نہیں لڑوں گا۔ اگر انصاف سے انتقام لینا چاہتا ہے تو میرے مقابل کسی بوڑھے کو لا کر کھڑا کر دے۔“

”بوڑھے باکسر۔ انتقام کبھی انصاف سے نہیں لیا جاتا۔ لمے منبھال ہوا گھونسہ.....“

نوجوان نے بڑی پھرتی سے اس کی ناک پر گھونسہ مارنے کی کوشش کی۔ مراد نے بڑھاپے کے باوجود عادتاً اس سے زیادہ پھرتی دکھائی۔ اس کا سر آپ ہی آپ اوپر اٹھ گیا اور نوجوان کا گھونسہ اس کی ٹھوری کے نیچے سے گزر گیا۔

نوجوان سمجھ گیا کہ وہ بوڑھا بالکل ہی گیا گزرا نہیں ہے۔ قدرتی طور سے کمزور ہو گیا ہے لیکن ایک باکسر کی حادث کے مطابق ذہنی طور پر اب بھی پھرتیلا پن موجود ہے۔ اس نے سنبل کر پچنگ شروع کی۔ مراد اس کے ہر چوکور دکھائی دینے والے نوجوان پر بار بار حانہ ملے نہ کر سکا۔ اگرچہ وہ دونوں قد کے لحاظ سے برابر تھے مگر مراد کی کمر بڑھاپے سے ایسی جھکی ہوئی تھی کہ اس کا مکانو نوجوان کے چہرے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پھر اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ایک راؤنڈ تین منٹ کا ہوتا ہے۔ تین منٹ ہو چکے ہیں۔ اب ذرا دیر سستہ کرنے کا وقفہ دو۔“

وہ ایسی سمجھ کر سست پڑ گیا کہ باکسنگ کے قاعدے کے مطابق وقفہ ہو گا کہ نوجوان نے ایک زبردست گھونسہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ بوڑھے کی جیسے سانس رک گئی۔ آنکھوں کے سامنے اچانک ہی دنیا تاریک ہو گئی پھر وہ چکر اکر گر پڑا۔

نوجوان ایک سے دس تک گننے لگا۔ دس کے بعد بھی وہ نہ اٹھ سکا تو اس نے جھک کر اسے دیکھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس نے حقارت سے اسے ٹھوکر مار کر کہا۔

”ادنیہ۔“

ماٹھے نے جی بھر کر انتقام لینے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ایک ہی گھونسے سے

نہا ہو گیا۔ اچھی بات ہے۔ اگر یہ زندہ رہ گیا تو پھر کسی دن اس کی مرمت کروں گا۔ یہ دعا میرے گھونے کھا کر ہی مرے گا۔“

یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ بوڑھا تقریباً دس پندر منٹ تک بے حس و حرکت پڑا۔ اس کی آدمی موت واقع ہو چکی تھی۔ پھر وہ رفتہ رفتہ لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا اور کف سے کراہنے لگا۔ ذرا دیر بعد حواس بحال ہوئے تو آنکھیں کھول کر اپنے اطراف سے گھما کر دیکھنے لگا۔

اسے یاد آ گیا کہ یہ دنیا صرف مغرور نوجوانوں کی ہے اور اس دنیا میں اسے صرف بڑا اور گھونے مل رہے ہیں۔ اپنے بڑھاپے اور اپنی توہین پر اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ اس نے زمین پر لیٹے ہی لیٹے کھلے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”تھایا یہ کیسا ظلم ہے؟ تو انسان کو بوڑھا کیوں کر دیتا ہے۔ تیرے پاس انسانوں کے لئے جوانی کا ذخیرہ ہے وہ خالی تو نہیں ہو گیا ہو گا۔ میں تیری رحمت کو بکارتا ہوں۔ اس زلزلے سے تھوڑی سی جوانی مجھے دے دے۔ میں بڑھاپے کی ذلیل موت مرنا نہیں چاہتا۔ بری یہ آرزو پوری کر دے میرے رحمان و رحیم۔ اس کے بعد میں کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانوں گا۔ آہ! ایک جوان بیٹے کا طمانچہ بوڑھے باپ کے گل پر ابھی تک سلگ رہا ہے۔ کہیں میں احساس توہین کی شدت سے مرنہ جاؤں۔“

دو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پارک میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی ان کی سسکیوں کی آوازیں ابھرتی تھیں۔ خاموش آسمان چاند کی آنکھ سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی حالت پر ستاروں کے آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ اس نے ایسی خواہش کی تھی جو ہر انسان کی قدرت کے خلاف تھی صرف ایک خدا ہی تھا جو اپنے قانون کو بدل کر اس کی آرزو پوری کر سکتا تھا مگر اس وقت وہ بھی چپ تھا۔ بوڑھا روتے روتے دیہن مو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہسپتال کے بستر پر تھا۔ اسے اپنا بدن بخار میں پھنکتا ہوا لگتا تھا۔ اس نے نیم دا آنکھوں سے اس ماحول کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ کسی خیراتی ہسپتال میں ہے۔ ایک بوڑھے سے ڈاکٹر نے قریب آ کر اس کا معائنہ کیا۔ اسے ایک انجکشن لگایا۔ ڈاکٹر بولے ”اسے کچھ دوائیں کھلائیں۔ وہ پھر سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو پورا ڈاکٹر گزر چکا تھا۔ اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ بوڑھے ڈاکٹر نے پوچھا۔

”تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”بوڑھوں کا کوئی نام نہیں ہوتا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ زندگی ختم کر مارتی باقی ہے اور ہم لڑھکتے باتے ہیں۔“

بوڑھے ڈاکٹر نے سرو آہ بھر کر کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو، بڑھاپا انسان کو بہت ڈنڈا دیتا ہے۔ کاش کہ انسان کبھی بوڑھا نہ ہوتا۔ ہم نے طبی سائنس میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ بڑھاپے کو دور کرنے کا اب تک کوئی نسخہ تیار نہ کر سکے۔“

مراد علی نے کہا۔ ”یہ ہماری کوتاہی ہے۔ اگر دنیا کے تمام دولت مند بوڑھے ہو کر اور اپنی تمام دولت ایک جگہ جمع کر کے سائنسدانوں کو صرف اسی کام پر بٹھا دیں کہ بڑھاپے کو دور کرنے کی زود اثر دوا ایجاد کریں تو یقیناً کامیابی ہوگی۔ انسان کے ہر مرض علاج دریافت کیا جا رہا ہے۔ بڑھاپا بھی ایک ادنیٰ مرض ہے۔ پھر اس کا علاج کیوں نہیں دریافت ہو سکے گا؟“

”تمہارا خیال درست ہے۔ مگر یہ خیال ابھی صرف ایک خیال ہے۔ دنیا کے بوڑھے اسی انداز میں سوچتے ہیں اور سوچتے سوچتے مر جاتے ہیں۔“

مراد نے سوچا تھا کہ بوڑھا ڈاکٹر اس تدبیر پر مزید کچھ روشنی ڈالنے کا مکرہ بود، سوچ کا مذاق اڑا کر چلا گیا تھا۔

دو دن کے بعد وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر باہر آیا۔ باہر آخر شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بازاروں میں بڑی رونق تھی۔ یہ رونق ان لوگوں کے دم سے تھی، بو دولت مند۔ یا پھر جوان تھے اور جوان حسینوں کو شاپنگ کر رہے تھے۔ اسی بھیڑ میں اس نے گلاب دیکھا۔ وہ ایک نوجوان کے ساتھ کار سے اتر رہی تھی۔ مراد بوڑھے قدموں سے جلدی اس کی طرف بڑھنے لگا۔ گلابو اپنے نئے گاہک کے ساتھ شاپنگ کے ارادے۔ ایک دکان میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ اس نے پیچھے سے آواز دی۔

”گلابو!“

وہ ٹھٹھکی گئی اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بیماری کے بعد ہسپتال سے اٹھ کر آ تھا۔ اس لئے پہلے سے زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ زندگی کے طمانچے اور گھونے کا کر میں گرتا رہا تھا اس لئے کپڑے گرو آلود تھے۔ گلابو نے حیرانی سے پوچھا۔

”تمہارے جیسا ریش اعظم اس حالت میں؟ تعجب ہے۔“

”اب میں ریش اعظم نہیں ہوں۔ میرے بیٹے اور بہو نے محبت کا فریب دیا۔“

بری دولت اور جائیداد چھین لی ہے۔ دنیا والے مجھے بوڑھا اور کمزور سمجھ کر مجھ سے شک لڑتے ہیں اور مجھے ناک آؤٹ کر دیتے ہیں ایسی صورت میں صرف تمہاری جیسی برت ہی مجھے اپنے زانو پر سلا کر میرے دماغ سے بڑھاپے کا دکھ مٹا سکتی ہے۔“
گلابو نے ایک بار پھر اس کے چلیے کو ناگواری سے دیکھ کر پوچھا۔
”کیا تم بالکل ہی کنگال ہو گئے ہو؟“

”ہاں، صبری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔“
”کیا تمہاری تمام دولت تمہارے بیٹے کے ہاتھ آگئی ہے؟“
”ہاں۔ اب میری تجوری کی چابی میرے بیٹے کے پاس ہے۔“
گلابو نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”تو پھر تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اب اپنے بیٹے کو ہیراپتہ بنا دو۔ تمہیں ولالی کا کمیشن مل جائے گا۔“

وہ ”اونہ“ کہتی ہوئی پلٹ کر دکان میں داخل ہو گئی۔ اس بوڑھے پر چند لمحوں تک مددگاری رہا۔ اتنا زبردست طمانچہ بیٹے نے بھی نہیں مارا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار کے سارے کھڑا ہو گیا۔ اتنی زہریلی پچنگ اس نوجوان باکسر نے بھی نہیں کی تھی۔ گلابو کی ”اونہ“ کا مکا اس کے دماغ پر پڑا تھا۔ وہ پاگل پن کی حد تک جھلایا اور وہاں سے بے فکر بھاگنے لگا۔

’جو عورت ہر رات اس سے مفت کے پندرہ سو لیا کرتی تھی‘ وہ اسے ولال باری کہے۔ وہ بھاگتے بھاگتے اپنے سر کے بال نوچتے لگا۔ اس کی سمجھ میں اب یہی آرہا تھا کہ روتے۔ ایسی ذلت کی زندگی سے سوت بہتر ہے۔

وہ جھکی جھکی کمرے کبھی بھاگتا رہا کبھی چلتا رہا۔ ذلت کے شدید احساس سے وہ تھکتا اور اپنا بھول گیا تھا۔ اسے ظلم نہیں تھا کہ وہ شر کی حدود سے باہر جا رہا ہے۔ اسے احساس نہیں تھا کہ بارش شروع ہو گئی ہے اور بادل گرج گرج کر بجلی کی شمعیں جلا کر اسے سیاڑی رات دکھا رہے ہیں۔

”میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں سرنے جا رہا ہوں۔ پہاڑی کی بلندی پر باکر سمندر میں بڑبڑکے لگاؤں گا اور بے حس اور مطلبی دنیا سے بیوشہ کے لئے رشتہ توڑ دوں گا۔ ایسے بدلے پر لعنت ہے جس کے مقابلے میں موت بہتر نظر آتی ہے۔“

وہ پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے رک گیا۔ وہاں کسی بزرگ کا مزار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ

مزار کی طرف بڑھتے ہوئے سوچنے لگا کہ مرنے سے پہلے ایک بار اس بزرگ کے لیے سے بھی اپنی گزری ہوئی جوانی کی بھیک مانگے گا۔ کیا حرج ہے اگر اپنی سبے دنوں دعا بزرگ کے روحانی وسیلے سے آزمایا جائے۔

مزار کے قریب ایک نوئی ہوئی جھونپڑی میں ایک بوڑھی عورت سکڑی مٹی جج تھی۔ اس کے قریب چھت سے پانی دھار کی صورت میں ٹپک رہا تھا اور وہ سردی سے ہر تھر کانپ رہی تھی۔ بوڑھے مراد نے اسے دیکھ کر سوچا، اگر دعا قبول نہ ہوئی تو مجھے خبر پو کرنی ہی ہوگی۔ میرے لئے یہ کوٹ بے کار ہو جائے گا۔ لہذا یہ بڑھیا کے کام آئے تو ہر ہے۔

اس نے اپنا لانگ کوٹ اتار کر بڑھیا کے اوپر ڈال دیا۔ وہ تھر تھراتی ہوئی آواز میں اسے دعائیں دینے لگی۔

”خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم نے سردی سے مجھے بچایا ہے۔ خدا تمہیں ہر آند سے بچائے اور تمہارے دل کی مراد پوری کرے۔“

وہ دعائیں سنتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی ہاتھ اٹھا کر گز گڑانے لگا۔

”اے بزرگ! میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں لیکن آپ ضرور کرامات والا بزرگ رہے ہوں گے۔ شاید اسی لئے لوگوں نے آپ کو اتنی بلندی پر دفن کیا ہے۔ ہمارا کی اس بلندی سے آسمان بہت قریب ہے۔ آپ اگر میرے لئے دعا کریں تو وہ دعا آسمان تک پہنچ جائے گی۔“

اے بابا کرامات والے! آپ نے بھی اس دنیا میں بڑھاپا گزارا ہوگا۔ آپ بیک ہوں گے کہ بڑھاپا دنیا کا سب سے اذیت ناک اور ذلیل ترین مرض ہے۔ تو حضور علیا میرے لئے دعا فرمائیں کہ مجھے اس مرض سے نجات ملے۔ بڑھاپے سے نجات حاصل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو خدا مجھے موت دے دے یا پھر میری جوانی مجھے دے۔“

دعائے گنگے کے دوران بجلی زور سے گز گڑائی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی دوسری آ سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

”موت کی دعا پوری نہیں ہوگی کیونکہ موت کا ایک دن معین ہے اور تمہارا ابھی پورے نہیں ہوئے۔“

بوڑھے مراد نے حیرانی سے مزار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ آواز اسی مزار سے ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
 ”اے بیکرامات والے! اگر مجھے موت نہیں آسکتی تو مجھ پر جوانی ہی آجائے۔“
 پھر وہی آواز مزار سے ابھرنے لگی۔ ”کوئی ایسی آرزو نہ کرو جو قانونِ قدرت کے

مرد نے کہا۔ ”خدا کی مرضی ہو تو کوئی آرزو قانونِ قدرت کے خلاف نہ ہوگی۔
 کریم چاہے تو دریا التابہہ سکتا ہے اور میں بھی پلٹ کر بڑھاپے سے جوانی کی طرف

”بوڑھے! ابھی تو نے ایک نیکی کی ہے ایک غریب بڑھیا کو سروی سے محفوظ رکھنے
 کے اپنے بدن کا کپڑا اتار کر دے دیا ہے تیری یہ نیکی ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم
 کام آئیں۔ اس نیکی کے عوض کبھی نہ پورنی ہونے والی آرزو بھی پوری ہو سکتی ہے
 ہم تجھے سمجھاؤ ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا پریشانیوں کا گھر ہے جو ان ہو کر بھی تو
 پریشان رہے گا۔ جوانی تجھے سکون نہیں پہنچائے گی۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے جوانی میں اتنا زور ہوتا ہے کہ مصائب سے لڑتے وقت
 ٹال نہیں ہوتی بلکہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ میں اپنی آرزو سے باز نہیں آؤں گا۔ میں
 زبر کر لیا ہے کہ جو ان بن کر زندگی گزاروں گا۔ اپنے دشمنوں سے انتقام لوں گا اور
 ان جوانی میں جو حسرتیں باقی رہ گئی تھیں انہیں پورا کروں گا۔ خدا کے لئے میری یہ
 قربانی کلمات کے ذریعے پوری کر دیجئے۔“

”ہوں۔ ہم سمجھ گئے۔ تو اپنی ضد سے باز نہیں آئے گا اور ہم تجھے تیری نیکی کا صلہ
 پہنچا دیں۔ یہ لے تیری خواہش پوری ہو جائے گی۔“

”اے پیچھے سے ایک ہاتھ آگے بڑھ کر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس اجنبی ہاتھ کی
 ہلکی ہلکی ہلکی ہلکی پر سرخ رنگ کی ایک گولی تھی۔ گولی اتنی بڑی تھی کہ اسے گولہ کہنا
 بہتر ہو کہ وہی آواز سنائی دی۔“

”اے اسے نگل جا“ تیرا بھلا ہو گا۔“

”اگلے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ ایک سفید پوش بزرگ ایک ہاتھ میں تیشہ، دوسری
 ہاتھ میں گولی کے کھڑے تھے۔ اس کا صاف ستھرا عمامہ اور سفید لمبی داڑھی۔ ساتی ہوئے

جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔ انہوں نے تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے کہا۔

”ہم بھی بوڑھے ہیں لیکن ہم نے جوانی کی یہ گولی کبھی نہیں کھائی۔ کیونکہ ہم
کی رہنمائی پر راضی ہیں۔ اس نے ہمیں بوڑھا کر دیا ہم اس کی مرضی کے خلاف نہیں
بننا چاہتے۔ تو جوان بن کر دیکھ لے تجھے دلی سکون حاصل نہیں ہو گا۔“

بوڑھا سردار ان کی باتیں ایک کان سے سن رہا تھا، دوسرے کان سے نکال رہا تھا۔
اس کی لپٹائی ہوئی نظریں سرخ گولی پر جبی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس گولی پر
لیا تو بزرگ نے کہا۔

”اس گولی کو نگھنے کے بعد تو سردار جوان رہے گا۔ قدرتی طور سے نہ کبھی بوڑھا
اور نہ ہی طبعی موت مرے گا۔ تیری عمر ایک کتے کی عمر کی طرح لمبی ہوگی۔ کتے
کسی کتے کو طبعی موت مرتے نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ یا تو کسی شکاری کی گولی یا ٹیل پر
بٹتے ہیں یا بھلی کے تاروں سے الجھ کر مرتے ہیں یا پھر آندھی طوفان کی زد میں آکر
ہو جاتے ہیں۔ تو بھی ان کی طرح قدرتی موت نہیں مرے گا بلکہ کسی حادثے کا شکار
کسی کی سازش کا شکار ہو کر پھر بوڑھا ہو جائے گا۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا ”کیا میں پھر بوڑھا ہو جاؤں گا۔“
”ہاں اگر کوئی تجھے خنجر یا کسی آتشیں اسلحہ سے ہلاک کرنا چاہے تو تو مرے
بجائے پھر بوڑھا ہو جائے گا۔ تیری تقدیر میں بھی یہی لکھا ہے کہ تجھے جوانی میں
بڑھاپے میں موت آئے گی۔ دوبارہ بوڑھا ہونے کے بعد تو پھر اپنی طبعی عمر گزار
بڑھاپے کی ذلتیں برداشت کرے گا۔ پھر ایک دن اپنے مقررہ وقت پر مر جائے گا۔“
”نہیں، اب میں اس بڑھاپے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جوانی حاصل کرنے
میں بڑھاپے کا پسند نہیں کروں گا۔ میں کسی کو اپنا دشمن نہیں بناؤں گا۔ نہ کوئی
ہو گا اور نہ ہی کوئی خنجر سے کسی آتشیں اسلحہ سے یا کسی بھی دنیاوی ہتھیار سے
سکے گا۔ اس طرح کبھی مجھ پر بڑھاپا نہیں آئے گا۔ موت کا مجھے غم نہیں ہے وہ
کہ بڑھاپا نہیں آئے گا تو موت کیسے آئے گی؟“

”تو جوان موت سے ڈرتے ہیں۔ تو جوان ہو کر موت کے بجائے بڑھاپے
رہے گا۔ یہ درست ہے کہ بڑھاپے سے بچنے کے لئے تجھے سب کو دوست بنا
ہو گا۔ اس دنیا میں تیرا ایک بھی دشمن نہ ہو لیکن کیا پتہ کہ تجھے کیسے حالات پیش

بوجھت دوست بھی بڑے خلوص سے نادانستگی میں دشمنی کر جاتے ہیں۔ جاتیرا خدا

کہہ کر وہ بزرگ اپنے حجرے کی طرف چلے گئے۔ بوڑھا مراد تیار ہو گیا۔ مزار پر پانی لائیں کی زور دشمنی میں اس نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا، وہاں سرخ گولی رکھی ہوئی اسی وقت بجلی کڑک دار آواز سے چمکی۔ اس کی لمبائی روشنی میں اس نے گولی منہ لائی اور اسے نگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ گولی تھی یا گولہ؟ حلق میں جا کر پھنس سانس کی آمد و رفت کا راستہ رک گیا۔ وہ بوکھلا کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اسے حلق سے نکلنے والے پانی کی ضرورت تھی۔ اس نے مزار کی چھت سے گرنے والے پانی کو چلو لے کر پیا لیکن پانی حلق تک پہنچ کر باہر آ گیا۔ کیونکہ جوانی کے گولے نے پانی نگھنے کا روک رکھا تھا۔

ایسی حالت میں موت سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ جب پانی بھی نہ پی سکے اور سانس بڑے سکے تو زندگی سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ جہاں وہ گرا ہوا اسے دور تک ڈھلان تھی۔ اندھیرے میں اس کی پستی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ اس کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بعد اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا۔

جہاں کے کسی ہموار چٹانی میدان میں اس کا لڑھکتا ہوا جسم ٹھم گیا۔ موسلا دھار آواز بکھری تھی۔ وہ ایک لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ لڑھکنے کے دوران جھٹکے لگنے کے باعث وہ جوانی کا گولہ حلق سے نیچے اتر گیا تھا۔ اب آہستہ آہستہ سانس آرہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف موسلا دھار آواز سنائی دیتی تھی۔ اس نے چٹ لپٹے لپٹے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے باوجود آسمان مٹا مٹا سا نظر آرہا تھا۔ دو سیاہ بادل مخالف سمتوں سے آکر ٹکڑا تے تھے۔ تو ایک قیامت کا شور بلند ہوا۔ ایک بجلی کان چھاڑ دینے والی آواز کے ساتھ بجلی کی لہریں اتر آ رہی تھیں۔ مگر نہیں یہ محض اس کا وہم تھا کہ بجلی اس پر ٹوٹ رہی تھی۔ اس سے ذرا دور ایک چٹان بجلی کی زد میں آ کر ٹکڑے ہو گئی تھی لیکن اس کی حرارت بوڑھے مراد کے جسم میں سما گئی تھی۔

بجلی کرکڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے بدن میں بجلی

بھرنی ہے اور وہ سیدھا کھڑا ہوا ہے۔ اب اس کی کمر جھکی ہوئی نہیں ہے۔ بدن کے لئے ٹوٹ رہا ہے۔ اس نے انگڑائی لی تو دل مچلنے لگا کہ دنیا کی ہر چیز پر بجلی کی طرح پڑے۔ کہتے ہیں نوجوانوں کے بدن میں بجلی بھری ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اوجھڑا لہراتے اور مچلتے رہتے ہیں۔ بجلی تو مراد کے جسم میں اتر گئی تھی۔ وہ بے اعتبار راہ اوہرا اچھلنے لگا۔

اچھلنے کے دوران پتہ چلا کہ اس کا وزن کئی گنا بڑھ گیا ہے کیونکہ اس کے زور وحمک سے چٹان لرزتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ کاش کہ وہاں روشنی ہوتی تو وہ اپنے کو دیکھ سکتا کہ اس کے وجود کے اندر اور باہر کیا انقلاب آگیا ہے۔

وہ تیزی سے ایک طرف بڑھنے لگا۔ اب اسے روشنی کی تلاش تھی۔ وہ اپنے کو دیکھنا چاہتا تھا اس خیال سے وہ دوڑنے لگا دوڑتے ہوئے اسے حیرانی ہوئی کہ اسے سانس نہیں پھول رہی ہے اور جھٹکن کا دور دور تک نام نہیں ہے۔ اس کے اندر بھری ہوئی تھی وہ ایک انسانی رفتار سے زیادہ، ایک ہارس پاور کی رفتار سے بڑھ کر جاری تھی۔

مزار سے شہر تک ایک گھوڑے کی رفتار سے پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ جب وہ منٹ میں شہر پہنچا تو گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا، لیکن اس کے ہانپے میں بڑھ جھٹکن نہیں تھی بلکہ سینے میں جوان سانسوں کی دھمک ہو رہی تھی۔ اس نے آگے ہوئے دیکھا، تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سڑکیں اور گلیاں ویران تھیں۔ رقم ٹم تھا۔ وہ اسٹریٹ لیمپ کے نیچے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔

پہلے اس کے دونوں ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی تھیں، مگر اب ان ہاتھ گوشت بھرا ہوا تھا اور رگیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ جلد کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا اس کی اجلی سرخی بالکل رنگت سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کے بدن میں جوانی کا گرمی رہا ہے۔ اس نے خوشی سے جھوم کر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھیں، ہانگ کا پھر جوش جوانی میں ایک زور دار بڑھک لگا کر بجلی کے کھمبے کو ایک گھونٹہ رات کے سنائے میں ”ٹھن“ کی آواز ابھری اور بجلی کا کھمبا ایک طرف سے چمک اٹھا۔ اس نے حیرانی سے اپنے کمرے کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کو ہلکی سی تکلیف تھی اور وہ لوہے کی تقریباً سولہ گینچ کی موٹی چاور کا کھمبا چمک گیا تھا۔ اس نے

طرف دیکھ کر سرت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہلا۔
 ”باغداد! میں نے اپنی پچھلی جوانی مانگی تھی مگر واقعی تو چھپر پھاڑ کر رہا ہے۔ تو نے مجھے ہر کوئس کی جوانی دے دی۔ میں تیری اس مہربانی کو کبھی نہیں بھولوں گا۔“
 خدا کا شکر ادا کرنے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔ کمر سیدھی ہو جانے کے باعث اب وہ راجہ فٹ کا قد آور بھوت نظر آ رہا تھا۔ بھوت اس لئے کہ مرے پاؤں تک کیچڑ سے انورہ ہو رہا تھا۔ پہاڑی سے لڑھکنے کے دوران کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس حالت میں اسے گھر نہیں جانا چاہئے۔ بیٹا اور بسویوں بھی اسے پاگل ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس حالت میں وہ سچ پانچ پاگل نظر آئے گا۔ وہ اچھے طیلے میں بیٹے کے پاس پہنچ کر اچھی طرح اس کی مرمت کرنا چاہتا تھا۔

یہ سوچ کر وہ ایک ایسی دکان کے سامنے رک گیا جہاں ضرورت کا سارا سامان ذرا ہٹ ہوتا تھا۔ دکان کے دروازے پر آہنی شتر کی دیوار تھی اور تین مضبوط بڑے بڑے آلے بڑے نوئے تھے۔ اس نے ایک تالے کو پکڑ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ پھر اسے ٹھکی میں بھیج کر ایک زور کا جھٹکا دیا۔ چشم زون میں ایک کھٹکے کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔

اس نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس نے دوسرے تالے کو بھی ہلکے سے کھول لیا۔ اسی دقت سیٹی کی آواز سنائی دی۔ گلی کے ایک موٹر پر ٹائٹ اکیڈر اچانک ہی سامنے آ گیا۔

”غیرار!“ اس نے لٹکار کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

مراد نے تالے کو ایک طرف پھینک کر جواب دیا۔

”میں ایک ضرورت سند ہوں اور اپنی ضرورت کے لئے اس دکان کے تالے کو توڑ رہا ہوں۔“

”چور..... بد معاش!“ چوکیدار نے لاشی کا ایک بھرپور وار کیا۔ مراد نے لاشی کو لٹا ہوا سے روک کر اپنی طرف کھینچا۔ لاشی کے ساتھ چوکیدار بھی کھنچا چلا آیا۔ اس نے سمجھ کر ایک ہلکا سا گھونسہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ سوچنے سمجھنے کے باوجود وہ اپنی جگہ کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ وہ ہلکا سا گھونسہ بھی زبردست ثابت ہوا چوکیدار نے ٹکڑے بغیری وردازے کے قریب گر پڑا۔ اس نے جلدی سے تیسرے تالے کو ایک

جھٹکا دے کر الگ کیا۔ شر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ چوکیدار کو گھسیٹ کر اندر لایا۔ پھر اندر سے شر کو گرا دیا۔ چوکیدار کا بے حس جسم فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی کمرے ایک ٹارچ لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ٹارچ لے کر اسے ردشمن کیا اور وہاں اپنی ضرورت کی چیزیں تلاش کر لے لگا۔

اس بڑی سی دکان کے کئی حصے تھے۔ کوئی حصہ ریڈی میڈ ملبوسات کے لئے مخصوص تھا کوئی ڈرائی فوڈ اور میک اپ کے سامان کے لئے وقف تھا۔ دکان کے ایک دور افتاد گوشے میں ایک دفتر نما کمرہ تھا۔ مراد نے پہلے اس کمرے کے ہاتھ روم میں اچھی طرح غسل کیا۔ اس مقصد کے لئے دکان سے صابن کی ٹکیہ اور تولیہ لے کر استعمال کیا۔ اس نے دکان کے اس حصے میں بلب ردشمن کر لیا تھا کیونکہ وہاں سے ردشمنی سڑک تک نہیں جاسکتی تھی۔ اس ردشمنی میں اس نے قد آدم آئینے کے سلسلے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ پہلے خود کو پہچان نہ سکا۔ آئینے میں وہ اس قدر خوبصورت جوان نظر آ رہا تھا کہ آنکھوں سے کچھ کر بھی اپنی نوجوانی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک باڈی بلڈر کی طرح اپنے جسم کو ہر زاویے سے توڑ سوڑ کر دیکھا۔ دو بلاشبہ ہر کوئیس کی کاربن کاپی نظر آ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اپنی اس جوانی کی حفاظت کا ہمیشہ خیال رکھے گا۔ حفاظت کے خیال سے یاد آیا کہ اسے کسی کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہئے۔ مگر دو جوان ہوتے ہی دشمنی سول لے رہا تھا۔ اس نے چوکیدار کو ایک گھونسلے میں ٹھنڈا کر دیا تھا۔ دکان کے مالے توڑ کر مالک دکان اور قانون کو اپنا دشمن بنا رہا تھا۔ اس طرح تو دو ایک دو دن سے زیادہ جانا نہیں رہ سکتا تھا۔ کسی دشمن نے اگر اسے ہلاک کر دیا یا عدالت سے سزائے موت مل گئی تو وہ مرنے سے پہلے ہی بوزحا ہو جائے گا۔

اس نے جلدی سے اپنے کان پکڑ لئے اور آئینے کے سامنے آپ کو گواہ بنا کر وعدہ کیا کہ آئندہ غلط مقاصد کے لئے اپنی بے پناہ قوتوں کو استعمال نہیں کرے گا اور اسے فوراً ہی وہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں پھنس جائے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد وہ ایک لباس نکال کر پہننے لگا۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ اگر اس نے اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لیا تو پھر جوانی کی یہ قوتیں کس کام آئیں گی؟ اپنی توہین اور ذلت کا بدلہ لینے کے لئے ہی جوانی کی دسائیں مانگتا رہا تھا۔ اب دشمنوں عبرت آموز سبق دینے بغیر اسے ذہنی سکون نصیب نہیں ہو گا۔ قوتوں کا استعمال۔

جوانی محض ایک کھوکھلی سی نمائش بن کر رہ جائے گی۔
وہ ادھر سے ادھر ٹپٹنے لگا اور سوچنے لگا کہ اپنے دل کو کیسے سمجھائے دشمنوں کو کیسے
جانتے کرے؟ دل کسی طرح نہیں مانتا تھا کہ دشمنوں کو معاف کیا جائے۔ بدلہ تو لینا ہی
ہوگا خواہ چھپ کر خواہ بھیس بدل کر۔ بھیس بدلنے کے خیال سے وہ آئینے کے سامنے
نک گیا۔ وہ اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اور وہ میک اپ کا سامان نکال کر اس تدبیر
پہن کرنے لگا۔

ایک گھنٹے بعد وہ دکان سے باہر آیا تو اس کا حلیہ اور اس کی عمر بدل چکی تھی۔ اس
کے سر کے بال پہلے کی طرح سفید تھے مہدن کی اجکی سرفی مائل رنگت ٹیالی ہو گئی تھی اور
اس کی کمر جھک گئی تھی اور وہ سوچتا جا رہا تھا۔

”یہ مرد اپ ٹھیک ہے۔ میں اپنے دشمنوں سے ایک بوڑھے کے روپ میں انتقام لیا
کوں گا۔ پھر میک اپ اتار کر نوجوان کے اصلی روپ میں آجایا کروں گا۔ میرے دشمن
بڑے سرا کو تلاش کرتے رہیں گے۔ کوئی مجھے دیکھ کر یہ یقین نہیں کرے گا کہ بوڑھا
لاہر پولیس کی طرح جوان ہو گیا ہے۔ یہ قدرت کا کرشمہ ہے۔ انسان اسے ناممکن سمجھتے
ہیں اور ناممکن ہی بات کا وہ کبھی یقین نہیں کریں گے۔ مجھے کوئی دوسری ہستی سمجھ کر نظر
لٹاؤ کریں گے۔“

اب چونکہ میری شکل بدل چکی ہے لہذا میرا نام بھی بدل جانا چاہئے۔ ایک نوجوان
کے روپ میں میرا نام کیا ہونا چاہئے میرا نام؟ ہوں اوں اوں ہاں! اب میرا نام یوسف
نکلا ہوگا۔ یوسف اس لئے کہ جوان ہو کر مجھے حسن یوسف ملا ہے اور رازی اس لئے
کہ میرا بوجھلپا اور میری جوانی ایک ایسا راز ہے جس کی تہہ تک کسی انسان کا دماغ نہیں
پہنچ سکتا۔“

وہ سوچتا ہوا اپنی اسی شاندار کوشش کی طرف جا رہا تھا جس پر اب بیٹے اور بہو کا قبضہ

”سری صبح بیٹا اور بہو ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان
سے ستر نیبل پر نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس رکھا ہوا تھا اور وہ چائے کی چسکیاں
چمکے مزید دولت کمانے کے منصوبے بنا رہے تھے اور بریف کیس کے ان نوٹوں کو
کدو دار میں لگانا چاہتے تھے کہ اتنے میں زینے پر قدموں کی دھمک سنائی دی۔ دونوں

نے سراٹھا کر دیکھا تو وہ بوڑھا اپنے بیڈ روم سے نکل کر زینے سے اترتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہونے غصے سے کہا۔

”ارے یہ بوڑھا پھر مصیبت بن کر آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسی گھر کی رات بسر کی ہے اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔“

”ڈیڈی!“ بیٹے نے بھی غصے سے پوچھا۔ ”تم کس طرح گھر میں داخل ہوئے تھے دروازے اور کھڑکیاں تو اندر سے بند تھیں۔“

”بیٹے! یہ میرا گھر ہے۔ اس گھر کے در و دیوار مجھے پہچانتے ہیں لہذا میرے خود بخود کھل جانے ہیں۔“

ہونے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”یہ گھر تمہارا نہیں ہمارا ہے۔ نکل جاؤ۔“

وہ دھکا دینے کے لئے پیچھے آگئی۔ بیٹا آگے آکر کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگی بار بار تھا۔ ہو پیچھے سے دھکا دیتی تھی اور بیٹا آگے سے مارتا تھا لیکن اس بار ہونے پوری قوت سے دھکا دیا تو وہ اپنی جگہ بوڑھے برگد کی طرح مضبوطی سے ہمارہا۔ بیٹے نے آگے مارا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر کھلا۔

”میں ایک شرط پر اس گھر سے جاؤں گا۔ تم اپنے باکس رپ کو صرف ایک گھر مارنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ اگر تم نے ایک پوائنٹ بتایا تو میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے بیٹے کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ بیٹے نے باپ کی جھکی ہوئی کردیکھی۔ کی ضعیفی کو نگاہوں میں تولا۔ پھر اس پر تیز توڑ گھونے مارنے لگا۔ تقریباً تیس سیکنڈ تک مسلسل حملے کرتا رہا۔ مگر ایک پوائنٹ بھی حاصل نہ کر سکا۔ پھر زور ادیر کے لئے رکنا اپنے لگا۔

”برخوردار! بوڑھے باپ کے سامنے جوان ہو کر ہانپ رہے ہو چلو پوائنٹ بتاؤ۔ اس نے بیٹے کے مر پر ایک ہلکی سی چپت ماری۔ اس کی کھوپڑی جھنجھٹا کر رہا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ماپنے لگے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ دوڑتی ہوئی اپنے خاندان کے پاس پہنچی اور اس کے سر کو سلاتی ہوئی بولی۔

”خبیث بوڑھے! کیا تو میرے سناگ کا دشمن ہے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”دشمنی کی ابتدا تم دونوں نے کی تھی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بوڑھا باپ جوان بیٹے کا طمانچہ برداشت کر لیتا ہے لیکن جوان بیٹا بوڑھے باپ کی ایک ہلکی سی چپت کھا کر گر جاتا ہے۔ یہ آج کل کے نو جوان ہیں..... افسوس۔“

چٹا کراہتے ہوئے اٹھنے لگا۔ باپ نے کہا۔ ”تم ایک بھی پوائنٹ حاصل نہیں کر سکتے۔ پرہی میں اس گھر سے چلا جاؤں گا مگر خالی ہاتھ نہیں، یہ بریف کیس لے کر.....“

بریف کیس کی بات آنے ہی بیٹے نے جلدی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مراد نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی۔ اس نے بیٹے کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کو بریف کیس کے نیچے دبا دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگا۔

”بیٹا! اگر تم اپنی انگلیاں بریف کیس کے نیچے سے نکال لو تو اس کی ساری رقم نمارا در نہ میری.....“

اس نے دو مرے ہاتھ سے زور لگا کر اپنی انگلیوں کو آزاد کرانا چاہا جبکہ مراد نے بریف کیس پر صرف ایک انگوٹھے کا دباؤ ڈال رکھا تھا۔ ہولے حیرانی سے سوچا۔ ”نہیں۔“

اس بوڑھے کے انگوٹھے میں اتنی قوت نہیں ہو سکتی کہ اس کا جوان صحت مند خاوند بریف کیس کو اس جگہ سے ہٹا نہ سکے۔“

وہ آگے بڑھ کر سر کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہٹانے لگی۔ مگر وہ ٹوٹا ہوا بریف کیس میں جیسے پیوست ہو گیا تھا۔ اپنی جگہ سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کے نیچے بیٹے کی انگلیاں پس جا رہی تھیں اس نے پھر تکلیف کی شدت سے چیخنے ہوئے کہا۔

”اوہ ڈیڈی! اندا کے لئے چھوڑ دو۔ باپ آخر باپ ہوتا ہے۔ میں نے جوانی کے نشے زخم پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔“

مراد بریف کیس اٹھا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹے کی انگلیاں ایسے نظر آ رہی تھیں جیسے جھوڑے سے کچل دی گئی ہوں۔ وہ تکلیف سے کراہتا رہا اور روتا رہا۔ سو بڑبڑاتی رہی اور اس کی مرہم پٹی کٹتی رہی۔ پھر وہ بریف کیس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”لاؤ۔ یہ بریف کیس مجھے دو۔“

”ہو! اگر تم نے اس بریف کیس کو ہاتھ بھی لگایا تو میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا۔“

ال کبخت کا حشر دیکھ لو، پھر مطالبہ کرو۔“

وہ سہم کر اپنے خاندان کے پاس چلی گئی۔ پھر اس نے ڈرتے ہوئے دھمکی دی۔ اس بریف کیس میں پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔ اگر تم نے واپس نہ کیا تو میں ابھی تھلے میں فون کروں گی۔“

بیٹے نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”دیگم! تم خاموش رہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ میں نے تمہاری باتوں میں آکر ڈیڈی کے ساتھ جت زیادتی کی تھی۔ جب تک باپ اپنے بچے کے کان پکڑ کر اسے سزا نہیں دیتا اس وقت تک بچے کو عقل نہیں آتی۔ اب مجھے عقل آگئی ہے۔ ڈیڈی! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ یہ ساری دولت اور جائیداد آپ کی ہے۔ آپ واپس نہ لیں۔“

مراد نے کلمہ ”شباباش بیٹے! تم نے سعادت مندی کا اظہار کر کے دل خوش کر دیا ہے۔ میں تمہیں صرف یہ بہت سکھانے آیا تھا کہ بوڑھے والدین کو چھٹے پرانے کپڑے سمجھ کر باہر نہ پھینکو۔ ان کا برہنہ دولت اور جائیداد کا نہیں، صرف تمہاری محبت اور توجہ کا محتاج رہتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں تمہارا محتاج نہیں ہوں اور نہ ہی یہاں رہنے کے لئے آیا ہوں۔“

بیٹا ضد کرنے لگا کہ باپ کو اب اسی گھر میں رہنا چاہئے۔ بسو نے بھی رسمی طور پر معافی مانگ کر اسے ساتھ رہنے کے لئے کہا لیکن اس نے جواب دیا۔

”میں یہاں کسی سورت سے رہنا نہیں چاہتا۔ بیٹے! میں تم سے صرف ایک کام لے چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے ڈیڈی! میں ایک نہیں آپ کے ایک ہزار کام کرنے کو تیار ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”میری جوانی کے زمانے میں رستم نامی ایک مشہور باکسر تھا۔ وہ مرگا ہے۔ اب اس کا ایک بیٹا ہیوی ویٹ باکسر ہے۔ تم کسی باکسنگ کلب کے ذریعے اسے چٹکا کر دو کہ مراد علی ریٹائرڈ باکسر اس سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ جیت جائے گا تو میری طرف سے اسے ایک لاکھ روپے انعام میں دیئے جائیں گے۔ اگر وہ ہار جائے گا تو اس کا طرف سے شرط لگانے والوں کی رقم مجھے ملے گی۔“

”ڈیڈی! اس لوجوان باکسر کی طرف سے کتنے ہی لوگ یہ سوچ کر بڑی بڑی ریلیں لگائیں گے کہ آپ اس کے مقابلے میں بوڑھے ہیں اور کمزور ہیں۔ پہلے ہی روڈ ٹشیا شکست کھا جائیں گے۔“

”ہاں۔ انہیں یہی سوچنے دو۔ ان کی لنگائی ہوئی تمام رقیں ہماری جیب میں آئیں گی۔ ان کے اطمینان کے لئے اگر تمہیں ایک لاکھ ے بھی زیادہ رقم بڑھانی پڑے تو تم بلا جمل رقم بڑھا دینا۔ تمہارا بوڑھا باپ اس رقم کو ڈبے نہیں دے گا۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ شکست کھائیں گے۔ کیا ابھی میں نے آپ کی قوت کا اندازہ نہیں کیا ہے؟“

مراد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مقابلہ ہونے تک مجھے دس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ یہ دس ہزار بھی تمہیں واپس مل جائیں گے۔“

بیٹے نے بریف کیس سے مطلوبہ رقم نکال کر دی۔ اس نے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ جب بھی ضرورت ہوئی تم سے فون پر رابطہ قائم کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ کمر جھکائے آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔ باہر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اس باڑی کی طرف جانے لگا جہاں اسے از سر نو جوانی نصیب ہوئی تھی۔ جب ٹیکسی اس دکان سے گزرنے لگی جس کے تالے اس نے توڑے تھے تو ڈرائیور نے اسے بتایا کہ پچھلی رات ایک چور اس دکان میں داخل ہوا تھا اور اس نے ایک چوکیدار کو ہلاک کر دیا ہے۔

یہ سن کر مراد کی آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا نظر آنے لگا۔ خیریت ہوئی کہ پچھلی رات چوکیدار کے سوا کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا ورنہ اب تک جیل میں ہوتا۔ وہ اپنے آپ پر جھنجھلائے لگا کہ اس نے چوکیدار کو گھونٹہ کیوں مارا تھا۔ حالانکہ وہ نہایت ہی ہلکا سا گھونٹہ تھا لیکن خود اسے اپنی بے پناہ قوت کا اندازہ نہیں تھا۔

جوانی کی گونی دینے والے بزرگ نے کہا تھا کہ بڑھاپے سے بچنا چاہیے ہو تو کسی کو اپنا دشمن نہ بناؤ اور اس نے چوکیدار کو ہلاک کر کے قانون کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ اپنے گھر جا کر بیٹھے اور ہسو کو بھی پریشان کیا تھا اور وہاں بھی ایک انگوٹھے سے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا تھا۔ کہاں تو بات بن گئی کہ بیٹے کو عقل آگئی اور وہ باپ کا فراموشی بن گیا اگر وہ دونوں اسی قانون کے دروازے پر دستک دیتا چاہے اور وہ انہیں روتے سے مننے بیٹے یا ہسو میں سے کسی کو ہلاک کر دیتا تو پھر وہی پھانسی کا پھندا اس کا مقدر بن جاتا۔ وہ پھانسی کے پھندے سے لٹک کر مرتا نہیں۔ جب ابے پھندے سے اتارا جاتا تو زندہ ہی رہتا۔ مگر اس

کی جوانی بڑھاپے میں بدل چکی ہوتی۔ اور وہ موت سے نہیں بڑھاپے سے ڈرتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ آئندہ کبھی اپنی طاقت کا مظاہر نہیں کرے گا اور کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ حتیٰ کہ اب رستم کے بیٹے سے بھی ہانگ کا مقابلہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ مقابلے میں اس نوجوان باکسر کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ اور اس کے ساتھی سب ہی دشمن بن جائیں گے لہذا فی الحال اس دشمن سے انتقام لینے کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے یہ سوچ کر اس نے ایک ٹیلیفون بوتھ کے سامنے ٹیکسی روکائی۔ پھر وہاں سے فون پر بیٹے سے کہہ دیا کہ ابھی وہ کسی ہانگ کلب سے رابطہ قائم نہ کرے۔ اس نے کچھ عرصے کے لئے مقابلے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔

وہ دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ کر پہاڑی کی طرف روانہ ہوا تو اس وقت وہ مطمئن تھا کہ اب کسی سے لڑنے جھگڑنے کی نوبت نہیں آئے گی لیکن تقدیر کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ پہاڑی کے دامن میں پہنچتے ہی رستم کے بیٹے سے سامنا ہو گیا وہ اپنی کار سے اتر کر مزار کی طرف پہاڑی کی بلندی پر جانا چاہتا تھا۔ مراو کر ٹیکسی سے اترے دیکھ کر وہ رک گیا۔ جب ٹیکسی واپس چلی گئی تو نوجوان باکسر نے مراو سے کہا۔

”گلیڈ ڈی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف جاتا ہے مگر تم جنگل کی طرف آئے ہو۔ یہ اچھا ہوا۔ میں یہاں تمہاری لاش گرا دوں گا تو قانون میرا ہاتھ پکڑنے نہیں آئے گا۔“
مراو نے جھکی ہوئی کمر کر دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ ”میں تم سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم بھی اس مزار پر دعا مانگنے آؤ گے۔“

نوجوان نے فتنہ لگا کر کہا۔ ”اوپر جو قبر بنی ہوئی ہے۔ دوسرے باپ کی ہے۔ یہاں سے گزرنے والے اسے کسی بزرگ کا مزار سمجھ کر دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ میرے والد نے اپنی زندگی میں پہاڑی کا وہ حصہ خرید لیا تھا اور وہاں ایک عالیشان کڑھی بنانا چاہتے تھے۔ مگر ان کی یہ آرزو پوری ہونے سے پہلے ہی تم نے انہیں شکست دی۔ یہ ان کے غرور کی شکست تھی۔ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے۔ ان کی لاش کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے وہ باتوں کا عہد کیا تھا کہ اپنے والد کی طرح نامور باکسر بنوں گا۔ ہانگ کے ذریعے دولت کما کر اس پہاڑی پر اپنے مرحوم والد کی خواہش کے مطابق ایک عالی شان کڑھی تعمیر کراؤں گا۔ دو مرا عہد یہ تھا کہ تمہیں گھونے مار مار کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔“

میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میری خواہش پوری کرنے کے لئے تم میرے والد کی برکت سے چلے آئے ہو اور آج ہی میں دس ہزار روپے کوٹھی کی بنیاد ڈالنے کے لئے پہلا چٹو چھاپا ہے۔ کوٹھی کی بنیاد میں اب تمہارے لو کے قطرے بھی ٹپکائے بائیں گے۔

مراونے پوچھا۔ ”کیا ہمارے درمیان صلح نہیں ہو سکتی۔ میں لڑائی جھگڑا کرنا اور مزید کسی کو دشمن بنانا نہیں چاہتا۔ تمہارے والد رستم علی باکسر کی یہ خواہش تھی کہ اس پڑاوی ایک کوٹھی تعمیر کی جائے۔ میں ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنی طرف سے اس کی بنیاد ڈالنے کے لئے دس ہزار روپے ابھی دیتا ہوں اور آئندہ بھی مجھ سے جو کچھ ہوگا، تمہاری تعمیر کے لئے کچھ نہ کچھ دیتا رہوں گا۔“

”بڑھے! تو اپنی جان بچانے کے لئے مجھے رشوت دینا چاہتا ہے یہ تو قوف! تیری جیب میں دس ہزار روپے ہیں۔ انہیں تو میں ابھی تجھے ہلاک کر کے حاصل کر لوں گا۔“
یہ کہہ کر اس نے ایک گھونٹہ مارا۔ مراونے بائیں ہاتھ سے اس گھونٹے کو روک کر

”تو اپنی جوانی پر غور نہ کر۔ تیری جیب میں بھی دس ہزار ہیں۔ کیا پتہ کہ وہ دس ہزار مجھے مل جائیں۔“

نوجوان باکسر نے زور وار قہقہہ لگایا۔ پھر اپنی جیب سے دس ہزار کے نوٹ نکال کر انہیں پر ایک پتھر کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔
”یہ دس ہزار..... اگر تو نے ایک پواکٹ بھی بنا لیا تو میں یہ رقم تجھے دے دیتا ہوں۔“

مراونے اپنی جیب سے رقم نکال کر ای پتھر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ پورے دس ہزار نہیں ہیں۔ پندرہ روپے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو وے دیئے تھے۔ میں بھی یہی تمہیں کہ صرف ایک پواکٹ بنالے اور یہ رقم لے جا۔“

”جھک کر پتھر کے نیچے روپے رکھ رہا تھا۔ نوجوان نے آگے بڑھ کر اسے لات لگائی۔ مراونے اس کے پاؤں کے تلوے کو اپنی ہتھیلی پر روک کر اسے پیچھے کی طرف ہٹا دیا۔ نوجوان باکسر فضا میں ایسے بلند ہوا جیسے سکے کی طرح ٹاس کیا گیا ہو۔ پھر وہ زمین پر گر کر کاد کی چھت پر گرا اور وہاں سے پھسلتا ہوا دوہری طرف پتھریلی زمین پر وہ پ

سے آپڑا۔ تھوڑی دیر تک وہ زمین پر پڑا سوچتا ہی رہ گیا کہ وہ کس طرح فضا میں اڑتا ہو گا۔ اتنی دور آپڑا ہے۔ پھر بلی زمین کے باعث جو چوٹیں آئی تھیں وہ بھی حیرانی کی شدت سے یاد نہ رہیں۔ پھر وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کمزور بوڑھے میں اس طرح اچھال پھینکنے کی قوت ہے۔

وہ کار سے گھوم کر اس کے سامنے آیا۔ چند لمحات تک اس بوڑھے کو حیرانی سے دیکھا پھر دل ہی دل میں کہا۔ ”یہ ناممکن ہی بات ہے کہ ایک بوڑھا مجھ جیسے قوی اور جوان کو سیکے کی طرح اچھال دے۔ مجھے ذرا سنبھل کر گھونٹوں سے اس کی مرمت کرنا چاہئے۔“

یہ سوچ کر وہ باقاعدگی سے اس پر گھونے برسائے لگا۔ مراد نے بڑی سہولت سے اس کے حملوں کو روکتے ہوئے نصیحت کی۔ ”برخوردار اتنی فاسٹ بلونگ نہ کرو تم لائٹ پیچنگ سے بھی پوائنٹ حاصل کر سکتے ہو۔“

اس نے جھٹا کر کہا۔ ”بوڑھے خبیث! تو پوائنٹ حاصل کرنے کی بات کرتا ہے، میں تجھے موت کی نیند سلا کر ہی دم لوں گا۔“

”نوجوان! تو اپنی غمد سے باز نہیں آئے گا۔ لے سیرا ایک بیچ سنبھال۔۔۔۔۔“

یہ کہہ کر اس نے بائیں کتے سے بیچ کیا۔ نوجوان نے اسے ایک ہاتھ سے روکنے کی کوشش کی مگر وہ مکا ہاتھ کی ڈھال سے گزرتا ہوا اس کے منہ پر آیا اور اس کا منہ گھوم گیا۔ اس نے دوسرا گھونٹہ رسید کیا۔ اس بار گردن گھوم کر پھر سیدھی ہو گئی۔ مگر سیدھا زمین پر ہمیشہ کے لئے لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ ایسے چمک گیا تھا کہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ مراد نے اس کی جیب ٹٹول کر شناختی کارڈ نکال لیا تاکہ اس کی لاش پہچانی نہ جاسکے۔ پھر اس نے پتھر کے پیچے سے وہ تمام روپے نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لئے۔ اس کے بعد نوجوان باکسر کی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

وہاں سے دس میل دور اس نے سمندر کے ساحل پر کار روکی۔ وہ ساحل ویران تھا۔ دور دور تک ایک بھی متفنس نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کپڑے اتار کر غسل کرنے اور بڑھاپے کا میک اپ اتارنے لگا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا شہر کی طرف جا رہا تھا تو اس کی کمر سیدھی ہو گئی تھی سر کے بال سیاہ ہو گئے تھے اور اب اس نوجوان کا نام یوسف رازی تھا۔

شر کی ایک ویران سڑک پر اس نے کار چھوڑ دی اور پیدل چلنے لگا۔ اس نے سب سے پہلے ایک پراپنی ڈیلر کے ذریعے شر کے ایک خوبصورت علاقے میں ایک خوبصورت مکان کھنی کرائے پر حاصل کی۔ پھر اس کے ایک کمرے میں تنہا بیٹھ کر اس نوجوان باکسری نے پچھتائے لگا۔ ہر انسان غلطی کے بعد ہی پچھتا تا ہے۔ اس نے پھر ایک قتل کر کے پتہ کو اپنا دشمن بنانے کی غلطی کی تھی۔

وہ بہت دیر تک اپنے جرم کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ اس نے اسے نوجوان باکسر سے لڑکے دیکھا ہو گا تب بھی اس کی شناخت نہیں کر سکے گا۔ یہ کہ اس وقت وہ بوڑھا مراد علی تھا..... اب جوان یوسف رازی بن گیا ہے۔"

پھر بھی اس نے سوچا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ایک دن اسے قصائی کی بھری تلے آنا ہی پڑتا ہے۔ لہذا اب اسے بہت زیادہ محتاط رہنا چاہئے۔ یوسف رازی کے روپ میں کسی انسان کے بچے کو بھی اپنا دشمن نہیں بنانا چاہئے۔ سوچنے کو تو وہ بہت بوجھتا ہو کر موچ لیتا تھا لیکن بعد میں یہ بھی سوچنے لگا کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اگر بولے سے کبھی جوانی کے غرور میں کسی ایک سے لڑ بیٹھا تو ایک کے پیچھے ایک سو دشمن بڑا ہو جائیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغرور نہ بنے اور مغرور نہ بننے کے لئے لازمی ہے کہ جس طرح انسان زندہ رہ کر موت کو یاد رکھتا ہے اسی طرح وہ جوان ہو کر بڑھاپے کو یاد رکھے۔ اگر اس کا گزرا ہوا بڑھاپا پیش نظر رہے گا تو اس کی جوانی کبھی لو کر نہیں کھائے گی۔

اس رات وہ خیند آنے تک اسی ایک نکتے پر غور کرتا رہا کہ کسی طرح ہمیشہ بڑھاپے کو یاد رکھ کر خوف کھاتا رہے۔ کبھی ایسی جوانی ملی تھی کہ وہ موت سے نہیں ڈراتی تھی صرف بوڑھا کر دینے کی دھمکی دیتی رہتی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ انسان کھانے کے لئے بھوک کو اور جوانی کی موجودگی میں بڑھاپے کو بھول جاتا ہے۔ لہذا ہر دم بڑھاپے کو اپنے سامنے رکھ کر اسے یاد کرتے رہنا ضروری تھا۔

دوسری صبح جب وہ بہترین سوٹ پہن کر اور رنگین شیشوں کی عینک لگا کر سپر مارکیٹ میں پہنچا تو کتنی ہی لڑکیوں کی نگاہیں بے اختیار اس کی جانب اٹھتی رہیں۔ وہ اتنا خود اور اساتھ تھا کہ اسے ایک بار دیکھنے والے بار بار دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ ایک دکان میں داخل ہوا تو اس کا بیٹا اور سو وہاں شاپنگ میں مصروف تھے۔ سو کی نظر

اس پر پڑی تو اس نے اپنے خاوند کو کہنی سے ٹھوکا مار کر آہستگی سے کہا۔
 ”ذرا اس نوجوان کو دیکھئے۔ اس کی شکل آپ کے ڈیڈی سے کتنی ملتی ہے۔“
 بیٹے نے اسے دیکھا پھر حیرانی سے کہا۔ ”واقعی بالکل ڈیڈی کی جوانی کی تصویر ہے۔“
 دوسرے کاؤنٹر کے پیچھے بہت سی گزیاں اور گڈے نظر آرہے تھے۔ یوسف راہی
 سبز مین سے پوچھ رہا تھا۔

”یہاں صرف جوان گڈے اور گزیاں ہیں۔ کیا کسی بوڑھے آدمی کا پتلا نہیں ہے؟“
 سبز مین نے ایک بوڑھے کا پتلا نکال کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس بوڑھے
 ایک ہاتھ جھکی ہوئی کمر پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے جھکے جھکے سلام کر رہا تھا۔ یوسف راہی
 نے پوچھا۔

”یہ بوڑھا کسے سلام کر رہا ہے؟“

سبز مین نے جواب دیا۔ ”یہ بوڑھا اپنی خاموش اداسی سے کہہ رہا ہے کہ بڑھاپے
 دور سے سات سلام..... اور اس سلام کی قیمت ہے پچیس روپے.....“
 ”مجھے ایسے ہی ایک بوڑھے کی ضرورت تھی جو بڑھاپے کو دور سے سلام کرتا ہو۔
 آپ اسے پیک کر دیں۔“

اس نے جیب سے قیمت نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ بیٹے نے قریب آکر اسے طالب
 کیا۔

”مستر! میرا نام شمشاد علی ہے۔ میں مشہور و معروف باکسر مراد علی کالڑکا ہوں اور
 میری وائف ہیں۔“

اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگوں سے مل کر بری خوشی ہوئی۔ میرا نام
 یوسف راہی ہے۔“

اس کے بیٹے شمشاد علی نے کہا۔ ”مجھے آپ سے مل کر اس لئے خوشی ہو رہی ہے
 کہ آپ میرے والد کے ہم شکل ہیں۔ میرے والد اپنی جوانی میں ہی ہو آپ کی تصویر
 تھے۔“

”اچھا آپ کے والد کہاں ہیں؟ میں ان سے ضرور ملوں گا۔“

”میرے ڈیڈی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے کبھی ان کا جی چاہتا ہے تو وہ آکر ہم سے ملاقات
 کر لیتے ہیں۔ وہ کچھ عجیب قسم کے انسان ہیں۔ نہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور نہ ہی اپنا

بتاتے ہیں۔“
 ”پھر تو واقعی عجیب قسم کے انسان ہیں۔ اگر میں بوڑھا ہوتا تو آپ سے کہتا کہ آپ
 بی بی بیوی کہہ کر ان کی کمی پوری کر لیں۔“
 ان بات پر وہ سب ہنسنے لگے۔ ہونے مراد علی عرف یوسف رازی کو تعریفی نظروں
 سے دیکھتے ہوئے کہلا۔

”خدا نہ کرے کہ آپ بوڑھے ہوں۔ آپ اتنے پنڈ سم ہیں کہ آپ کے بڑھاپے کا
 یہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا آپ ہمارے ہاں آنا پسند کریں گے؟“
 شمشاد علی نے چونک کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ پھر جلدی سے بولا۔ ”بیگم! یہ ہمارے ہاں
 آ سکتے ہیں؟ ہم آج شام کی ٹرین سے احمد آباد جا رہے ہیں۔ ایک ماہ کے بعد واپس
 آئیں گے۔ اس کے بعد ہم انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دیں گے۔“
 پتہ چلتا ہی وہ اپنی جوان بیوی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگا اس نے ہاتھ چھڑاتے
 دیکھے کہلا۔

”ذرا ٹھہر تو جائیے۔ ہمیں ایک دوسرے کا ایڈریس معلوم کرنا چاہئے۔ ورنہ اتنے
 بے خبر میں ہم انہیں کہاں تلاش کریں گے۔ مسٹر یوسف رازی۔ میرا نام شہناز ہے۔
 ”فون نمبر دو پانچ سات صفر سات سات ہے۔“

شمشاد علی اپنی حسین بیوی کو کھینچ کر جانے لگا۔ مراد نے ہنسنے ہوئے کہلا۔
 ”شہناز صاحب! فون نمبر کافی ہے۔ میں آپ سے ضرور ملاقات کروں گا۔“
 شمشاد نے گھور کر مراد علی کو دیکھا لیکن اس کے ڈبل ڈبل اور کسرتی بدن کو دیکھ کر
 اسے الجھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ وہ شہناز کو جبراً وکان سے باہر لاتے ہوئے بولا۔
 ”مجھے تمہاری یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ تمہیں اس سے بے تکلف ہونے کی
 ضرورت تھی؟“

”پہلے بیٹھی ہوئی بولی۔“ میں اپنی ضرورت کو تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ میں
 اس جیسے بے حس اور بے ضرر مرد کے ساتھ کب تک زندگی گزارتی رہوں گی؟“
 شمشاد نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آہستہ بولو! کیا تم مجھے بدنام کرنا
 چاہتی ہو؟ کیا تم بھول گئی کہ تم نے میرے ساتھ عریضہ کیا ہے۔ انرا معاہدے کی
 قسم کی بھی مرد سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھو گی۔ ورنہ میری درست اور جائیداد

آگے بڑھ کر اسے مخاطب کیا۔

”بیٹے! کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“

لڑکی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو چند لمحوں تک بے اختیار اسے دیکھتی رہ گئی۔ اب پہلے بھی ایسا مردانہ حسن اور پُرکشش شخصیت اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس نور آبی اپنی نگاہیں جھکا لیں اور کسی نامعلوم جذبے سے اندر ہی اندر کانپنے لگی۔ وہ سیدھی سادی سی لڑکی تھی اور یہ نہیں سمجھ رہی تھی کہ ایک خوبصورت جوان کو دیکھ کر ادا دل آپ ہی آپ کیوں دھڑکنے لگا ہے۔

”آپ سناوش کیوں ہیں؟ کیا آپ کو ملازمت کی ضرورت نہیں ہے؟“

وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ ”جی..... جی ہاں۔“

”آپ کیا کام کر سکتی ہیں؟“

”میں..... میں ایک غریب لڑکی ہوں۔ غربت کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ پرانا لکھنا نہیں آتا۔ میں کسی کے گھر میں جھاز دے سکتی ہوں، برتن مانجھ سکتی ہوں، کھانا کھا سکتی ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ کل صبح آپ گلبرگ کی کوٹھی نمبر سات بی، میں چلی جائیں، وہاں پر اچھی تنخواہ پر فخری مل جائے گی۔“

”آپ کی بڑی سرمائی ہے۔ میں کل صبح ضرور وہاں جاؤں گی۔“

”ابھی آپ اپنی سیلی سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں آپ دونوں کے پیچھے کھڑا ہوا، بالکل۔ اگر آپ کو کچھ روپے کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لیجئے۔ مجھے آپ کے کام رفتاری ہوگی۔“

”آپ کی اتنی ہی مدد کافی ہے کہ آپ کے ذریعے مجھے ملازمت مل جائے گی۔ میں ہر روز آپ کو روپے پیسے سے مدد کریں اور میری غربت کا مذاق اڑائیں۔“

مرد کو کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ بس آکر رک گئی تھی۔ لڑکی آگے بڑھ گئی۔ جب چلے گی تو اس نے بس کے پائیدان پر کھڑے ہو کر اسے دیکھا۔ مراد سے نگاہیں نہ ہٹیں پھر اس نے پلکیں جھکا لیں۔ وہ ذرا دیر کی بات تھی۔ اس کے بعد بس اسے لے گیا۔

وہ ایک عکسی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ اس نے شہناز کی طرف

سے اپنے خیالات موڑ لئے تھے۔ اب وہ سانولی سلونی دوشیزہ اس کی سوچ پر حاوی ہو رہی تھی۔ جوانی بھی کیا چیز ہوتی ہے آپ ہی آپ حوا کی بیٹیوں پر مائل ہوئی رہتی ہے۔ بڑھاپے میں اس نے صرف دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے جوانی کی تمنا کی تھی۔ جوانی کے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ جوان ہوتے ہی حسینوں کے لئے دل مچلنے لگے۔ گھر کے بیڑے میں آکر پیکٹ کو کھولا اور اس میں سے بوڑھے آدمی کا جسم نکال کر آگے دان میں رکھ دیا۔ اس آتش دان میں آگ نہیں جلائی جاتی تھی۔ وہ محض ڈیکر بین کے طور پر بنایا گیا تھا۔ وہ پتلے کے سامنے فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ بوڑھا جھکی ہوئی کمر ہاتھ رکھے دوسرے ہاتھ سے سلام کر رہا تھا۔ مراد نے ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہوئے پہلے سے کہا۔

”باباجی! بڑھاپے کو سات سلام..... میں روزانہ صبح و شام تمہارے پاس آ کر بیٹھوں گا۔ تمہیں دیکھ کر اپنے اس بڑھاپے کو یاد کروں گا جو سیری کسی غلطی سے مجھ پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ میں تمہیں دیکھتا رہوں گا اور موت سے بھی زیادہ بھیاں بڑھاپے یاد کرتا رہوں گا۔ اس جوانی میں کسی کو اپنا دشمن نہیں بناؤں گا۔ کوئی سیرا دشمن نہیں ہوگا تو پھر کوئی بھی مجھے خنجر سے یا کسی آتشیں اسلحے سے یا زہر دے کر ہلاک نہیں کرے گا اس طرح میں سدا جوان رہوں گا۔ اس لئے اسے بڑھاپے! تجھے سات سلام.....“

وہ دیر تک بوڑھے پتلے کے سامنے بیٹھا بڑھاپے سے ڈرتا رہا اور موجودہ جوانی کو کوئی غلطی نہ کرنے کا عہد کرتا رہا۔ پھر اس کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آگیا۔ ایک کمری پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کیا حسین عورتوں سے دوستی کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہاں، حسین عورتیں بھی خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ وہ اگر کسی حسینہ کو اس کی مرضی کے خلاف حاصل کرنے لگتا ہے تو نقصان پہنچائے گا تب وہ اس کی دشمن بن جائے گا۔ اگر دونوں طرف سے نکاح کے بغیر ہی ”قبول ہے“ کی رضامندی ہوگی تو پھر وحشی کا ہوا ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

سوچتے وقت وہ سانولی سلونی لڑکی نیالوں میں آگئی۔ اس نے اپنی ہی کوٹھی پر اسے دیا تھا۔ ارادہ تھا کہ اسے اپنے گھر کی دیکھ بھال اور کھانے پکانے کے لئے ملازمہ رکھ دے۔ ملازمت کے دوران اگر وہ اس کی طرف مائل ہو گئی تو اچھی بات ہے۔ ورنہ

لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ ان میں جوان اور حسین عورتیں بھی تھیں۔ ان کے چلتے پھرتے اور پچلتے بدن دیکھ کر اس کے اندر پھر انگڑائی ابھرنے لگی۔ جوانی کے نقائص اٹھانے لگے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آنے لگی کہ وقت اور جوانی کے تقاضے پورے کئے بغیر زندگی سکون سے نہیں گزر سکتی لیکن ان کی تکمیل اس طرح ہو کہ اس نئی جوانی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ایسی حسین عورت کا ساتھ ہو کہ وہ واقعی طور پر آئے اور پھر کوئی امر نہ بتائے بغیر اس کی زندگی سے نکل جائے۔ محبت کا لمبا کھیل نہ کھیلے۔ ایسی عورت تو وہ ہوتی ہے جو اپنی قیمت وصول کرتی اور صبح چلی جاتی ہے..... تب اسے گلابو یاد آئی۔ وہ تمام دن سوچتے سمجھتے..... اور بڑھاپے کے اندیشوں میں گزر گیا۔

رات آئی تو گناہ کا بازار سجے لگا۔ گھنگھروں کی جھنکار سے تمام کوٹھوں کے در و دیوار گونجنے لگے۔ تماش بین اپنی اپنی جیب کا وزن دیکھ کر سستی اور مہنگی طوائفوں کے در تک پہنچ رہے تھے۔ وہ بوڑھا اپنی کمر جھکائے اس بازار کی رونق دیکھتا ہوا گلابو کے کونے کی طرف جا رہا تھا۔

اُوہی رات کے بعد جب نوٹ اچھالنے والے تماش بینوں کی جیسیں خالی ہو گئیں تو گلابو نے پاؤں کے گھنگھروں کو ہلویں۔ تماش بین ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ صرف ایک گاہک رہ گیا۔ وہ گلابو کی ماں کے ساتھی ایک ہزار روپیہ پیش کرتے ہوئے اس کی بیٹی کی ایک رات خریدنا چاہتا تھا۔ اسی وقت گلابو کی نظر دروازے پر پڑی۔ وہاں وہ بوڑھا کمر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔ جو صرف اس کے زانو پر سر رکھ کر مونے کی قیمت پندرہ سو روپے دیا کرتا تھا۔ چند روز پہلے گلابو نے اسے بھیک منگوں کی حالت میں دیکھا تھا اور اسے دھکا کر آگے بڑھ گئی تھی لیکن اس وقت وہ بوڑھا نہایت ہی قیمتی موٹ میں نظر آ رہا تھا۔ گلابو کو اس لئے چپ لگ گئی کہ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک بھاری گڈی بھی نظر آ رہی تھی وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”گلابو! اگر تمہاری یادداشت اچھی ہے تو مجھے پہچانو۔ میں تمہارا وہی پرانا عاشق ہوں جس نے تمہاری جوانی کا کبھی کبھی نہیں بگاڑا۔ صرف تمہارے زانو پر سر رکھ کر اپنی جوانی کی یاد تازہ کیا کرتا تھا۔“

گلابو نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک قاتل ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آئیے مراد صاحب! آپ تو ایسے مریاں ہیں کہ میں آپ کو کبھی بھلا نہیں سکتی۔ میں آپ کی کتیر ہوں۔“

آئیے تشریف لائیے۔“

گلابو کی ماں نے کہا۔ ”بیٹی! تم مراو صاحب کو خوش آمدید کہہ رہی ہو۔ میں نے تو جان صاحب سے ہزار روپے لئے ہیں۔“

”آپ خان صاحب کے پیسے واپس کر دیں۔“ گلابو نے جواب دیا۔ ”میں مراو صاحب کی خاطر ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں۔“

وجہ پتلے سے خان صاحب نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”گلابو! تم میری توہین کر رہی ہو۔ اس بوڑھے کے ہاتھوں میں نوٹوں کی بھاری گنڈی دیکھ کر تم میری رقم واپس کر رہی ہو۔ میں اس سے دو گنی رقم تمہیں دوں گا۔“

گلابو نے اشارے سے ماں کو ایک طرف بلایا اور سرگوشی میں کہا۔

”ماں جی! کیا تجھے یاد نہیں رہتا۔ میں بتا چکی ہوں کہ یہ بوڑھا واقعی بوڑھا ہے یہ صرف میرے زانو پر سر رکھ کر موتا ہے اور اس کے بدلے پندرہ سو دیا کرتا ہے۔ اب تم ان سوچو جب بھی یہ آتا ہے میری جوانی خرچ نہیں ہوتی اور مفت میں اتنی بڑی رقم ہاتھ آجاتی ہے۔ ایسا صورت میں کوئی جوان گاہک دو گنی رقم ادا کرے، تب بھی میں اس بوڑھے سے سودا کروں گی۔“

بیٹی کی بات ماں کی سمجھ میں آگئی۔ دو خاں صاحب کے پاس آکر بولی۔ ”معاف کیجئے گا خان صاحب! میری بیٹی مراو صاحب کے پیچھے پاگل ہو رہی ہے۔ میری بات ہی نہیں انی اور میں اس سوے پر زبردستی اسے راضی نہیں کر سکتی۔ میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔“

تھوڑی دیر کی بحث و تکرار کے بعد خاں صاحب کو واپس جانا پڑا۔ اس کے جانے کے بعد گلابو نے مرثئے والے انداز میں مسکراتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اس کی اکڑیاں نہیں فضا میں بلند ہو کر کمان بن گئیں۔ بدن ایسے کھینچ گیا کہ تمام نقیب و فراز گلابو کو پکارنے لگے۔ مراو کے سارے قیاحت انگڑائی نے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ مسکراتی ہوئی خواب گاہ کی طرف ہانے لگی۔ خواب گاہ میں پہنچ کر ختم ہوئے انداز میں بستر پر گرتی ہوئی بولی۔

”ہائے میرا سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ اگر آپ جیسے صرف مرنے والے حاشق ملتے ہیں تو میں یہ گھٹکھڑ باندھ کر ناپنے والا بوندہ کبھی نہ کروں۔“

وہ بستر پر لیٹے ہی لیٹے بدن کو توڑنے موڑنے لگی۔ مراد کی نگاہوں کے سامنے ہر بل کھا رہی تھی۔ شباب کی چڑھتی ہوئی ندی لہر لہا بھر رہی تھی اور لہر لہر ڈب رہی تھی۔ اس نے بوڑھے مراد کو دیکھ کر ہستے اور کھکھلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ کے بڑھاپے پر ترس آتا ہے۔ آپ جب بھی آتے ہیں لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتے ہیں۔ یہ جو میری جوانی ہے اور جوانی کی حرکتیں ہیں، یہ سب ہاتھی کے وانت ہیں۔ آپ کو کھانے کے لئے ہیں، کھانے کے لئے نہیں۔ آج میں منہ تھک گئی ہوں آپ میرے زانو پر سر رکھیں۔ یہاں آکر میرے بازو پر سر رکھ کے براں جائیں میں آپ کو تھک تھک کر سلا دوں گی۔“

وہ جھکی جھکی کمر سے آگے بڑھتا ہوا اس کے پاس آکر اس کے بازو پر سر رکھ کرین گیا۔ تب گلابو کو احساس ہوا کہ بوڑھے میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ پہلے اس کا بوڑھا بدن سرو ہوتا تھا مگر اب اس کے جسم سے ایسی حرارت پھوٹ رہی تھی جو جوان لہو میں دوڑتی ہے اور سروی کی راتوں میں دوسروں کو بھی گرما دیتی ہے۔

چونکہ وہ موسم سرما کی رات تھی لہذا گلابو کو پہلی بار ایک بوڑھے کی قربت ناگوار نہیں گزری۔ اس نے بالکل قریب ہو کر مذاق اڑانے کے انداز میں پوچھا۔

”کیا آج کل آپ معجون وغیرہ کھاتے ہیں یا انگارے چباتے ہیں؟“

مراد نے جواب دیا۔ ”اگر مردہ گوشت کو برابر آگ پر رکھا جائے تو وہ پک جاتا ہے۔ میرا بڑھاپا بھی تمہارے زانو پر سر رکھتے رکھتے پک گیا ہے۔ یہ تمہارا ہی پکا ہوا پھل ہے تم ہی کھاؤ۔“

یہ کہہ کر اس نے پہلی بار اس دیکھتے ہوئے شباب کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ گلابو ایک دم سے بوکھلا گئی۔ لوگ تو زمانہ شناس ہوتے ہیں، وہ مرد شناس تھی لیکن ایسی مردانہ اور مضبوط گرفت میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ بوکھلاہٹ میں سمجھ نہ سکی کہ اس بوڑھے میں کیسا انقلاب آیا ہے اور وہ تھا کہ انقلاب لائے جا رہا تھا۔ ایک زبردست آکر کی طرح لڑنے کا انداز بدل کر ہونٹوں پر ہونٹوں سے پیچنگ کر رہا تھا۔ جذبات کے لطیف کے برسا رہا تھا۔ گلابو بھی آپ ہی آپ غارم میں آگئی۔ وہ بے اختیار مقابلے پر ڈٹ گئی۔ پہلے رازند میں بڑی ثابت قدمی سے جمی رہی۔ دوسرے رازند میں وہ گھبرا کر ہولی۔

”آپ تو صرف زانو پر سر رکھ کر سونے کے لئے آئے ہیں؟“

”وہ زانو پر سر رکھ کر سونے والا بوڑھا اسی دن مر گیا تھا جس دن تم نے اسے دلال لکھا۔ وہ دلال بن کر تمہارے کہنے کے مطابق اپنے بیٹے کو تو نہ لاسکا مگر اس کی جوانی لے آیا ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے اور مجھے اس دلالی کا کمیشن ملنا چاہئے۔“

تیسرا راونڈ ختم ہوتے ہی وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔ مراد نے کہا۔

”چند روز پہلے میں ایک خستہ حال بوڑھا تھا۔ میری جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ میں نے تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر صرف ایک ہار تمہارے زانو پر سر رکھ کر سونے کی چابی تھی۔ کیا میرے ہاتھ جوڑنے سے تمہیں رحم آگیا تھا؟ اگر نہیں تو پھر مجھے کیسے رحم ملتا ہے۔ میں نے پورے پندرہ سو روپے دیئے ہیں کم از کم پندرہ راونڈ تو ہونے چاہئیں۔“

وہ پندرہ کی گنتی سنتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ وہ بڑی بہانے باز تھی۔ بے ہوش ہونے کی بڑی کامیاب ایکنگ کی تھی کیونکہ اسی میں اس کی سلامتی تھی۔ اس انجریہ تھا کہ یہ دنیا کی واحد بانکنگ ہے جس میں مولز لڑتے لڑتے خود ہی ٹاک آؤٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بوڑھے بانکر کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کبھی ٹاک آؤٹ نہیں ہوگا خواہ کتنے ہی راونڈ ہو جائیں لہذا اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر پیچھا چھڑا لیا۔ ذرا سی دیر میں اس کی چیخ سن کر اس کے دلال اور غنڈے خواب گاہ کے دروازے پر آکر دستک دینے لگے۔

مراد چاہتا تو ایک ایک غنڈے کو مار کر وہاں سلا دیتا مگر اس کے ہمارغ میں خطرے کی گنتی بنتے لگی۔ نئے دشمن پیدا ہونے کے آثار نظر آ گئے تھے۔ اسے اپنی جوانی عزیز تھی۔ دھاپے کو دور سے سات سلام کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ لڑائی جھگڑے سے پرہیز کرے۔ اس نے گلابو کو جھنجھوڑ کر کہا۔

”اٹھو، میں جانتا ہوں کہ تم بے ہوش نہیں ہو۔ چلو اب اٹھ جاؤ اپنے غنڈوں کو گھڑی میں خاموشی سے پہلا جاؤں گا اور آئندہ کبھی اوھر کا رخ نہیں کروں گا۔“

گلابو اٹھ گئی۔ اس نے لباس پہن کر دروازہ کھولا اور اپنے غنڈوں کو سمجھا دیا کہ نابوڑھے سے کچھ نہ کہیں۔ اسے چپ چاپ جانے کی اجازت دے دیں۔ بڑی آسانی سے اس کا راستہ صاف ہو گیا۔ وہاں سے سر جھکا کر آتے دقت اسے اپنی توہین کا احساس دے گا کہ ایسی جوانی کا کیا فائدہ؟ ہر کوئیس جیسی قوت رکھنے کے باوجود وہ دو کوڑی کے تھلے سے خوفزدہ ہو کر چلا آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے دل کو سمجھایا کہ مجبوری

ہے بڑی مجبوری ہے، وہ اسی طرح بڑھاپے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہی کیا کم تھا کہ اپنے دشمنوں سے حتیٰ کہ گلابو سے کسی نہ کسی طرح انتقام لے چکا تھا۔ دوسری صبح وہ ایک تک سوتا رہا۔ کال بیل کی مسلسل آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بیڈ روم سے باہر آکر بیرونی دروازے کو کھولا تو سامنے وہ سانولی سلونی سی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ پچھلی رات سے وہ اسے بھول چکا تھا۔ اس نے تو فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس گھر میں کسی کو داخل نہیں ہونے دے گا لیکن اچانک ہی اسے سامنے دیکھ کر اس کی غمت اور مجبوریوں پر آگئیں۔ وہ بڑی امیدیں لے کر اور ایک اچھی تنخواہ ایک بہتر مستقبل کے خواب سنا کر وہاں آئی تھی۔ وہ انکار نہ کر سکا۔ اسے اندر بلا لیا۔

لڑکی نے کوٹھی میں گہری خاموشی دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا آپ یہاں تنہا رہتے ہیں۔“
 ”ہاں۔ تنہا ہی سمجھو۔ میں چاہتا ہوں تم میرے لئے کھانا پکاؤ اور میرے گھر کی دیکو بھال کرو۔ صبح نو دس بجے آیا کرو اور شام کو چلی جایا کرو۔“
 وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”میں یہاں تنہا کیسے کام کر سکتی ہوں۔ یہاں تو آپ کی ٹیل نہیں ہے۔“

”تمہیں میری فیملی کی ضرورت ہے یا ملازمت کی؟“

لڑکی نے بڑی بڑی کٹورہ جیسی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا لیکن اس سے نظریں نہ اٹھاسکی۔ مراد نے اس کی ہچکچاہٹ کو سمجھتے ہوئے کہا۔
 ”دنیا دالوں سے ڈر کر اس ملازمت کو ٹھکراؤ گی تو اس سے بہتر ملازمت اور کیم نہیں ملے گی۔ میں تمہیں کھانے کپڑے کے علاوہ چھ سو روپے ماہوار دیا کروں گا۔“
 لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا اور حیرانی اور بے یقینی سے اس مہربان کامنہ نکتے لگی۔
 تعلیم یافتہ نہیں تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چولے ہانڈی کے کام میں چھ سو روپے ماہوار مل سکتے ہیں۔

مراد اسے بڑی لگن سے دیکھ رہا تھا۔ اس سانولی لڑکی کے چہرے کے نقوش اپنے دلکش تھے اور اس کا سراپا اتنا جاذب نظر تھا کہ اب وہ اسے ہاتھ سے نہیں جالے دیتا جاتا تھا۔ اس کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے اس نے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم اپنی سیمپلی سے قرض لے کر کس طرح زندگی گزار رہی ہو۔ پتہ نہیں تم کس قدر قرض کے بوجھ تلے دبئی ہوئی ہو لہذا بسبب تک وہ قرض نہ اتر جائے۔“

میں تمہیں ایک ہزار روپے ماہوار دیا کروں گا۔“
 لڑکی کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی ایک ہزار روپے
 من کر نہیں دیکھے تھے۔ وہ فوراً ہی اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر بولی۔
 ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ میں دن رات آپ کی خدمت
 کروں گی۔ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“

”کل تمہارے حالات سن کر مجھے تم سے گہری ہمدردی بلکہ گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ تم
 میرا کام کیا کرو، میں تمہارے کام آیا کروں گا۔ اب تم باورچی خانے میں جاؤ۔ پکوان کے
 لئے جنسی چیزوں کی ضرورت ہے، ان کی فہرست تیار کرو اور بازار سے جا کر لے آؤ۔ میں
 اوپری منزل کے اس کمرے سے ابھی آتا ہوں۔ ویسے تمہارا امام کیا ہے؟“
 ”زلیخا۔“ لڑکی نے اپنا نام بتایا۔

مراد نے مسکرا کر کہا۔ ”عجیب اتفاق ہے۔ تمہارا نام زلیخا ہے اور میرا نام یوسف۔ یہ
 ہم مدیوں سے ایک ساتھ سنے جاتے ہیں۔“
 بات ایسی معنی خیز تھی کہ لڑکی کا دل اچانک ہی دھڑکنے لگا۔ نظریں حیا سے جھک
 گئیں۔ پہلے اس نے دوپٹے کو سنبھالا، پھر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی باورچی خانے کی
 طرف چلی گئی۔

مراد زینے طے کرتا ہوا اس کمرے میں آیا جہاں اس بوڑھے کا پتلا رکھا ہوا تھا۔
 دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد وہ پتلے کے سامنے فرش پر پاتھی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر
 ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”باباجی! بڑھاپے کو سات سلام۔ کل میں نے دوبار تمہارے سامنے آکر بڑھاپے کو
 ادا کیا جس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ میں جوانی کے غرور میں مبتلا نہیں ہوا اور نہایت ہی
 ناشدنی سے کام لے کر میں نے گلابو کے غنڈوں سے جھگڑا نہیں کیا۔ اس طرح میں نے
 سٹوٹن نہیں بنائے۔ واقعی یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔ اب میں صبح وشام بلاتلفہ تمہارے
 پاس آکر بیٹھوں گا اور تمہیں دیکھ کر اپنے بڑھاپے کو یاد کرتا رہوں گا۔“

لیکن باباجی! ابھی پھر مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے۔ میری یہ جوانی اتنی نادان ہے کہ
 اب زلیخا کے لئے چل رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ مجھے تمہارے پاس بیٹھے دیکھ کر اور
 نکلا یہ باتیں سن کر میرے متعلق کیا سوچے گی۔ میں اسے اپنا رازدار بنا کر یہ نہیں بتا سکتا

شیطان کا بھی کیا ہو گا۔“

”عجب ہے کہ آپ اپنے والد کو شیطان کہہ رہے ہیں۔“

”شیطان اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ بوڑھا میرا سوتیلا باپ ہے۔ وہ بیمار پڑا ہوا ہے

اور میں تینا دن رات اس کی خدمت کرتا رہتا ہوں۔“

زلیخا نے کہا۔ ”پھر تو آپ قابل تعریف ہیں۔ آج کل سگے بیٹے بھی بوڑھے باپ کی خدمت نہیں کرتے اور آپ تو ایسے بوڑھے کی خدمت کر رہے ہیں جو رشتے میں سوتیلا ہونے کے علاوہ بد مزاج اور بد صورت بھی ہے۔“

”مجبوری ہے۔ میں دسا مانگتا ہوں کہ مر جائے لیکن وہ مرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ بہر حال میں ابھی غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔ پھر ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لئے تمہارے ساتھ بازار جاؤں گا۔ تم اس بوڑھے کے کمرے کی طرف مت جانا۔ وہ دروازہ قفل ہے۔ پھر یہ کہ وہ بوڑھا تمہاری آواز سن کر ناراض ہو رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس گھر میں کوئی آئے مگر تم ہی سوچو مجھے بھی تو آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی لڑکی ہو جو مجھ سے باتیں کرے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلائے اور میرے آرام کا خیال رکھے۔ تم یہ کی پوری کرنے آگئی ہو۔ کیا میں تمہاری توجہ کا مستحق نہیں ہوں؟“

”ہاں۔ میں پوری توجہ سے آپ کے آرام کا خیال رکھوں گی۔ مجھے اس بوڑھے سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ آپ میرے محسن ہیں۔ جو آپ کو پریشان کرے گا میں اسے دشمن سمجھوں گی۔“

مراد نے اسے مسکرا کر کر دیکھ لیا۔ پھر غسل کرنے چلا گیا اور زلیخا صوفے پر بیٹھی اس کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ اتنی ہی دیر میں مراد کے دکھ سکھ کی شریک ہو گئی تھی اور مراد کا خواہش کے مطابق اس کے بوڑھے باپ کی موت کی دعا مانگ رہی تھی۔

پھر اسی طرح مراد سے بھد روی کرنے میں دن گزرنے لگے۔ اس نے کونٹھی کا سارا اہم معاملہ لیا تھا۔ وہ صبح ہی صبح چلی آتی تھی اور تینوں وقت کا کھانا پکاتی تھی۔ مراد اسے اپنے ساتھ بیٹھ کر کھانے پر مجبور کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان بے تکلفی برپا ہوتی آتی تھی۔ وہ زلیخا کو محض دکھانے کے لئے اپنے بوڑھے سوتیلے باپ کے پاس تینوں وقت کھانے کی ٹرے لے جاتا تھا۔ دروازے کو اندر سے بند کرتا تھا۔ پھر بوڑھے پتلے کے

سامنے ٹرے رکھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ واپسی پر زلیخا کو یہ بھی دکھانا لازمی تھا کہ بوڑھے نے کچھ کھا لیا ہے۔ لہذا وہ پتلے کے سامنے بیٹھ کر سوتیلے باپ کے حصے کا کھانا کھاتا تھا اور بڑھاپے کو یاد کرتا تھا چونکہ ہر کوئیس کی جوانی تھی اس لئے ذیل خوراک ہضم کر لیتا تھا۔

اب زلیخا کے بدن پر عمدہ لباس نظر آتے۔ وہ اپنے یوسف کے لئے بنے سنورے لگی تھی۔ مراد نے اسے اتنی رقم دی تھی کہ اس کے تمام قرضے ادا ہو گئے تھے۔ یوسف سے اچھا سا تھی اسے اور کہاں ملے۔ اس لئے اب وہ محض اپنی اور یوسف کی سرسوں کے لئے سوچتی رہتی تھی۔ ایسے وقت اس کا بوڑھا سوتیلادشمن باپ یاد آ جاتا تو اس کا پی پانہ کہ اس بند کمرے میں جلے اور اس بوڑھے کا گلہ ابا ڈالے۔

ایک شام سراولے چار محبت کیا باتیں کرتے کرتے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ زلیخا نے اعتراض نہیں کیا۔ بہت دنوں کے بعد مراد کی مرادیں پوری ہوتی نظر آئیں تو اس نے سانولی سلونی کنواری محبوبہ کے کنوارے لبوں کو چوم کر کہا۔

”آج رات یہاں رہ جاؤ۔ ہم ٹائٹ شو دیکھنے جائیں گے۔“

زلیخا نے کہا۔ ”تم مجھے کتنا چاہتے ہو۔ پھر مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

مراد نے جواب دیا۔ ”میرا وہ بوڑھا باپ..... مجھے اپنی زندگی میں شادی نہیں کرنے دے گا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میری مرحوم ماں کی جائیداد کے تمام کلندار اس کے نام ہیں وہ مرے گا تو تمام جائیداد میری ہو جائے گی۔ اگر میں نے اس کی زندگی میں مخالفت کی اور تم سے شادی کر لی تو وہ کسی دوسرے کو جائیداد کا حقدار بنا دے گا۔ انا لئے ذرا صبر کرو۔ اللہ نے چاہا تو بوڑھا جلد ہی مرے گا۔“

زلیخا نے چڑ کر کہا۔ ”وہ غیث کبھی نہیں مرے گا۔ میرا مشورہ مانو اسے دانا نک بھوکا رکھو۔ وہ بڑی آسانی سے مرجائے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”تم اس بوڑھے کو اچھی طرح نہیں جانتی ہو۔ اگر اسے ایک دن بھی کھانا نہ ملا تو وہ چیخ چیخ کر سارا گھر سریر اٹھالے گا۔ آس پاس کی کونٹیوں والے دان چلنے والے جمع ہو جائیں گے۔ یہ اچھی بات نہیں۔ ذرا صبر سے کام لو۔ یہ بوڑھا جلد مرے گا۔ تم نورانی کھانا تیار کرو۔ ہم کھانا کھاتے ہی تفریح کے لئے باہر جائیں گے۔“

زلیخا باورچی خانے میں آکر کھانا تیار کرنے لگی۔ جب اپنی شادی اور ازدواجی زندگی کی خوشیاں بالکل سامنے ہوں تو عورت سے صبر نہیں ہوتا اور مراد نے اس سے کھانا

تو لیکن آج وہ اپنا آپ اس کے حوالے کرنے والی تھی اور اس سے پہلے اپنی ازدواجی سرنوں کی منات چاہتی تھی۔

”کھانا تیار ہوا تو مراد نے بند کمرے کی طرف کھانے کی ٹرے لے جاتے ہوئے کہا۔
 ”وقت کم ہے۔ ہم پچھراؤس سے واپس آکر کھانا کھائیں گے لیکن اس بوڑھے کو
 کھانا ضروری ہے۔ تم جب تک تیار ہو کر باہر نکلو میں آدھ گھنٹے کے اندر آجاؤں گا۔“
 یہ کہہ کر وہ بند کمرے میں چلا گیا۔ زلیخا پندرہ منٹ کے بعد باہر سڑک پر آکر بسی
 تھی کا انتظار کرنے لگی اور سوچنے لگی۔ ”عامانگنے سے یا کونے سے کوئی نہیں مرے گا۔
 اس بوڑھے کی عرشیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی۔ میں اپنے آپ کو یوسف کے حوالے
 کر کے ایک طویل مدت تک اس بوڑھے کی موت کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ آج وہ
 زہرا کھانا اے بیٹھ کے لئے ملا دے گا۔“

وہ سوچتی رہی اور انتظار کرتی رہی۔ بہت دیر تک نہ تو کوئی خالی ٹیکسی آئی اور نہ ہی
 بن کا یوسف آیا۔ ہاں مگر ذرا دور فٹ پاتھ پر اندھیرے میں ایک بوڑھا کمر جھکائے دوڑ
 کڑی زلیخا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ وہ اس نازک سی لڑکی کا
 گانے نہیں گھونٹ سکتا تھا اور اس کے بازو اتنے مضبوط نہیں تھے کہ وہ جوان محبوبہ کو آغوش
 میں لے سکتا۔ اس لئے وہ حسرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 اور زلیخا انتظار کر رہی تھی۔

☆=====ختم شد=====☆